

WWW.PAKIBOOKS.SITE

ماہنامہ

حنا

اگست 2018



PakiBooks.Site



ھر گھر کیلئے

ماہنامہ

حنا

جلد: 40 شماره: 8

اگست 2018ء

قیمت: 60/- روپے

سر دار محمود

بانی:

سر دار طاہر محمود

مدیر اعلیٰ:

تسنیم طاہر

مدیرہ:

ارم طارق

نائب مدیران:

تحریم محمود

مدیرہ خصوصی: فوزیہ شفیق

سر دار طارق محمود

قانونی مشیر:

(ایڈوکیٹ)

کاشف گوریجہ

آرٹ ایڈیٹر:

خالدہ جیلانی

اشتہارات:

افراز علی نازش

PakiBooks.Site







240	تسليم طاہر	بیاض	237	تحريم محمود	حاصل مطالعہ
252	افراح طارق	حنّا کا دسترخوان	246	صائمہ محمود	میری ڈائری سے
255	فوزیہ شفیق	کس قیامت کے یہ نامے	249	بلیس بھٹی	رنگ حنا
			244	مین مین	حنّا کی محفل

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ



114 بٹری خیال  
142 عسین اختر  
7 شہر دل کے راستے



64 سیما نیت ماسم  
72 سہاس گل  
162 رحمانہ نقیب  
دی بیسٹ مام  
ہتھیلی کا چاند  
محبت مشورہ کب ہے



7 بٹریا ہزار  
7 سہراب جنگ  
8 ادارہ  
حم  
نعت  
پیارے بھائی کی پیاری باتیں



105 وحیدہ بخاری  
15 حق ہمارا آزادی  
سارے فرائض شہریوں کے ابن انشاء



181 شہانہ شہت  
201 نادر طارق  
217 نادیہ جہانگیر  
227 قربان مین رائے  
شونہ صبا  
کچھلنا چاند  
اب کے جو نکلا چاند  
عشق داٹو نہ



18 اہم سریم  
دل گندیہ

مردار طاہر محمود نے نواز پر تنگ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ حنا 205 سرکروڈ لاہور سے شائع کیا۔  
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ: ماہنامہ حنا، پبلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرکروڈ  
اردو بازار لاہور فون: 042-37310797, 042-37321690 ای میل ایڈریس،  
monthlyhina@hotmail.com, monthlyhina@yahoo.com

انتباہ: ماہنامہ حنا کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کاپی،  
ناول یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، اور نہ کسی نی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل  
اور سے واقعہ کے طور پر کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے، خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی کی جاسکتی ہے۔





قارئین کرام! اگست 2018ء کا شمارہ پیش ہے۔

آج یہ طور لکھی جا رہی ہیں یوم انتخاب چند دنوں کی دوری پر ہے۔ چند دن کی بات ہے پھر وہی قوم ہوگی اور وہی حکومت۔ ہم ہر الیکشن پر نئی امیدوں کو اپنے دل و دماغ سے وابستہ کر لیتے ہیں۔ ہر بار یہی ہوتا ہے کہ کچھ ارمان ہوتے ہیں اور کچھ امیدیں نئے پاکستان کے بارے میں اپنے اور اپنے بچوں کے بارے میں۔ دل کو اُمید ہوتی ہے کہ شاید اب معاملات درست ہو جائیں گے۔ مسائل حل ہونے لگیں گے۔ اسکا بات کے دوران کئے گئے وعدے وفا ہوں گے۔ ووٹر کو عزت دی جائے گی، مگر یہ اُمیدیں کچھ دیر کے لئے ہی ہوتی ہیں بعد میں وہی ہوتا ہے جو پہلے سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ جمہوریت کے دامن سے کیا وابستہ ہونا چاہیے کیا نہیں اس سے قطع نظر ہم ضرورت اور گنجائش سے زیادہ توقعات وابستہ کر لیتے ہیں اور بعد میں ان توقعات کے پورا نہ ہونے پر دل برداشتہ ہوتے ہیں بنیادی طور پر ہم حقیقت کے دامن سے لپٹ کر زندگی بسر کرنے والی قوم نہیں ہیں، بلکہ ڈھائے گئے خوابوں پر ایمان لانے والی قوم ہیں۔ غیر حقیقی انداز سے سوچنے کا جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہی ہر انتخاب کے بعد برا اکثر برا ہوتا ہے۔ خدا کرے 25 جولائی کو ہونے والے انتخابات کے بعد جو بھی حکومت برسر اقتدار آئے وہ اپنے کئے ہوئے وعدوں کا پاس رکھتے ہوئے کم از کم تمام پاکستان بنیادی سہولتیں مہیا کرنے کے لئے کچھ تو کرے اور عالمی اور علاقائی حالات میں پاکستان کو جو خطرات لاحق ہیں ان کے سد باب کے لئے کوئی ٹھوس قدم اٹھائے۔ اس شمارے میں۔

ریحانہ آفتاب اور سہاس گل کے مکمل ناول، بشری سیال اور تحسین اختر کے ناول، وجیہہ بخاری، شبانہ شوکت، نائلہ طارق، نادیہ جہانگیر اور قرۃ العین رائے کے افسانے، ام مریم کے سلسلے وار ناول کے علاوہ حنا کے سبھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی آراء کا منتظر

سردار طاہر محمود

مہک پھولوں کی ، بلبل کی نوا تو  
سحر کا نور تو ، جان صبا تو  
درون داغ دل مانند شبنم  
نور یاس میں آہ رسا تو  
کبھی ساحل تو حرف تنہا  
کبھی گرداب میں حرف دعا تو  
میں تو س قزح میں رنگ تیرا  
کہیں کالی گھاؤں میں ملا تو  
تو ہی سب بے سہاروں کا سہارا  
نہیں جس کا کوئی اس کا ہوا تو  
کلی میں ، عکس شبنم میں ، ہوا میں  
ہوا محسوس مجھ کو بارہا تو  
میں اک قطرہ ، تو بے پایاں سمندر  
میں مشت خاک اور ارض و سما تو  
عقیدت کے سبھی پھول پر نور ہو گئے  
اشعار میری نعت کے منظور ہو گئے  
نعت جیب جب بھی کہی میں نے جھوم کے  
آزار میری جاں کے سب دور ہو گئے  
عشق رسولؐ میں گرے آنسو و نور میں  
آنکھوں کے جو دریچے تھے پر نور ہو گئے  
جو پڑھ سکے نہ آج تلک کلمہ طیب  
رحمت سے اپنے رب کی بہت دور ہو گئے  
یہ آپؐ کا کرم ہے ہے کہ الفاظ نعت کے  
مدینے کے طول و عرض میں مشہور ہو گئے  
جب سے حریم پاک سے وابستگی ہوئی  
غم ہائے روز و شب میرے کافور ہو گئے  
سہراب مت ڈرو ، سنو یہ غیب کی صدا  
اشک وفا سبھی تیرے پر نور ہو گئے

سہراب جنگ لدھیانوی

بشیر اعجاز



اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

### قربانی

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو چترے اور سیٹگوں والے مینڈھوں کی قربانی دیا کرتے تھے اور (ذبح کرتے وقت) بسم اللہ اور تکبیر پڑھتے تھے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی گردن پر قدم مبارک رکھ کر اپنے ہاتھ سے انہیں ذبح کرتے دیکھا۔

فوائد و مسائل:-  
۱۔ عید الاضحیٰ کے موقع پر صاحب استطاعت کو کم از کم ایک بکری، مینڈھا، گائے یا اونٹ کے ایک حصے کی قربانی کرنا ضروری ہے۔

۲۔ ایک سے زیادہ جانوروں کی قربانی بھی جائز بلکہ افضل ہے۔

۳۔ گھر کے فرد کو اپنے ہاتھ سے قربانی کا جانور ذبح کرنا چاہیے، تاہم کوئی دوسرا شخص بھی ذبح کر سکتا ہے۔

۴۔ قربانی کا جانور عمدہ اور خوبصورت ہونا چاہیے۔

۵۔ ذبح کرتے وقت جانور کے جسم پر پاؤں رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ جانور قابو میں رہے اور بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

### قربانی

حضرت عائشہؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے

روایت ہے۔

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب قربانی کرنا چاہتے تو دو بڑے بڑے، موٹے تازے، سیٹگوں والے چترے اور صحت مند مینڈھے خریدتے، ایک اپنی امت کی طرف سے ذبح فرماتے، یعنی امت سے ہر اس فرد کی طرف سے جو اللہ کی توحید کی گواہی دیتا ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغام پہنچانے (اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گواہی دیتا ہو اور دوسرا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آل کی طرف سے ذبح کرتے۔“

فوائد و مسائل:-

۱۔ قربانی کے جانور عمدہ ہونے چاہئیں۔

۲۔ جانور ظاہری شکل و صورت میں بھی اچھا ہونا چاہیے اور سونا تازہ اور صحت مند بھی۔

۳۔ چترے جانور کی قربانی درست ہے، اسے عیب شمار نہیں کیا جاتا۔

۴۔ گھڑ کے تمام افراد کی طرف سے ایک جانور کی قربانی کافی ہے۔

۵۔ کسی اور کی طرف سے قربانی کرنا درست ہے۔

۶۔ میت کی طرف سے قربانی کرنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمومی فعل سے استدلال اس لئے صحیح نہیں کہ بعض علماء کے نزدیک وہ آپ کا خاصہ ہے جس میں امت کے لئے آپ کی اقتدا جائز نہیں، (دیکھیے، ارواء الغلیل ۳۰/۳۵۴) علاوہ ازیں خیر القرون (صحابہ تابعین کے بہترین ادوار) میں بھی میت کی طرف سے قربانی کرنے کا ثبوت

نہیں ملتا، صرف ایک نقطہ نظر سے اس کا جواز ہو سکتا ہے کہ میت کی طرف سے صدقہ کرنا جائز ہے، یعنی ایساں ثواب کے طور پر اس کا انکار کرنا ممکن نہیں ہے، واللہ اعلم۔

### قربانی واجب ہے یا نہیں؟

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”جس کے پاس (قربانی کرنے کی) قربانی ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو اسے چاہیے کہ ہماری یہ گناہ سے قریب بھی نہ آئے۔“

فوائد و مسائل:-

۱۔ اس حدیث سے بظاہر قربانی کا وجوب ثابت ہوتا ہے لیکن دوسرے دلائل سے اس کا استحباب و استئذان معلوم ہوتا ہے، اس لئے محدثین نے ان سارے دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ قربانی سنت

مؤکدہ ہے، یعنی ایک اہم اور مؤکد حکم ہے، فرض نہیں، تاہم استطاعت کے باوجود اس سنت مؤکدہ سے گریز کسی طرح بھی صحیح نہیں۔

۲۔ قربانی مسلمانوں کی اجتماعیت کا مظہر ہے اور اس سے آپس کے تعلقات بہتر ہوتے ہیں۔

۳۔ قربانی نہ کرنے والا مسلمانوں کی خوشیوں میں شریک ہونے کا حق نہیں رکھتا، تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے نماز عید پڑھنے کی ضرورت نہیں بلکہ مقصد اسے تنبیہ کرنا ہے تاکہ وہ قربانی ترک نہ کرے۔

۴۔ قربانی کا ثواب

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”قربانی کے دن آدم کا بیٹا کوئی ایسا عمل

نہیں کرتا جو اللہ کو خون بہانے (جانور کی قربانی کرنے) سے زیادہ محبوب ہو، وہ (جانور) قیامت کے دن اپنے سیٹگوں، کھروں اور بالوں سمیت آئے گا (اور سیٹ کے پلڑے میں رکھا جائے گا) قربانی کے جانور کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ کے پاس قبولیت کا مقام حاصل کر لیتا ہے، اس لئے خوش دلی سے قربانی کیا کرو۔“

### ثواب

حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحابؓ نے کہا۔

”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! یہ قربانیاں کیا ہیں؟“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہیں۔“

انہوں نے کہا۔

”اس میں ہمارے لئے کیا (ثواب) ہے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”ہر بال کے بدلے نیکی ہے۔“

انہوں نے کہا۔

”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اون؟“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”اون کے بھی ہر بال کے بدلے نیکی ہے۔“

### کون سی قربانی مستحب ہے؟

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیٹگوں والے مینڈھے کی قربانی دی، وہ سیاہی



میں کھاتا، سیاہی میں چلتا اور سیاہی میں دیکھتا تھا۔“

فوائد و مسائل:-

۱۔ قربانی کا جانور دیکھنے میں بھی خوبصورت ہونا چاہیے، ”دز“ (چیل) سے مراد یہ ہے کہ وہ جسمی نہ تھا، نہ اور جسمی دونوں قسم کا جانور قربانی میں دینا جائز ہے، سیاہی میں کھانے، چلنے اور دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا منہ بھی سیاہ تھا، اس کے پاؤں بھی کالے تھے اور اس کی آنکھوں کے ارد گرد کی جگہ بھی سیاہ تھی، اس طرح کی آنکھوں کے ارد گرد کی جگہ بھی سیاہ تھی، اس طرح کا مینڈھا خوبصورت سمجھا جاتا ہے، نیز دیکھنے میں بھی خوبصورت اور بھلا لگتا ہے۔

بہترین قربانی

حضرت ابو امامہ بابلیؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”بہترین کفن وہ ہے جو ایک رنگ کی دو چادروں پر مشتمل ہو اور بہترین قربانی سینکڑوں والا مینڈھا ہے۔“

اونٹ اور گائے کی قربانی کتنے افراد کی طرف سے کفایت کر سکتی ہے؟

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:-

”ہم لوگ ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ تھے کہ عید الاضحیٰ آ گئی، چنانچہ ہم نے دس دس آدمیوں کی طرف سے ایک ایک اونٹ اور سات سات آدمیوں کی طرف سے ایک ایک گائے مشترکہ طور پر ذبح کی۔“

حضرت جابرؓ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا، ”ہم نے حدیبیہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ ایک اونٹ سات افراد کی

طرف سے اور ایک گائے سات افراد کی طرف سے ذبح کی۔“

فائدہ:-

پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ میں دس آدمی شریک ہو سکتے ہیں اور دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ میں سات آدمی شریک ہو سکتے ہیں، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابرؓ سے متعدد احادیث روایت کی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج میں بھی اور عمرے میں بھی سات آدمیوں کو ایک اونٹ میں شریک کیا، لیکن ان دونوں احادیث میں باہم کوئی تعارض نہیں کیونکہ اونٹ میں دس آدمیوں کی شرکت کا واقعہ عام قربانی کے موقع کا ہے، جبکہ سات آدمیوں کی شرکت کا حلق حج و عمرہ سے ہے، بنا ازیں حج و عمرہ میں گائے اور اونٹ دونوں میں صرف سات سات افراد ہی شریک ہوں گے، جبکہ عام قربانی میں گائے میں سات اور اونٹ میں دس افراد شریک ہو سکتے ہیں، یہ فرق حدیث سے ثابت ہے۔

کس عمر کی قربانی

حضرت جابرؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”دو دانستے کے سوا کوئی جانور (قربانی میں) ذبح نہ کرو، سوائے اس کے کہ تمہارے لئے (دو دانستہ جانور تلاش کرنا) مشکل ہو جائے تو بھیڑ کا جذعہ ذبح کر دو۔“

فائدہ:-

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت مجاہدؓ کی حدیث میں جذعہ سے مراد بھیڑ کا جذعہ ہے، بکری کا جذعہ نہیں، حضرت ابودردہؓ نے نماز عید سے پہلے قربانی کا جانور ذبح کر لیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:-

”یہ گوشت کی بکری ہے (قربانی کی نہیں) انہوں نے کہا۔“

”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میرے پاس ایک بکری کا جذعہ ہے، (کیا میں اس کی قربانی دے دوں؟)“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”قربان کر دو لیکن تمہارے سوا کسی اور کے لئے درست نہیں۔“

علامہ البانی نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت ابودردہؓ کی اس حدیث کی روشنی میں بکری کا جذعہ ذبح کرنے کی اجازت نہیں، البتہ حضرت مجاہدؓ کی حدیث کی روشنی میں بھیڑ کا جذعہ (ایک سال کا بچہ جس کے دانت نہ ٹوٹے ہوں) جائز ہے، واللہ اعلم، (دیکھیے: حاشیہ ضعیف سنن ابن ماجہ، حدیث زیر مطالعہ نیز حدیث: ۳۱۵۴ کا فائدہ)

جس جانور کی قربانی مکروہ ہے

حضرت علیؓ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس جانور کو ذبح کرنے سے منع فرمایا ہے جس کا کان آگے سے کٹا ہوا ہو یا جس کا کان پیچھے سے کٹا ہوا ہو یا جس کا کان چڑا ہوا ہو یا جس کے کان میں (گول) سوراخ ہو یا اس کا ہونٹ کٹا ہوا ہو۔“

حضرت علیؓ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: ”ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم (قربانی کے جانور کی) آنکھیں اور کان اچھی طرح دیکھ لیا کریں۔“

فوائد و مسائل:-

۱۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانور کے کان سلامت ہونے چاہئیں۔

۲۔ آنکھیں دیکھ لینے کا مقصد یہ ہے کہ جانور کی دونوں آنکھیں سلامت ہوں، جس کو ایک آنکھ سے نظر نہ آتا ہو، اس کی قربانی درست نہیں۔

۳۔ قربانی کا اصل مقصد اللہ کے لئے اچھی چیز قربان کرنا ہے، اس لئے بے عیب جانور ذبح کرنا چاہیے، گوشت کھانا یا غریبوں کو کھلانا ایک اضافی فائدہ ہے، اصل مقصد نہیں، ورنہ آنکھ یا کان کا عیب گوشت کھانے کے مقصد میں رکاوٹ نہیں بنتا۔

جائز نہیں

حضرت عبید بن فیروز رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا، میں نے حضرت براء بن عازبؓ سے کہا:-

”مجھے بتائیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے اس طرح اشارہ کیا اور میرا ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ سے کٹا ہوا ہے (اور فرمایا) قربانی میں چار جانور جائز نہیں، وہ کانا جانور جس کا کانا پن واضح ہو، بیمار جانور جس کی بیماری واضح ہو، لنگڑا جانور جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو اور دبلا جانور جس کی ہڈیوں میں گودا نہ ہو۔“

عبید نے کہا:-

”میں تو پسند نہیں کرتا کہ اس کے کان میں نقص ہو۔“

حضرت براءؓ نے فرمایا:-

”جو چیز تمہیں پسند نہیں، اسے چھوڑ دو لیکن اسے کسی پر حرام نہ کرو۔“

فوائد و مسائل:-

۱۔ معمولی عیب جو گہری نظر سے دیکھے بغیر محسوس نہ ہو، قربانی میں رکاوٹ نہیں، ”الکبیرہ“ کی تشریح محمد بن عبد الباقی نے یوں کی ہے، ”جس کی ٹانگ ٹوٹی ہو اور وہ



جنت سے عاجز ہو۔“ (حاشیہ ابن ماجہ)  
 لیکن یہ صورت لنگڑا ہونے میں شام سے،  
 نواب وحید الزمان خاندن نے اس کا ترجمہ  
 ”دینی“ کیا ہے، وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے،  
 علامہ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ  
 ”الکسیرۃ البینۃ“ کا وہی مطلب بیان  
 کیا ہے جو محمد فواد نے لکھا ہے لیکن اس  
 روایت میں ”الکسیرۃ“ لفظ لاطینی کے الفاظ  
 ہیں، یہاں یہ معنی درست معلوم نہیں ہوتے،  
 ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ”کسر“ کا ایک  
 مطلب یہ بھی بیان کیا ہے، ”وہ بدی جس  
 سے زیادہ گوشت نہ ہو“ اس مناسبت سے  
 ”کسیرۃ“ کا مطلب ”دینی پتی ہرن  
 زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے، حضرت براء بن  
 عازبؓ کی رائے میں کان کٹایا پھٹا ہوتا ایسا  
 عیب نہیں جو قربانی سے مائل ہو۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے۔  
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس  
 جانور کی قربانی دینے سے منع فرمایا جس کا  
 بٹہ نہ ہوا یا کان کٹا ہوا ہو۔

اگر قربانی کا جانور صحیح سلامت خریدنے  
کے بعد اس میں عیب پیدا ہو جائے تو؟

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے،  
 انہوں نے فرمایا۔  
 ”ہم نے قربانی کے لئے ایک مینڈھا  
 خریدا، بھیڑ یا اس کے سریوں (کلوہوں) اور کان  
 سے کچھ حصہ کاٹ لے گیا، ہم نے نبی کریم صلی  
 اللہ علیہ وآلہ وسلم سے (مسئلہ) دریافت کیا تو  
 آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں حکم دیا۔  
 ”اس کی قربانی کر دیں۔“

گھر والوں کی طرف سے ایک بکری کی

## قربانی کرنا

حضرت عطاء بن یسار رحمۃ اللہ علیہ سے  
 روایت ہے، انہوں نے فرمایا، میں نے حضرت  
 ابو ایوب انصاریؓ سے سوال کیا۔  
 ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ  
 مبارک میں تم لوگوں میں قربانیاں کس طرح ہوتی  
 تھیں؟“

انہوں نے فرمایا۔  
 ”نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ  
 مبارک میں آدمی اپنی طرف سے اور اپنے گھر  
 والوں کی طرف سے ایک بکری کی قربانی کر دیا  
 کرتا تھا، (اس میں سے) وہ خود بھی کھاتے اور  
 دوسروں کو بھی کھاتے، بعد میں گوشت (کے طور  
 پر) زیادہ جانور ذبح کرنے لگے تو وہ حال ہو گیا  
 جو آپ (آج کل) دیکھ رہے ہیں۔“

فوائد، مسائل۔  
 ۱۔ من و مومن کا کٹنا چیتا اور خرگوش وغیرہ شکار  
 ہونا وہ ایک قسم کے افواہ ہیں، ان کی طرف  
 سے ایک بکری کی قربانی دینا یا گوشت  
 کا ایک حصہ قربانی دینا کافی ہے۔

۲۔ ایک سے زیادہ قربانیاں کرنا جائز ہیں لیکن  
 تقاضا اور مقابلہ بازی کے انداز سے زیادہ  
 جانور یا قیمتی جانور قربان کرنا قربانی کے  
 اصل مقصد کو ختم کر دیتا ہے، اس صورت میں  
 کوئی ثواب نہیں ہوتا۔

۳۔ کسی بھی نیکی میں نیت کا صحیح ہونا اور دل کا  
 خلوص لازمی شرط ہے۔

## صحیح کام

حضرت ابو سہیل (حذیفہ بن اسید غفاریؓ)  
 سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔  
 ”میرے گھر والوں نے مجھے غلط کام پر  
 مجبور کر دیا جبکہ مجھے سنت طریقہ معلوم ہے، ایک

گھر والے ایک بکری یا دو بکریاں ذبح کیا کرتے  
 تھے، اب تو (اگر ہم ایک بکری کی قربانی دیتے)  
 ہمارے گھر والے ہمیں قتل کرنے لگتے ہیں۔“

جو قربانی کا ارادہ رکھتا ہو، اسے (ذوالحجہ کے  
 پہلے) دس دنوں میں ہال اور تاختن نہیں  
 اتارنے چاہئیں

ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ سے روایت  
 ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔  
 ”جب ذوالحجہ کا (سپاہ) فشرہ شروع ہو  
 جائے اور تم میں سے کوئی قربانی کرنے کا ارادہ  
 رکھتا ہو تو اسے چاہئے کہ اپنے بالوں یا اپنی جلد  
 سے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے۔“

ہاتھ نہ لگانے کا مطلب یہ ہے کہ بال نہ  
 کاٹے اور سبیلہ سے بال صاف نہ کرے، یہ  
 قربانی کے ارادہ کا بیحد شریعتی ہونے سے عید کے  
 دن قربانی کرنے تک ہے۔

ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ سے روایت  
 ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔  
 ”جو شخص ذوالحجہ کا چاند دیکھ لے اور اس کا  
 ارادہ قربانی کرنے کا ہو تو وہ اپنے بالوں اور  
 ناخنوں (کو کاٹنے) کے قریب بھی نہ جائے۔“

نماز عید سے پہلے قربانی کا جانور ذبح  
 کرنے کی ممانعت

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ  
 ایک آدمی نے قربانی کے دن نماز سے پہلے  
 (قربانی کا جانور) ذبح کر دیا، نبی کریم صلی اللہ  
 علیہ وآلہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ وہ دوبارہ  
 (قربانی) کرے۔  
 فوائد و مسائل۔

۱۔ نماز سے پہلے قربانی کرنا صحیح نہیں ہے، حضرت

سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا، عید الاضحی  
 کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باہر  
 (عید گاہ میں) تشریف لے گئے اور دو  
 رکعت نماز عید ادا فرمائی پھر ہماری طرف  
 متوجہ ہو کر فرمایا۔

”اس دن ہماری پہلی عبادت یہ ہے کہ پہلے  
 نماز پڑھیں پھر (عید گاہ سے) واپس جائیں  
 جانور ذبح کریں۔“

۲۔ عید کی نماز سے پہلے کی گئی قربانی کی حیثیت  
 عام گوشت کی ہے، ایسے شخص کو قربانی کا  
 ثواب نہیں ملے گا۔

۳۔ ثواب کا دار و مدار عمل کے سنت کے مطابق  
 ہونے پر ہے۔

۴۔ کوئی شخص غلطی سے نماز سے پہلے قربانی کر  
 لے تو دوسرا جانور میسر ہونے کی صورت میں  
 اسے نماز عید کے بعد دوسرا جانور قربان کرنا  
 چاہیے۔

## نماز سے پہلے قربانی

حضرت ابو زید (عمر بن الخطابؓ) انصاریؓ  
 سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انصار کے  
 ایک گھر کے پاس سے گزرے تو آپ صلی اللہ  
 علیہ وآلہ وسلم کو گوشت پکنے (یا بھننے) کی خوشبو  
 محسوس ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے  
 فرمایا۔

”یہ کون ہے جس نے (پہلے ہی) ذبح کر لیا  
 ہے؟“

ہمارا ایک (انصاری) آدمی آپ صلی اللہ  
 علیہ وآلہ وسلم کی طرف باہر نکلا اور عرض کیا۔  
 ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں  
 ہوں، میں نے نماز (عید) سے پہلے قربانی کا  
 جانور ذبح کر لیا تھا تاکہ اپنے گھر والوں اور  
 ہمسایوں کو کھلاؤں۔“



جائے۔

## قربانیوں کا گوشت رکھ چھوڑنا

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قربانی کا گوشت سنبھال رکھنے سے لوگوں کے فقر و فاقہ کی وجہ سے منع فرمایا تھا پھر اجازت دے دی۔

فوائد و مسائل:-

۱۔ قربانی کا گوشت استعمال کرتے وقت دوسروں کے حالات کا لحاظ رکھا جائے، اگر زیادہ لوگ ضرورت مند ہوں تو ان میں تقسیم کر دیا جائے، اپنے لئے معمولی مقدار میں رکھا جائے، اگر عام لوگ خوش حال ہوں تو حسب خواہش رکھ لیا جائے۔

۲۔ شریعت میں مختلف حالات کے لئے رہنمائی موجود ہے، امام کو چاہیے کہ جیسے حالات ہوں ان کے مطابق شرعی احکام بیان کرے۔

۳۔ عوام میں مشہور ہے کہ قربانی کے گوشت کے تین حصے کرنے چاہئیں، ایک گھر والوں کے لئے، ایک رشتہ داروں کے لئے، ایک غریبوں اور مسکینوں کے لئے، بعض لوگ بالکل برابر تین حصوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ درست نہیں بلکہ گھر میں حسب ضرورت تھوڑا بہت رکھ کر بانی دوسروں میں تقسیم کیا جائے، اس میں غریب رشتہ داروں کو یا اڑوس پڑوس کے غریب لوگوں کو زیادہ اہمیت دی جائے۔

☆☆☆

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے دوبارہ ذبح کرنے کا حکم دیا تو اس نے کہا۔ ”بسم ہے اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، میرے پاس تو صرف بھیڑ کا ایک میہنا ہے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”اسی کو ذبح کر دے، تیرے بعد کسی کی طرف سے جذبہ (قربان کرنا) کافی نہیں ہوگا۔“

## اپنے ہاتھ سے قربانی

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے، آپؐ نے فرمایا۔ ”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ اپنی قربانی اپنے ہاتھ سے ذبح کر رہے تھے اور اپنا قدم مبارک اس کی گردن پر رکھا ہوا تھا۔“

فائدہ:-

قربانی اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا افضل ہے لیکن دوسرا شخص بھی ذبح کر سکتا ہے جیسے جتہ اوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہم کی طرف سے قربانی دی، انہیں تب معلوم ہوا جب گوشت ان کے پاس پہنچا۔ (دیکھیے، حدیث: ۲۹۸۱)

## قربانی کی کھالیں

حضرت علی بن ابی طالبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے (قربانی کے) تمام اونٹوں کا گوشت، ان کی کھالیں اور جھولیں غریبوں میں تقسیم کر دیں۔

فائدہ:-

قربانی کا گوشت کھانا اور کھالیں اپنے استعمال میں لانا اگرچہ جائز ہے تاہم بہتر یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ غریبوں اور مسکینوں کو دیا

# مسند فضیل شہر دہلی

ابن انشاء

روایت ہے کہ ایک فقیر ایک خج داتا کے دروازے پر گیا اور صدا کی کہ۔

”اے حاتم زادے! مارا اپنے باوا کی قبر پر لات اور دے اس غریب مسکین کو روپیہ دھیلا، میلی پانک والوں کے کان بہرے، اللہ تیری آل اولاد میں برکت دے۔“

اس شخص نے جواب دیا۔

”بابا! تو ہٹا کٹا ہے، محنت مزدوری کیا کر، مانگنا کوئی افہمی بات نہیں ہے۔“

ہر چند کہ ہمارا شمار خاندانی فقیروں میں نہیں جن کے چہرے نور اور تندرستی سے لبالب بھرے دیکھ کر بہتوں کا جی چاہتا ہے کہ کنگول لے، ان کے پیچھے پیچھے چل نکلیں۔

اور دنیا اور عاقبت کا توشہ فراہم کریں، نہ ہمیں اہل حسن و ناز کے علاوہ کسی اور کی بارگاہ میں ہاتھ پھیلاتے کسی نے دیکھا ہے، تاہم ہوا ہمارے ساتھ بھی یہی، ہم نے بلدیہ سے اپیل کی تھی کہ ایک راس جمدار ہمارے محلے میں بھی بھجوائے کہ کوڑے کے ذہیر اٹھائے، اٹھا ہم خود بھی سکتے تھے بلکہ ایک روز جھاڑو لے کر نکل بھی تھے لیکن ایک ہمدرد ہمسائے نے روک دیا کہ کمیٹی کے سینئر اسپیکر نے دیکھ لیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے، کہیں بے عزتی نہ کر دے کہ۔

”تو کون ہوتا ہے صفائی کرنے والا، ہمارے تجاویزات ہٹانے والا، تیرا ارادہ اس کوڑے کو بطور کھاد بیچنے کا معلوم ہوتا ہے، یعنی سرکاری مال میں خورد برد کی نیت ہے، چل کان

☆☆☆

پس ہم کالم لکھ لکھ کر دریا میں ڈالتے رہے، اتفاق سے آیا ہے نالوں کا جواب آخر، صفائی میں تو محنت پڑتی تھی، بلدیہ نے کسی پیٹرن سے صیحت اور مشورے کے بورڈ لکھوا کر جا بجا لگوا دیے ہیں، ”اپنے شہر کو صاف ستھرا رکھیے۔“ پہلے یہ مشورہ بدیں الفاظ ہوتا تھا، ”اپنے شہر کو آئینے کی طرح صاف رکھیے۔“ ہماری گلی کی کڑ پر خلیفہ نبی بخش ہیر ڈیرسٹ ہاتھ پر بوریا بچھا کر بیٹھتے ہیں اور آتے جاتے کی حجامت کرتے رہتے ہیں، ان کا آئینہ گردایام سے آلودہ، بزرگوں کو نشانی کچھ ایسا ہے کہ جو کوئی دیکھتا ہے اپنا سامنے لے کر رہ جاتا ہے۔

ہم نے یہی آئینہ ان کو دکھایا تو ہر امان گئے، ان سے مطلب ہے بلدیہ، بہر حال آئینہ خارج ہوا اور صرف یہ رہ گیا کہ ”اپنے شہر کو صاف رکھیے۔“ ہر چند کہ ہم نے صفائی مانگی تھی، مشورہ نہیں مانگا تھا، لیکن خیر بلدیہ نے کچھ دیا تو اور کچھ نہیں تو مشورہ ہی سہی۔

پہلے دن صفائی کا صیحت نامہ یعنی بورڈ ہمیں سبیلہ کا پل اترتے ہی گویہمار کے تاکے پر نظر آیا، اخبار والے تو شرارت سے باز نہیں آتے اس کا فوٹو چھاپ دیا کہ۔

”اے تجاویزات ہٹانے والو، اس کے سرے ایک ایک فٹ سڑک پر نکلے ہوئے ہیں ٹریفک میں رکاوٹ ہوتی ہے۔“



کوئی ان اخبار والوں سے پوچھے کہ تمہارے پاس کون سی کاریں ہیں، اسے پیدل جوتے پہنانے والو، کیوں اندیشہ شہر میں دبے ہوتے ہو، بہر حال ٹریفک پولیس والوں نے اگلے ہی روز اس نین پاٹ کو ہٹوا دیا، ہم بھی ایک طرح سے اپنے شہر کو صاف رکھنے والی اخلاقی ذمہ داری سے آزاد ہو گئے، لیکن اگلے روز یہی بورڈ فٹ ہاتھ کے پتھوں بچ لگا نظر آیا یعنی بلدیہ والوں نے کہا۔

”لو ہم تمہیں دل دیتے ہیں کیا یاد کرو گے۔“

اخبار والوں دیک کر رہ گئے کہ اب کے اعتراض کیا تو کہیں یہ بورڈ ہمارے گھروں کے دروازوں کے آ پار نہ لگا دیے جائیں، باہر نکلنے کا رستہ ہی نہ رہے، آج کل بلدیہ والوں کے بڑے اختیارات ہیں، بلکہ اختیارات ہی اختیارات ہیں، فرائض کچھ نہیں رہے، رہتے کہاں سے وہ تو ہاتھوں ہاتھ شہریوں میں تقسیم ہو گئے۔

☆☆☆

”اپنے شہر کو صاف رکھیے۔“ اس کوزے میں حکمت کے بہت سے دریا بند ہیں اور نکتہ رس طبیعتوں کے لئے عبرت کے بے شمار خزانے، لفظ ”اپنے“ ہی کو لیجئے، گویا یہ شہر ہمارا ہو گیا، بلدیہ کو اس سے کچھ مطلب نہیں رہا۔

”اے شہر یو، لو تمہیں سڑکوں پر جھاڑو دینے کی آزادی مل گئی، کوئی روکے تو ہم سے شکایت کرتا، ہم اپنے کالم میں اس کی خبر لیں گے، ہاں شرط یہ ہے کہ تمہاری جیب میں بلدیہ کا ٹیکس کی ادائیگی کی رسید ہونی چاہیے، جس طرح بس والے صرف اس شخص کو دھکا لگانے کی اجازت دیتے ہیں جس نے ٹکٹ لے رکھا ہو۔

دریں اثناء دیکھو تمہاری پیاری بلدیہ تمہارے

لئے کیا کھکھیڑیں اٹھا رہی ہے، چند دن پہلے تک سارے شہر کا ٹریفک تمہارے باغیچوں کی وجہ سے رکا ہوا تھا اور سارا پانی بھی تمہارے پودوں میں مرتا تھا، اب دیکھو ان کے اجازت کے بعد کیا لہر بہر ہو گئی ہے، سارا شہر پانی پانی ہو گیا نا؟ کوبل مل کر گنگا نہاؤ، اپنے گناہ دھوؤ، ان میں ایک یہ ہے کہ تم نے کراچی بلدیہ کے علاقے میں مکان لیا، ارے اتنا بڑا پاکستان ہے، کہیں اور جا کے نہ رہ سکتے تھے، یہیں رہنا تھا تو ناظم آباد کے علاوہ بھی تو بہت سے علاقے تھے۔“

☆☆☆

”اپنے شہر کو صاف رکھیے۔“ اس میں لفظ شہر پر بھی زور ہے تاکہ کوئی سطحی نظر والا اسے گاؤں نہ سمجھ لے، یہ احتیاط ہمارے نزدیک زائد از ضرورت ہے، غلط فہمی کی کوئی گنجائش تو معلوم نہیں ہوتی، جنگل ہم نے دیکھے ہیں وہاں سبزہ ہوتا ہے اور تجارتات میں شمار نہیں ہوتا، ٹریفک میں حائل نہیں ہوتا یہاں دھول ہوتی ہے جو شہریوں کی آنکھوں میں جھوکی جاتی ہے، گندگی کے ڈھیر ہوتے ہیں، ملاوٹ ہوتی ہے، کھیاں ہوتی ہیں جو ہر چند کہ بلدیہ والے سارا سال دفتروں میں بیٹھے پارتے رہتے ہیں، پھر بھی شہریوں کی جان کو آتی ہیں، دیہات میں بھی گٹر کہاں اچلتے ہیں؟ بلدیہ کہاں ہوتی ہے، پانی کی قلت کہاں ہوتی ہے؟ یہ شہر ہے بھائی مقرر شہر ہے۔

☆☆☆

یہ پانی کا لفظ تو ہمارے قلم سے پونہ ٹیک پڑا، ورنہ ہمیں آج کل پانی کی کچھ تکلیف نہیں، دیے اور بھی کوئی تکلیف نہیں، کوڑے کا ڈھیر بے شک پارک کے کونے پر اب بھی پڑا ہے لیکن اس سے بو آتی بند ہو گئی ہے کیونکہ ہماری قوت شامہ

ترقی کر کے ہمداروں کی سی ہو گئی ہے، آب رسانی کے لئے بھی ہم نے کے ڈی اے وغیرہ سے پانی پت کی لڑائیاں لڑنی چھوڑ دیں، اقبال کے کلام سے متاثر ہو کر ایک قلندر روٹی کپڑے پر ملازم رکھ لیا ہے، اس کی بات سنتے ہیں اور پانی پانی ہو جاتے ہیں۔

کل تو ہم بالکل سی شرابور ہو گئے، ہوا یہ کہ ایک صاحب نے ہم سے کہا کہ۔

”تم اتنے نامی گرامی ادیب ہو بلکہ پانی کے نلکوں اور کوڑے کے موضوع پر تو ایسی گراں قدر تحریریں سارے اردو ادب میں نہ ہوں گی، یقیناً تمہارے کالم پڑھ کر بلدیہ اور کے ڈی اے کے بڑے بڑے افسر سالم تانگے لے کر علاقے کے معائنے کے لئے دوڑے دوڑے آئے ہوں گے۔“

نم پر یہ سن کر کھڑوں پانی پڑ گیا، دوبارہ کپڑے بدلنے پڑے۔

عالم ہمہ افسانہ، مادار دیا بیچ ایک وضع دار بزرگ سے ان کے ایک ملاقاتی نے پوچھا۔

”یہ پیارا بچہ کس کا ہے؟“

وہ بڑے اخلاق سے بولے۔

”آپ ہی کا ہے جی۔“

پاس ہی بچے کی ماں تھی، ملاقاتی نے پر امید نظروں سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

”اور یہ کس کی بیگم ہیں؟“

یہاں ان وضع دار بزرگ کے اخلاق حسنہ کا کوئی ختم ہو گیا۔

ہم نے بھی یہی پوچھا تھا کہ یہ شہر کس کا ہے جو اتنا گندہ رہتا ہے، بلدیہ والوں نے ترنت بورڈ لکھوا کے لگا دیا کہ۔

آپ ہی کا ہے جی۔ ”اپنے شہر کو صاف رکھیے۔“

ہم نے خوش ہو کر کہا۔  
”اچھا تو گویا ہم پانی بھرن سے چھوڑنے یعنی ٹیکس وغیرہ سے بچیں۔“ جواب ملا۔  
”بشت۔“

صاحب دلائل، خدارا منصفی کرو، وہی ذبح بھی کرے ہے، وہی نے ثواب الٹا۔

☆☆☆

## اچھی کتابیں

### پڑھنے کی عادت ڈالیں

#### ابن انشاء

اور دو کی آخری کتاب .....

خوار گندم .....

دنیا گول ہے .....

آوارہ گردی ڈائری .....

ابن بطوطہ کے تعاقب میں .....

پلٹے ہوئے چین کو چلیے .....

گھری گری پراسرار .....

خط انشاء کی .....

اس بستی کے اک کو .....

چاندگر .....

دل وحشی .....

آپ سے کیا پڑا .....

لاہور اکیڈمی

پوسٹ اور دو بازار لاہور

فون: 042-37321690, 3710797



# دلِ گزدرہ

اُم مریم

چونیسویں قسط کا خلاصہ

قدرِ حمدان کو قبول نہیں کر پارہی، وہ اپنے طور پر فیصلہ کرتی ہے حمدان سے علیحدگی کا مگر سلیمان اس پہ ایک بار پھر سختی کرتے ہوئے اسے زبردستی حمدان کے ساتھ بھیجنے کا فیصلہ سناتے ہیں۔ عمر کی شادی کی خبر جناب پہ بجلی بن کر گر گئی ہے، اسے دکھ ہے عمر نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟

قدرِ خود اپنی تجویز کی گئی سزا پہ بضد ہے، کسی کے بھی سمجھانے پہ گاؤں والا گھر چھوڑنے پہ آمادہ نہیں، سلیمان کے لئے اس کا یہ امر پریشان کن ہے، اس کی ضد کے آگے ہارتے وہ آیا ماں کو اس کے پاس بھیجتے ہیں۔

قدرِ آیا ماں کو دیکھ کر بھی خوش نہیں، آیا ماں اس کی بگڑی طبیعت کی وجہ پر پر کینسی جان کر ایک دم سرشار ہو چکی ہیں، جبکہ شانزے کے لئے یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہیں ہوئی۔

پینتیسویں قسط

اب آپ آگے پڑھیے





گاڑی رکی تو قدر ہی سب سے پہلے اتری تھی۔

تمہاری بے کسی پہ بھی لٹا دی زندگی ہم نے

ہمارا حال کیا ہوتا اگر تم مہرباں ہوتے

وہ اس کے ہم قدم تھا، قدر نے طنز یہ نظروں سے اسے دیکھا، مسکرا دی۔

”جان بھی لٹا دو، تو مہربان نہیں ہو سکتی، یاد رکھنا۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ آگے بڑھ گئی، باغ

ثمرات سے لدے تھے، آم، آلو، بخار، وہ خوبانی، وہ بڑے اشتیاق بھرے انداز میں پھلوں سے لدی

شانسیں دیکھ رہی تھی، ایک قطار میں لیموں کے چند پودوں پر مونے مونے لیموں لگے تھے، اس

نے پہلی بار آم درختوں پر لگے دیکھے تھے، یہی گھاس قدموں سے لپٹ لپٹ جاتی، وہ سب پیچھے اور

قد راگے تھی، پھر حمدان تھا، حجاب اور حرم ہی آپس میں باتیں کر رہی تھیں، دور ایک کھیت میں ایک

عورت گھاس کاٹ رہی تھی، درختی روک کر انہیں دیکھنے لگی، نزدیک آنے پہ حمدان کے سلام کرنے

پہ احوال دریافت کرنے لگی۔

”اے نئی دوہٹی اے؟“ سوال حجاب سے ہوا وہ آہستگی سے ہنس دی۔

”جی بالکل، بالکل نئی دوہٹی ہے۔“ اس کے انداز میں فخر تھا، قدر کی نظریں کچے امرودوں پہ

تھیں۔

”بالکل انگریزی لگدی اے۔“ بوڑھی عورت کی نگاہوں میں ستائش تھی۔

”مجھے کیری کھانی ہے۔“ معا وہ ایک دم فرمائش کر گئی، انداز چل اٹھنے والا تھا، حمدان نے

چونک کر اسے دیکھا پھر ذریعہ مسکراتے ہوئے ذرا آگے بڑھا اور درخت پہ لٹکتا کچا آم توڑ کر اس

کی جانب بڑھا دیا۔

”بس ٹیسٹ کر لیں، ورنہ مگلا خراب کر دے گا یہ۔“ وہ نصیحت کر رہا تھا، قدر نے کہاں دھیان

دیا، دوپٹے سے رگڑ کر اسی وقت دانتوں سے کتر کتر کر کھانا شروع کر دیا۔

”مجھے بھی اتار کے دو نا۔“ شانزے بھلا کیوں پیچھے رہتی، جھٹ فرمائش کر ڈالی، حمدان ان سنی

کے آگے بڑھ گیا، حجاب اور حرم کچھ فاصلے پہ بہتے پانی کے نالے میں پیر ڈال کر بیٹھ گئیں۔

قدر کو بھی اشارے سے بلا رہی تھیں، وہ قدرے تذبذب سے ادھر آئی اور جوتا اتار کر پیر اندر

ڈالے، بہت پانی خوشگوار ٹھنڈک لئے تھا، اس کا گریز جاتا رہا، حمدان نے رکھوالی پہ مامور لڑکے کے

پاس آم آرزو اور امرود ٹھوکر کی بھر کے بھجوا دیئے۔

”بابو صاحب کہہ رہے ہیں جتنے مرضی کھائیں۔“

”اُنہیں شکر یہ بول دو۔“

شانزے کھل اٹھی گویا فی الفور ٹوکری اپنے قبضے میں کی اور پھل پہ ہاتھ صاف کرنا شروع کیا،

ساتھ ہی مکینٹی کا مظاہرہ بھی ضروری سمجھا۔

”کیا بات ہے یار سن کی، بیوی کو ایک کچا آم اور میرے لئے ایسی فیاضی۔“ وہ گویا انہیں ہی

غانیہ نے شاکی نگاہ حمدان پہ ڈالی جو گہرا سانس بھرنا دوسری جانب دیکھنے لگا تھا، جہاں کھلی

کھڑکی سے وہ صوفے پہ بیٹھی نظر آتی تھی، اس کی کہنیاں اس کی گود میں دھرے کشن پہ تھیں، اس

کے آرنٹک ہاتھوں کی خوب صورت انگلیاں اس کے ریشمی بکھرے بالوں میں پھنسی تھیں، گلابی موم

سے بنے چہرے پہ براہ راست سورج کی شعاعیں پڑتی تھیں اور گویا اس کی آب تاب سے نگاہیں

خیرہ ہوتی جاتی تھیں، وہ اسے پونہ دیکھے گیا، دل سے ہوک سی اٹھی، کتنی خوبصورت تھی وہ، کہ جیسے

قدرت نے اس کے ایک ایک نقش کو بڑی محبت سے تراشا ہو مگر اس چہرے کے پیچھے کیسا شگرا

دماغ تھا جس نے اس خوبصورتی کو ماند کر ڈالا تھا جیسے شادی کی رات، دلہنا پے کے روپ میں

لرزتی پلکوں کو اٹھاتی گراتی وہ اسے بس کچھ بھلا گئی تھی، یہاں تک کہ اس کی خود سے نفرت بھی،

ورنہ شاید اگر وہ اتنی جلجت کا مظاہرہ نہ کرتا تو وہ بھی اتنی بدگمان نہ ہوتی ہوتی۔

”چلو یار سن، میں تیار بھی ہو گئی، زیادہ دیر تو نہیں لگی؟ یہ لباس ٹھیک ہے؟ میں اچھی تو لگ

رہی ہوں۔“ وہ سوال پہ سوال کر رہی تھی سر پر سوار ہوتی جا رہی تھی، حمدان چونک گیا، ناگواری سے

بھر گیا۔

”صرف تمہیں نہیں جانا، دومنٹ صبر کر لو گی۔“ جھلا کر کہتا وہ وہاں سے چلا گیا، شانزے نہ

شرمندہ ہوئی نہ کھسیانی، البتہ کھلی کھڑکی کی جانب ضرور دیکھا، جہاں اب قدر متوجہ تھی، نگاہ چار

ہونے پہ بغیر کسی تاثر کے دوسری جانب نکلنے لگی، حرم کے پیار بھرے اصرار پہ اس نے بے دلی

سے لباس تبدیل کیا، پنک اور آف وائٹ کنٹراسٹ کا خوب صورت اسٹائلش سوٹ نازک سی چپل

بغیر میک اپ کے بھی وہ سب میں نمایاں ہو کر دکھنے لگی۔

”آج شام کو تو ضرور واپس چلے جانا، ورنہ میں یہ مردوت زیادہ دیر تک نہیں بٹھاؤں گی۔“ وہ

ایسے بولی کہ صرف حمدان سن سکا اور گہرا سانس بھر کے گاڑی اشارت کر دی۔

وہ آنکھوں آنکھوں میں بات کرنا

وہ باتوں باتوں میں رات کرنا

ہنسی چھپانے کو لب کے آگے

حسین کو لب سے ہاتھ رکھنا

کبھی ہنسانا کبھی رلانا

جو یاد آؤں تو لوٹ آتا

اس نے جواب میں کچھ کہے بغیر ٹپ آنا کر دیا، قدر کھڑکی سے باہر دیکھتی گاؤں کے نظاروں

میں مگن تھی نظر اندازی کی حکمت عملی پہ جم گئی، وہ بھی ڈھیٹ بنا، آواز اونچی کر ڈالی۔

ہمیں تمہاری ہی جستجو ہے

تمہاری جاہت کی آرزو ہے

یہ بات تم بھی کبھی تو سمجھو

ہماری چپ میں بھی گفتگو ہے



سنا رہی تھی، جلا رہی تھی، قدر کا ہاتھ اس زاویے پر ساکن ہوا، نگاہ دونوں بہنوں کے فتنے چہرے سے ملی تھی، پہلا موقع تھا کہ اسے توہین بھی محسوس ہوئی اور سبکی بھی، جلن کا احساس بھی اندر جاگا، کچھ کے بغیر اس نے ہاتھ میں موجود ادھ کھائی کیری طیش کے عالم میں نالے میں پھینکی تھی اور جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”اپنے صاحب سے کہو مجھے ابھی اسی وقت گھر چھوڑ کے آئیں۔“ واپس پلٹتے لڑکے کو آواز دے کر کہتی وہ بغیر آگے بڑھ گئی، قدر اور حرم بوکھلاہٹ کا شکار اس کے پیچھے بھاگی آئی تھیں، کچھ دیر بعد حمدان بھی بیچ پلتے ہی الجھا ہوا آیا۔

”خیریت..... کیا ہوا ایک دم؟“ وہ ہکا بکا تھا، حرم نے منہ پر انگلی رکھ کر کچھ بولنے سے روکا، لچکتی مٹکتی شانزے اب گنگنا رہی تھی، حمدان گہرا سانس لے کر رہ گیا، قدر کا لالہ بھسوکا چہرہ ادیکھ کر وہ صورتحال کی تعبیر تا کو پورا نہ کی کسی حد تک تو سمجھ سکتا تھا کہ بگاڑ کہاں سے اٹھا تھا۔

☆☆☆

مجھے تم بھول جاؤ گے مجھے معلوم ہے لیکن پلٹ کر جب بھی آؤ گے محبت منتظر ہوگی بھی بھولے سے ہی مجھ کو اگر تم یاد کر بیٹھو میری تسبیح تلاوت اور عبادت منتظر ہوگی فلک کے پار اترو یا سمندر میں اتر جاؤ کسی کے دشت چاہت کی امانت منتظر ہوگی ہماری آرزو جو ہے تمہاری دسترس میں ہے ملو یا نا ملو تم پھر بھی محبت منتظر ہوگی

بیگ میں ضروری چیزیں رکھتے حمدان نے قسم کرا سے دیکھا اور جیسے خود اس سے مار گیا۔  
”میں صبح جا رہا ہوں۔“ قدر جو بستر پہ بیٹھی تھی، اسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگی گویا کہہ رہی ہو مجھے کیوں بتا رہے ہو۔

”پلیز قدر، ساتھ چلیں میرے، یہاں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔“ وہ کتنا بے بس لگ رہا تھا، قدر کو عجیب سا سکون محسوس ہوا، کوئی تو تھا جو اس کی وجہ سے تکلیف میں تھا، اس کا باپ نہ سہی علی شیر نہ سہی، یہی سہی وہ ان تینوں کو ہی معاف نہیں کرنا چاہتی تھی، یونہی تڑپائے گی اور تڑپائے گی۔  
”تو پھر تم مجھے دیے چھوڑ دو۔“ اس نے کڑوا کیلا پھاڑ کھانے والا جواب دیا مگر ادھورا، کہ حمدان سمجھنے سے قاصر رہا۔

”ویسے کیسے؟“ حمدان حیران ہوا، قدر طنز پر مسکرانے لگی۔

”طلاق دے کر۔“ اس کی نظریں سفاک تھیں، بے دید تھیں، حمدان کا رنگ متغیر ہوتا گیا، وہ اسے سمجھ نہیں آئی، عجیب لڑکی تھی، کبھی بادام کے چٹکے کی طرح سخت اور کبھی آسمان سے برستی شبنم جیسی مہربان، ٹھنڈی اور کبھی ظالم طوفان کی طرح بے رحم سفاک، کچھ دن قبل وہ موم تھی، عروسی روپ میں معصوم حسن ایسے لودے رہا تھا اور اب وہ کسی بے رحم موج کی طرح تھی، سب تباہ کرنے

کے درپے مگر وہ اس کے اندر جذبے جگانے کا عزم باندھے تھا، اسے اپنے رنگ میں رنگ لینا چاہتا تھا۔

”ایسی باتیں نہ کرو قدر، مجھے تکلیف ہوتی ہے، دیکھو میں محبت کرتا ہوں تم سے، تم نے کتنی بے دردی سے اس رات حملہ کیا مجھ پہ اور پھر پلٹ کے مجھے پوچھا بھی نہیں، اگر مجھے کچھ ہو جاتا؟“  
”کیا ہو جاتا؟“

وہ ابھی کچھ اور بھی کہتا مگر طیش میں ابلیتی قدر نے اس کی بات کاٹ کر سوال کیا، مزید پھنکاری۔

”بولو..... کیا ہو جاتا تمہیں..... زیادہ سے زیادہ یہ کہ تم مر جاتے؟ تو کاش میر جاتے منصف حمدان، میری اس بندھن کے عذاب سے جان چھوٹ جاتی، میں تمہیں پسند نہیں کرتی، تم جانتے ہو، میں تمہیں کبھی قبول نہیں کروں گی یہ بات تم نہیں جانتے، تمہاری ایسی کوشش پہ میں ایسا قدم اٹھا چکی ہوں تو یہ بات تمہیں سمجھنی چاہیے، میں علی شیر سے محبت کرتی ہوں، دنیا میں صرف اسی کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں، اگر آج ہم اکٹھے ہیں تو اسے اپنی خوش قسمتی سمجھ کر خوش ہونے کی بجائے تم اسے میری بد بختی کا مجھے لگایا ہوا دھبا بھی سمجھ سکتے ہو، جس سے میں بھی مجبوری میں بھی سمجھوتہ نہیں کروں گی، یہ بات تم جتنی جلدی سمجھ جاؤ تمہارے اپنے حق میں بہتر ہے۔“ مہل مہل کر بولتی وہ اپنا اگلا پچھلا غبار نکال رہی تھی، حمدان تو جیسے پتھر اگیا تھا، سکتے کے عالم میں کھڑا تھا، معا خود کو سنبھالا اور گہرا سانس بھر کے اسے دیکھنے لگا۔

”آپ یہ سمجھ لیں میں سب سمجھ گیا ہوں، اس کے باوجود آپ کو یہاں نہیں چھوڑنا چاہتا، قدر یہاں شانزے کی موجودگی میں آپ کو چھوڑنا.....“

”مجھے ایسی باتوں سے مت ڈراؤ، میں اتنی دیر یہاں سے نہیں جاؤں گی جتنی دیر تک تم میری سزا ختم نہیں کر دیتے۔“ وہ برہم ہو گئی اسے ڈانٹ کر بولی۔

”کون سی سزا؟“ وہ چونک اٹھا، قدر کی نظروں میں طنز اتر آیا۔  
”اس بندھن کی قید کی سزا، آج آزاد کرو، میں آج چلی جاؤں گی۔“ حمدان کو پھر چپ لگ گئی، وہ سر جھکا کر باہر نکلا تو قدموں سے اشملال لپٹا ہوا تھا۔

☆☆☆

دیران بے مزایا بی بی تھا اداس ہے

تیرے بغیر تو میری دنیا اداس ہے

پتھر پر پتھر سے سوزنا ہے

مہتاب رت میں چاند کا چہرہ اداس ہے

بارش بہا کے لے گئی نیکوں کا آشیان

برگد کی بیٹکی شاخ پہ چڑیا اداس ہے

شہزادہ سو گیا ہے کہانی سے بغیر

حمدان کے حلقہ میں.....



سورج لیٹ کے جھیل کی لہروں سے رودیا  
منظر فراق شام کا کتنا اداس ہے  
لو پھر سے آگیا ہے جدائی کا مرحلہ  
آنکھیں ہیں غم میری تیرا لہجہ اداس ہے  
کس کو ہیں راس ہجر کی ٹھنائیاں سحر  
جتنا قریب ہے کوئی اتنا اداس ہے

وہ وہاں سے لوٹا تو بہت مشکل تھا، اسے محبت راس نہیں آئی تھی، اس چھوٹی سی نازک سی لڑکی  
کی اکڑنے ضد نے اسے پاش پاش کر ڈالا تھا، سلیمان جو اس کی واپسی کے ہی خطر تھے، اسے  
بلانے کی بجائے خود چلے آئے، شاید انہیں بیٹی کی ضد کا اندازہ تھا کہ خود نہیں آگے گی مگر یہ تو انہیں  
بھی اندازہ نہ تھا کہ وہ اس کے ساتھ بھی نہیں آئے گی، یہاں آکر معلوم ہوا تو کتنی دیر کچھ بولنے  
کے قابل نہ ہو سکے تھے۔

”آئی ایم سوری سر، مگر میں انہیں قائل نہ کر سکا، نہ واپس ساتھ لانے پہ نہ آپ سے بات  
کرنے میں۔“ وہ کتنا شرمسار تھا، نظریں جھکائے بیٹھا تھا اور نظریں تو سلیمان کی بھی اس کے  
سامنے جھکی تھیں، انہیں یاد آیا، اس نے خود کو سزا دینے کی بات کی تھی، وہ خود کو سزا دے چکی تھی۔  
”اس ادکے، اس معاملے کو میں خود ہینڈل کر لوں گا، آپ پریشان نہ ہوں یک مین۔“ خود کو  
سنہال کر وہ دانستہ مسکرائے تھے اور اگلے دن ہی ان کا فیصلہ حمدان کے سامنے آگیا، جب آیا جی  
ان کے ڈرائیور کے ہمراہ اس کی سرکاری رہائش گاہ پہنچی تھیں۔  
”صاحب بٹیا کا حکم ہے کہ آپ ہمیں بٹیا کے پاس پہنچا دو۔“ اپنے ساز و سامان کے ساتھ وہ  
اسے پریشان کر گئیں، بھلا وہاں کہاں رہیں گی وہ، مگر حکم کی تعمیل کے سوا چارہ کار بھی نہیں تھا، انہیں  
اپنے ڈرائیور کے ساتھ گاؤں روانہ کر کے وہ خود غائب سے فون پہ رابطہ کرنے پہ مجبور انہیں صورت  
حال سے آگاہ کرنے لگا۔

”وہ سب تو ٹھیک ہے بیٹے مگر شانزے اس معاملے کو بہت ہوا دے رہی ہے، خاتون کی آمد  
اسے اور بے پرکی اڑانے کا موقع دے گی، جیسے بھی تھا تمہیں قدر کو سمجھا بھجا کر ساتھ لے جانا  
چاہیے تھا۔“ وہ از حد پریشان تھیں، حمدان کیا جواب دیتا بھلا۔  
”آپ اس معاملے کو سنہال لیتا ماما، میں ویسے ہی بہت پریشان ہوں پلیز۔“ حمدان  
اکتائے لگا تھا، بھلا جو باپ کی نہیں مانتی تھی وہ اسے کیا اہمیت دے سکتی تھی، اب تو کوئی معجزہ ہی  
اُسے راہ راست پہ لا سکتا تھا، ورنہ کوئی امید نہ تھی۔

☆☆☆

خلوت شام ہجر طاری پھر  
بے طبیعت میں بے قراری پھر  
تھم گیا جب غبار سانسوں کا  
دل سے گزری تیری سواری پھر

غم نے مڑگاں پہ ایڑیاں رگڑیں  
اور چٹمہ ہوا ہے جاری پھر  
تیرے نام کی سب تختیاں جلا دیں گے  
سر میں ڈالیں گے خاک ساری پھر  
اڑ گئے آنکھ سے پرندے تو  
میری وحشت نے چیخ ماری پھر  
دل کے کمرے میں گھپ اندھیرا تھا  
یاد روشن ہوئی تمہاری پھر  
ان کا پرسان حال کوئی نہیں  
بن کے آئے ہیں غم بھکاری پھر  
جب بھی ارادہ کریں بھلانے کا  
دل پتے لگتی ہے ضرب کاری پھر

دن ڈوبتا رات گزرتی اور دوبارہ سورج نکل آتا، بس یہی شمار واعداد زندگی کا پتا دیتے تھے، وہ  
کمرے سے نکلتی نہ تھی اور کسی کی جرأت تھی کہ زبردستی کرے، دو ٹائم ہوئے کھانے کی ٹرے بھی بن  
چوئے واپس آئی تھی، ایسے میں آیامان کی آمد غنیمت تھی رسی سلام دعا کے بعد آیامان نے بھی غلت  
میں اسی کے کمرے کا ہی رخ کیا تھا، وہ بستر پہ دراز تھی اور صدیوں کی مر بیضہ لگتی تھی، آیامان کا تو مانو  
کچھ ہی دھک سے رہ گیا اسے ایسے دیکھ کر، کوئی کہہ سکتا تھا چند دن ہوئے ہوں گے شادی کو،  
آنکھوں تلے حلقے، بکھرے بال، شکن آلود لباس، ایک لمحے کو انہیں بھی لگا حمدان نے بیٹی کے ساتھ  
زیادتی کر دی۔

”بٹیا رانی!“ وہ دروازے سے ہی پکاریں، قدر چونک کر ٹھٹھک کر پلٹی اور انہیں غیر متوقع طور  
پر رو بروبا کے غیر یقینی سے ساکن ہو گئی۔

”کیسی ہے چاندنی، میں مرجاؤں، کیا حال کر لیا۔“ وہ خود نزدیک آئی تھیں، بے تابانہ ہانہوں  
میں بھر لیا، ہاتھ چوم، قدر بے اختیار بلک اٹھی، بے ساختہ آنسو بہانے لگی۔

”ابھی مری نہیں ہوں، زندہ ہوں یہ دیکھنے بھیجا آپ کو پانے۔“ اس کا دکھ ختم نہ ہوتا تھا شکوہ  
تمام نہ ہوتا تھا، آیامان ٹوپ گئیں، لرز اٹھیں۔

”ایسی باتیں نہ کرو قدر، ہمیں اور دکھ نہ دو بیٹے۔“ آیامان خود بھی رونے لگیں، قدر اور جذباتی  
ہوئی۔

”ابھی دکھ کہاں دیا، پچھتاہیں گے تو پیا اس وقت جب کچ مار ڈالوں گی خود کو، وہ کیا سمجھتے  
ہیں سزا دینا صرف انہیں آتا ہے۔“ وہ غصے میں کانپنے لگی، آیامان نے گھبرا کر اسے تھما سہارا دیا۔

”آپ مجھے بتائیں، آپ کیوں آئیں یہاں، پیا نے بھیجا ہے تو فی الفور چلی جائیں، مجھے  
ان کا کوئی احسان نہیں چاہیے۔“ غصہ سے بھری وہ انہیں دھکیلنے لگی، آیامان نے متاسفانہ نظروں سے



”نہیں انہوں نے ہمیں نہیں بھیجا، خود آئے ہم۔“

”میں نہیں مانتی، آپ ان کی مرضی کے بغیر کوئی ایسا قدم نہیں اٹا سکتیں۔“ وہ سرپا قہر سے بھرنے لگی۔

”اتنی انتہا پہ مت جاؤ قدر، انتہا کے روئے کبھی سکھ سے ہمکنار نہیں کرتے۔“ انہیں اس کا رویہ برا لگا۔

”آپ مجھے نصیحت نہ کریں تو بہتر ہے۔“ وہ ان پہ بھی چڑھ دوڑی، تب ہی حرم کھانے کی ٹرے لئے آئی تھی۔

”ممانے کھانا بھیجا ہے، کہہ رہی ہیں بھابھی کو ضرور کھلائیے، کل سے کچھ نہیں کھایا۔“ وہ آیا ماں سے ہی مخاطب ہوئی تھی اور پلٹ کر چلی گئی۔

”ہٹائیں اسے ورنہ میں خود اٹھا کر پھینک دوں گی۔“ وہ ناک سکوڑتے ہوئے کہہ رہی تھی، آس پاس نظر دوڑائی اور دوپٹہ اٹھا کر ناک پہ رکھ لیا، سلاطین کی پلیٹ میں خوبصورت شیب میں کٹا کھیر اپنی تازہ مہک کے ساتھ اس کے اعصاب پہ بھاری پڑنے لگا۔

”اللہ کی نعمت کے لئے ایسے الفاظ استعمال کرنا سراسر ناشکری ہے۔“ آیا ماں نے ٹرے قریب کر لی، ارادہ اسے اپنے ہاتھ سے کھلانے کا تھا، وہ تو ابکائیاں لینے لگی۔

”ہٹائیں میں کہہ رہی ہوں، میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔“ وہ بھاگ کر کھڑکی کے پاس گئی اور گہرے گہرے سانس بھرتی سینہ منے لگی، آیا ماں رفقاں و خیراں انھیں، کھانے کی ٹرے غلت میں دروازے کے باہر رکھی اور اسی تیزی سے پلٹ کر واپس اسی تک آئیں اسے دھیان سے سمجھتیں جو اس دوران حال سے بے حال ہو چکی تھی۔

”کب سے ہے ایسی طبیعت خیر سے۔“ ان کے چہرے پہ اب تشویش نہیں اطمینان تھا، قدر کچھ نہیں بولی، کھڑکی کے سارے پٹ کھولتی رہی، گہرے گہرے سانس لیتی رہی۔

”میرے ساتھ چلو، ڈاکٹر کو دکھاتے ہیں۔“ انہیں جو شک گزرا تھا اس کی تصدیق کے بغیر منہ سے لفظ نہیں نکالنا چاہتی تھیں، جہاں دیدہ تھیں بھانپ تو اک نظر میں گئی تھیں، بلکہ اگر جب اسے اک نظر دیکھا تھا شک تو تب ہوا تھا، اب تو جیسے یقین ہمراہ تھا۔

”ڈاکٹر کو وہ دکھائے جسے زندگی کی چاہ ہو۔“ قدر کی طبیعت کچھ سنہلی تھی، جیسی زہرا لگا، آیا ماں کی تیوری ایک دم چڑھی۔

”پر وقت ایسی باتیں ہی کرتی ہو، بدشگونی ہے سراسر۔“ انہوں نے گھر کا، مگر وہ خاطر میں کہاں لائی۔

”تو ہو بدشگونی، یہاں پرواہ کسے، نقصان تو ہو چکا۔“ اس نے برہمی سے جواب دیا، آیا ماں اسے تاسف سے دیکھنے لگیں۔

”بس کر دو یہ بک بک قدر؟ ہوش کے ناخن لو، اب بچی نہیں رہی ہوتم، شادی شدہ ہو کل کو خود ماں ہو گی۔“ انہوں نے ڈانٹا تو قدر کا منہ بن گیا۔

”میں نہیں مانتی ایسی شادی کو اور اللہ نہ کرے کہ میں ماں واں بنوں۔“ اس کے انداز میں

ناگواری در آئی، آیا ماں کے انداز میں اس سے بھی کہیں زیادہ۔

”بس..... اب ایک لفظ اور نہیں خدا خواستہ کوئی وقت بھی ہوتا ہے بد فال کے قبول ہونے کا بھی، کان کھول کر میری بات سنو، مجھے لگتا ہے تمہارا پیر بھاری ہے، اب سدھر جاؤ تو بہتر ہے۔“ وہ راز داری سے بولیں، قدر کے جانے بلا کیا پیر بھاری ہونا ہوتا ہے، وہ انہیں عجیب نظروں سے دیکھنے لگی۔

”آپ کیا کہہ رہی ہیں مجھے سمجھ نہیں آرہی۔“ وہ بات بات پہ جھلا رہی تھی، آیا ماں نے اب کے اسے سچ کر خود سے لپٹا لیا، اس کی بلائیں لینے لگیں۔

”بہت خوش نصیب ہے میری بچی کہ اللہ نے اتنی جلدی سن لی، ورنہ کتنے جوڑے ہیں جو شادی کے عرصے بعد بھی مٹیں مرادیں مانتے ہیں مگر اولاد نہیں ہوتی۔“ وہ خود میں مگن کہہ رہی تھیں، مگر ان کا انداز ان کی حرکتیں اب کے قدر کو کھٹکا لگیں۔

”ک..... کیا کہا..... کیا سن لی اللہ نے؟“ وہ اگر کچھ بھی بھی تھی تو اندر ایسی سراسمگی اتری تھی کہ زبان پہ نہیں لاسکی بس ان سے سوال کرتی انہیں خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگی، آیا ماں البتہ اس کی معصومیت پہ نہال ہو گئیں، واری صدتے جانے لگیں۔

”میری میٹھی، میری پیاری گڑیا، تو خود ماں بننے والی ہو گئی ہے، اللہ نے کتنا کرم کیا، کتنی جلدی کیا، یا اللہ تیرا شکر ہے۔“ آیا ماں نے پہلے اس کے حواس تحمل کیے پھر ہاتھ اٹھا کر رب کا شکر بجالانے لگیں، قدر کو گویا سکتہ ہو گیا، زمین اس کے قدموں تلے سے سرک گئی اور وہ نیچے بہت نیچے گرتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

جدا ہونے کے سانچے کو اگر چہ ہنس کے سہنا تھا

اسے رکھی سہی لیکن خدا حافظ تو کہنا تھا

زباں میں اتنی تو طاقت تھی مگر صراحت کی وحشت میں

میری بچپن سے عادت تھی مجھے خاموش رہنا تھا

وہ کچا کھیر وہ بارش میں ہماری چاکتی آنکھیں

ہمیں جانی ہوئی برکھا سے کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا

ہم رسم وفا اس سے نبھاتے بھی کہاں محسن

ہمارے خواب کے گھر تھے ہمیں تو ان میں رہنا تھا

وہ چھت پہ ٹہل رہا تھا، اس چھت پہ جہاں ایک بار وہ اس کے ہمراہ کھڑی تھی، یادیں آکھوپیں بن گئی تھیں، پیچھا نہ چھوڑتی تھیں۔

”پچھر بہت ہیں، موسیل لگائیں۔“ صبانے اس کے پاس لا کر موسیل کی شیشی رکھی، وہ چونک اٹھا۔

وہ بچے کو کاندھے سے لگائے تھکتی باہر والی دیوار تک آگئی، دیوار چھوٹی تھی، وہ سامنے چاندنی میں نہاے کھیتوں کا پورا منظر دکھ سکتی تھی، اس نے گہرا سانس بھرتے ہوئے اٹھا کر پھر اٹھا کر



دیکھا، ادھورا شخص اور ادھورا چاند، ادھورے پن کے دکھ سے بڑھ کر کوئی کیا دکھ ہو سکتا ہے۔

”آپ اس لڑکی سے شادی کیوں نہیں کر لیتے عمر۔“ وہ اب چار پانی پہ بیٹھ گئی تھی، نیچے کو گود میں لٹائے ہوئے ہوئے ہوئے تھک رہی تھی، عمر نے گہرا سانس بھرا اور کھڑی پہ نگاہ ڈالی، لائٹ آنے میں اب چند منٹ تھے۔

”نیچے چلتے ہیں، بی جان کھانا تیار کر چکی ہوں گی۔“ وہ قدم بڑھا چکا تھا، جو صبا کی آواز پہ پھر رک گئے۔

”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور ہاں، میں کھانا کھا چکی ہوں۔“ وہ ایک ساتھ بہت کچھ جتلا رہی تھی۔

”اس کی مشکلی ہو چکی ہے، عنقریب شادی ہے، آج کی خیر ہے، آئندہ کھانا میرے ساتھ کھائیے گا۔“ عمر نے مصلحت کی راہ پہ قدم رکھا، پتا نہیں کتنو واں، صبا اسے بغور دیکھتی قریب آئی، کھکا کر گھا صاف کیا۔

”عمر صاحب! میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں، کچھ ایسا جو آپ کے علم میں نہیں اور میرے باپ نے آپ کو دھوکے میں رکھا۔“

عمر نہ چونکا نہ حیران نظر آیا، اسی اطمینان زدہ انداز میں اسے ساٹ نظروں سے دیکھتا رہا۔

”ایسی باتوں کا اب کوئی فائدہ کوئی مقصد نہیں ہے صبا! ہم اس وقت شریک زندگی ہیں اور شریک حیات ایک دوسرے کا لباس قرار پائے ہیں، اگر مجھ میں کوئی عیب ہے تو اسے ڈھکنا آپ کی ذمہ داری ہے، اگر آپ میں خدانخواستہ کوئی جھول ہے بھی تو میں اسے عیاں ہوتا نہیں دیکھ سکتا، سو لیواٹ۔“ اس کا لہجہ سنجیدگی کا مظہر آواز میں ٹھہراؤ تھا، صبا اسے دیکھتی رہی، پھر کاندھے اچکا دیئے۔

”ممکن ہے آپ واقعی اتنے اعلیٰ ظرف ہوں، مگر عمر صاحب..... میں پھر بھی آپ سے کچھ شیئر ضرور کرنا چاہوں گی۔“

وہ جیسے ایک ہی مرکز پہ ان کی ضد پہ اڑی ہوئی تھی، عمر نے ٹھنڈا سانس بھرا، اسے منہ زور لوگ اچھے نہیں لگتے تھے، مگر وہ یہ بات صبا سے نہیں کہہ سکتا تھا، صبر کیا تھا تو پورا کیا تھا، ضبط اور برداشت میں کہیں بھی کمی کیسے آ جاتی۔

”چلیں اگر آپ کی کہہ کر تشفی ہو جائے گی تو اس میں حرج نہیں، کہہ ڈالے۔“ عمر نے کاندھے جھٹک دیئے، صبا کے چہرے پہ طنز یہ مسکراہٹ اتری، جس کا رنگ صاف کہتا تھا، بہت اعلیٰ ظرف بنتے ہو، کہانی سن کر پھر دکھانا یہ ٹھیک، یہ بردباری۔

”بابا نے آپ کو میرے بارے میں یہ بتایا کہ میری شادی ہو چکی تھی اور میرے شوہر کا کسی بات پہ اختلاف ہوا اور ہماری سپریشن ہو گئی۔“

”انہوں نے کہا تھا طلاق ہو گئی۔“

”وہی وہی.....“ صبا نے ٹوکے جانے پہ سر جھٹکا، عمر اسے دیکھے گیا۔

”جبکہ ایسا نہیں ہے، میں آزر کو پسند کرتی تھی، وہ ہمارے رفیق و سہوکار تھا۔“

ایسا تو بابا نے صاف انکار کر ڈالا، جبکہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں رکھتے تھے، آزر کی ایما پہ میں نے، گھر چھوڑ دیا۔“

وہ رک گئی، عمر کے تاثرات دیکھنے لگی، جن میں ذرا پھر بھی تہدیلی نہیں آئی تھی، وہ بنا کسی خاص تاثر کے اس کی بات سن رہا تھا، صبا نے گہرا سانس بھرا اور پھر سے گویا ہوئی۔

”آزر نے مجھ سے بابا کے انکار کا انتقام لیا، مجھ سے شادی نہیں کی، اسے بابا پہ غصہ تھا جنہوں نے رشتہ مانگنے پہ اس کی توہین کی تھی، میرا یہ بچہ میری جائز اولاد نہیں ہے، جب میں پریگیٹ ہوئی تو آزر نے مجھے گھر سے نکال دیا، میری منت حاجت کام نہ آئی، میں کہاں جانی، واپس بابا کے گھر ہی آتا تھا، جنہوں نے غیرت کے نام پہ مجھے قتل تو نہ کیا مگر مصلوب ضرور کر دیا، آپ سے شادی کر کے۔“ وہ خاموش ہو گئی، بلکہ آنسو بہانے لگی، عمر جیسے کھڑا تھا ویسے ہی کھڑا رہا، اس کے چہرے کو دیکھ کر اس کے اندرونی جذبات کا بعد پانا از حد مشکل تھا۔

”کیا آپ کو ان ساری باتوں کا علم ہے؟“ صبا کو عجیب سی کوفت ہوئی اس کے رویے سے تو سراٹھا کر سوال کیا تھا۔

”ہاں..... تقریباً۔“ وہ ساٹ آواز میں بولا تو صبا کی آنکھیں حلقوں سے حیرت کی زیادتی

### ابن انشاء کی کتابیں

#### طنز و مزاح سفر نامے

- اردو کی آخری کتاب،
- آوارہ گرد کی ڈائری،
- دنیا گول ہے،
- ابن بطوطہ کے تعاقب میں،
- چلتے ہو تو چین کو چلئے،
- نگری نگری پھر امسافر،

#### شعری مجموعے

- چاند نگر
- اس بستی کے اک کوچے میں
- دل و جوش

#### لاہور اکیڈمی

۲۰۵ سرکلر روڈ لاہور۔



ضروری ہے، تم کل چلو میرے ساتھ شہر۔“ انہوں نے بہانے سے اسے رام کرنا چاہا، وہ کچھ نہیں بولی، بلکہ مندی کچھ سوچتی رہی۔

”کیا یہیں گاؤں سے اس بات کا کنفرم نہیں ہو سکتا؟ اللہ کرے ایسی بات ہی نہ ہو، تب مجھے شہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔“ آیا ماں کو ٹوٹ کے قہر و غضب چڑھا مگر اپنی زبان دبائے بیٹھی رہیں، دل میں جو سوچ رہی تھیں اس کا ارادہ پختہ کیا۔

”جیسی تمہاری مرضی پچی، تو دیے بھی اپنی مرضی کی مالک ہے۔“ انہوں نے سر آہ بھری، قدر الہ اس سراسر کے بہتان پہ پھٹ پڑی تھی۔

”الزام دے رہی ہیں مجھے؟ اپنی مرضی کی مالک ہوتی تو بھیج کر کی طرح میرا باپ مجھے کسی بھی راہ چلتے کے ہاتھ میں نہ تھا چکا ہوتا، اس مصیبت میں بھی نہ پڑی ہوتی کاش میں نے ہتھیار نہ پھینکے ہوتے۔“ آنسو دل گرنے کی انتہا پہ پہنچ کر پھر سے بہنے لگے، آیا ماں نے بے اعتنائی سے دیکھا اور نگاہ پھیر لی۔

”اچھا بی بی! تو جی ہی پچی ہم جھوٹے، میں چلوں، گرمی سے دل گھبراتا ہے، مانو باہر آگرے گاسینہ بھاڑ کر، چھت پہ ٹھنڈی ہوا میں نماز پڑھوں گی، تمہارا دل کرے بڑھی کے پاس سونے کو تو وہیں آ جانا۔“ گفتگوں پہ ہاتھوں کا دباؤ ڈالتی اٹھی تھیں، قدر نے جواب بھی نہیں دیا، وہ جس فکر مندی اضطراب اور وحشت کا شکار نظر آتی تھی، اسی میں مبتلا رہی تھی، آیا ماں چپل ہستی باہر جا رہی تھیں، وضو کر تیں غانیہ نے نگاہ پڑی تو وہیں چار پائی پہ بیٹھ کر اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگیں، غانیہ انہیں دیکھ کر ہنسنے لگی، یہ مسکراہٹ خیر مقدمی تھی۔

”وہ تو کروں گی مگر پہلے تم ادھر آؤ ذرا بات سنو۔“ انہوں نے اشارے سے بلایا انداز راز داری کا تھا، غانیہ چونکیں حیران ہونے کے ساتھ منظر ہوتیں قریب آئیں۔

”یہاں کوئی ڈاکٹر ملی کے، گاؤں میں ہی.....؟“

”جی..... مگر خیریت؟“ غانیہ کا استعجاب بڑھ گیا، تشویش گھبراہٹ کی جانب عازم سفر ہوئی۔

”بچی مجھے تو تم پہ حیرت ہے، جو بات میں نے تمہیں میں بھانپ لی وہ اتنے دنوں میں تمہیں معلوم کیونکر نہ ہو سکی۔“ ان کا انداز غلطی بھرا تھا، غانیہ کا ماتھا ٹھنکا، اب کے وہ کچھ نہ بولیں، کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں مگر تشویش بھری نظروں سے ضرور انہیں نگر نگر دیکھے گئیں، پریشانیوں الجھنیں ایسی ایسی پڑی تھیں کہ سچ معنوں میں سکھ کا سانس لینا محال ہو گیا تھا ان کا، مگر اپنی تھیں سہتی رہیں، اولاد کے حوالے سے بھی دکھ اٹھائے مگر اللہ نے خصوصی کرم فرمایا آزمائش عورت اختیار نہ کر سکی، یہ معاملہ تو تھا ہی بیگانی بچی کا اور لڑکی بھی ہرگز معمولی اور عام نہ تھی، پھر بھی ان کے حواس نہ اڑتے، پھر بھی کیا ہاتھوں کے طوطے نہ اڑتے۔

”خیر سے معاملہ خوشی کا ہی ہے، بچی مجھے لگتا ہے دو جی سے ہے مگر تھوڑی اٹھری ہے، کسی کی سستی نہیں ہے، باپ نے بھی ترچھی آنکھ سے بھی نہیں دیکھا تھا..... نازک مزاج بہت ہے، پھر عمر بھی کچھ نہیں، نا تجربہ کار ہے، ابھی تو شادی سے ہی گھبراتی تھی، خیر سے یہ خوشی کی خبر مل گئی،

سے اہل پڑیں۔

”ک..... کک..... کیسے؟“ وہ ہکلا گئی، بوکھلا اٹھی، عمر نے سر جھٹکا۔

”ان باتوں کو چھوڑ دیں، آپ کتھارس چاہتی تھیں میں نے منع نہیں کیا کیا یہ کافی نہیں؟“

عمر اب اسے نہیں دیکھ رہا تھا، لائٹ آگئی تھی، اب ماحول اتنا تاریک نہیں رہا تھا۔

”نہیں..... یہ کافی نہیں..... کیونکہ..... میں آج بھی آذر سے محبت کرتی ہوں، میں آج بھی آپ کو قبول نہیں کر پائی۔“ وہ بلند آواز سے روٹی پلٹ کر نیچے بھاگ گئی اور تب سے مضبوط اعصابی کا مظاہرہ کرتا عمر اس ایک لمحے میں آکر پوری ہستی سمیت بل گیا، چہرہ شدت جذب سے سرخ ہو گیا، آنکھوں سے لہو چھلکنے کے قریب ہوا تھا۔

اس نے خود پہ نفرین بھیجی، اس نے خود کو بلا در بفع ملامت کی تھی، مقام افسوس تھا، وہ اس کی بیوی ہو کر اس کے نکاح میں ہو کر اسے آج تک خود کو چھوئے کی اجازت نہ دے سکی تھی اور جس سے محبت کرتی تھی، اس سے اپنا آپ خوشی سے پامال کر داتی آئی تھی، یہاں تک کہ گناہ کی نشانی لگے لگائے پھرتی تھی، فخر سے داستان سناتی تھی، کیا وہ اتنا گیا گزرا تھا، ایسی ہی عورت ڈیزر کرتا تھا؟ سوال اٹھ رہے تھے، سنگ ملامت برسا رہے تھے۔

☆☆☆

دل دل تھی زندگی سو دھنستا چلا گیا  
میں اپنی بے بسی پہ یوں ہنستا چلا گیا  
پہلے دکھا رہا تھا مجھے منزلوں کے خواب  
پھر میرے سامنے سے وہ رستہ بدل گیا  
میں رو پڑا تھا جس کی جدائی کا سوچ کر  
وہ شخص میرے حال پہ ہنستا چلا گیا

اس کا سکتہ ٹوٹا تو آنکھوں میں آنسو آگئے، بے بسی گھبراہٹ اور اضطراب کا ایسا غلبہ چھایا کہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”یہ..... کیسے ہو سکتا آیا ماں، یہ نہیں ہونا چاہیے، میں ایسا نہیں چاہتی تھی۔“ وہ کھڑے شہتیر کی مانند گرنے کو بھی جب آیا ماں نے اسے پیچھے سے سہارا دے کر صوفے پہ بٹھایا اور اس کے رخ ہوتے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلائی رہیں، غم و غصے کی شدت اس کے پورے جسم کھلے رہی تھی، ضبط کی طنائیں اس کے ہاتھ سے چھوٹی جا رہی تھیں۔

”میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی اور..... اور آپ یہ بات کسی کو نہیں بتائیں گی، میں خود پر یکینسی ٹیسٹ کرواؤں گی، اگر واقعی ایسی بات ہوئی تو اس مصیبت سے جان چھڑانے میں آپ میری ہیلپ کریں گی، سنا آپ نے۔“ معا اس کا رویہ اس کا انداز بدل گیا، آیا ماں کو اس پر جو غصہ آیا، اس کا کیا انت شمار ہوتا، مگر اسے غصے کو ظاہر کر کے اسے مزید مشتعل اور جذباتی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

”دنیا سے انوکھی لڑکی ہو تم ہر لحاظ سے، خیر یہ محض میرا خیال یا وہم بھی ہو سکتا ہے، جب اب



گھبراہٹ کا نہ پوچھو۔“

آیا ماں عادت کے مطابق طویل گفتگو فرما رہی تھیں مگر غانیہ کو حاصل وصول مل گیا تھا، اصل نقطہ اصل مقصد اصل پوائنٹ ان تک پہنچ گیا، پہلے حواس گھبراہٹ نے سب کچھ ابھارے تھے اب اچانک اور بے پایاں خوشی نے گنگ کر ڈالا، انہیں تو سمجھ نہ آ پائی وہ کیا کہیں کیا کریں، ایسی ہی بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئیں۔

”یعنی کہ ہمارا حمد ان..... ماشاء اللہ..... آپ سچ کہہ رہی ہیں، آپ کو کہیں غلط فہمی تو نہیں ہوئی، میرا مطلب ہے کہ.....“ خوشی انبساط مسرت وہ ہکھلانے لگیں، آیا ماں ان کی جوش جذبات میں بے قابو ہو کر بلند ہو جانے والی آواز پہ سنبھالیں، گھبرا کر ان کے منہ پہ ہاتھ رکھا۔

”خاموش..... آہستہ..... آرام سے بچی۔“ انہوں نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔

”ابھی وہ میرے کان کھینچے گی، کہا تو ہے بھی لڑکی گھبراہٹ کا شکار ہے، بھٹکے پالا ہے مگر ہوں تو نوکر ذات ہی، مالک کے موڈ کے حساب سے بات کرنا پڑتی ہے۔“ انہوں نے راز داری کی اصل وجہ بیان کی، غانیہ سنبھل گئیں مگر مسکراہٹ ضبط نہ کر سکیں، جو چل رہی تھی، اتنی بڑی خوشی کی خبر وہ بھی اتنی اچانک، انہیں تو یقین نہ آتا تھا، یقین آتا تھا تو دل سجدہ شکر بجالانے لگتا تھا، اللہ نے کتنا کرم کر دیا، ابھی تو شادی کو چند ہفتے ہوئے تھے کہ اللہ نے ایسے جھولی بھردی، نواز دیا۔

محلے میں چند گھر چھوڑ کے بی ان کی پڑوسن کتنی پریشان تھی پچھلے برس، بیٹے کی چھوٹی سی عمر میں ہی شادی کر دی، ابھی پہلا مہینہ گزرا ہوگا، بیاہ کو کوئی امید نہ لگی، بہو جوان کے بیٹے سے کئی برس بڑی اور پختہ تھی، ہر آئے گئے کے سامنے کہنا شروع کر دیا، لڑکے میں ہی نقص ہے، اس میں یہ صلاحیت ہی نہیں، ماں بیچاری کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہی، چھپ چھپ کے آنسو بہانی، دعائیں مانگیں، اللہ نے بالآخر کرم کر دیا، خوش خبری مل گئی، غانیہ نے سب سنا تھا، عجیب سا خوف عجب سا وہم دل میں تب سے پڑا تھا۔

پتا نہیں آج کل کی لڑکیاں اتنی بے حجاب اور بے باک کیونکر تھیں، صد شکر کہ ان کے گھر ایسی کوئی کہانی نہیں دہرائی گئی، اللہ نے کتنی جلدی نواز دیا، کرم فرما دیا، ان کا دل کیا کھڑے کھڑے سجدے میں گر جائیں، اڑ کر حمد ان کے پاس پہنچیں، اس کا ہاتھ چومیں، گلے لگائیں، مبارک باد دیں، وہ جھینپا جھینپا کیسا پیارا لگے گا، کہ کیا دولہا بن کر روپ آیا ہوگا، ان کے تصور کی دنیا میں کتنے رنگ بکھر گئے تھے، آیا ماں نے حیران ہو کر انہیں دیکھا، پھر ناراضگی کے اظہار کو ٹھوکا دیا تھا باقاعدہ۔

”اے بچی، کدھر پہنچ گئی؟ بلکہ گم ہو گئی ہو، میری بات کا بھی کوئی جواب دو گی؟“ ان کی خفگی چھلکانی آواز پہ غانیہ چونکیں، سنبھل گئیں۔

”جی..... جی ڈاکٹر نے ہے، ابھی تو ماننا مشکل ہے، صبح گھر بھی آجائے گی، یا اگر کہیں تو میں ان کے پیار سے کہتی ہوں، ہم قدر کو لے کر اس کے گھر چلتے ہیں۔“ وہ ان کی رائے مانگ رہی تھیں، آیا ماں نے سر کوئی میں جنبش دی۔

”نہیں، کل ٹھیک ہے، میں اب نماز پڑھ لوں۔“ آیا ماں وضو کے ارادے سے اٹھیں، غانیہ

کچھ اچلی سی ہانگیں۔

(لیکن میں کل تک کیسے انتظار کروں، دل تو کر رہا ہے ابھی یا رمن کو بتا دوں، ہر کسی کو اس خوشی میں شریک کروں۔)

”جی..... جی پڑھ لیں۔“ انہوں نے سر اٹھا کر اوپر والے پورشن کی طرف دیکھا، جہاں قدر کے کمرے کی کھڑکیاں تاریک تھیں، وہ دل موس کر رہ گئیں، قدر کو اک نظر دیکھنے کی خواہش بھی اندر ہی دہانا پڑی، اسے ڈسٹرب کرنا مقصود نہ تھا، انہوں نے برآمدے میں پہلے آیا ماں کے لئے چائے نماز بچھائی پھر اپنے لئے اور نیت باندھ کر اپنے رب کے حضور پیش ہو گئیں، روئیں روئیں سے شکر چھلکتا تھا، آج وہ بہت مگن ہو کر نماز پڑھ رہی تھیں، ایسی نماز جو اصل نماز ہے مگر بھی کبھی ایسا استغراق نصیب ہوا کرتا ہے اور قسمت سے ہوا کرتا ہے، ہم جیسے عام سے انسانوں کو۔

☆☆☆

پھر دامن امید وہ پھولوں سے بھر گیا  
جادو بھری نگاہ سے جادو سا کر گیا  
بس دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بدل گئی  
کچھ سوچتے ہی سوچتے چہر اتر گیا  
بے تاب بے قرار تھا پہلو میں دل بہت  
پھر آپ کا آنا اور بھی بے تاب کر گیا  
اک بے خودی کا نام محبت ہے دوستو  
جاہت میں کس کو ہوش کیا کیا گزر گیا  
کچھ بھی پتا نہیں ہے محبت میں اے محسن  
کب رات صبح بن گئی کب دن گزر گیا

انہوں نے اشعار پڑھے بلکہ صرف نظر دوڑائی اور لا پرواہی سے سیل فون جیب میں رکھ لیا، جب سے روشنی سے رابطہ ہوا تھا، تعلق بڑا تھا، ایسے پیغامات تو معمول بن چکے تھے۔

ہم کو بھی کیوں دیتے ہو پیار کا الزام  
کبھی خود سے بھی تو پوچھو  
اتنے پیارے کیوں ہو.....

اظہار کے معاملے میں وہ بے باک تھی، بہت بے باک، وہ مرد ہو کے خفت سے بھر جاتے، اسے عورت ہو کر کبھی حجاب کا لحاظ نہ ہوا، وہ ان کی نظر اندازی کے شکوے کیے جاتی، سلیمان کے پاس ایک حل تھا خاموشی، آج کل اور پچھلے دنوں وہ جس انداز میں قدر کے لئے حساس اور افسردہ ہوتے تھے، سیاسی سرگرمیاں متاثر ہو گئی تھیں، روشنی کیا چیز تھی۔

”السلام علیکم!“ فون کی تسلسل سے ہوتی تیل پہ انہیں آخر کار کال رسبو کرنا پڑی۔  
”علیکم السلام..... علیکم السلام..... کیا کہیں آپ کو خان صاحب، کہنے کو کچھ چھوڑا ہی کیا کہ..... پاس آنے کی اجازت نہیں دیتے اور دور ہونے کو اپنا دل بے ایمان راضی نہیں، اب



جائیں تو کہاں جائیں، پتا نہیں آپ کے گریز میں بھی کیا مقناطیسی کشش ہے کہ اپنی ہستی کا وقار تو کیا اپنی مصروفیات تک ترک کر کے آپ سے ملنا چاہتی ہوں مگر اس کشش میں ناکامی پہ کھلتا ہے، ساحل اور سمندر کا کھیل کھیل رہے ہیں آپ ترسا ترسا کر توجہ کی دو بوند سے نوازتے ہیں تو یہ بھی سمجھیں سرکار تشنگی مٹنے کے بجائے بڑھ جاتی ہے، یہ قرار کی عالم ہی انوکھا ہو جاتا ہے، کچھ تو خیال کر لیں۔“ ادھر بے تائیاں تھیں، بے قراریاں تھیں، سلیمان نے ایسے عامیانہ الفاظ و انداز کہاں دیکھے تھے کہ کوئی تاثر نہ دیتے، وہ تو خفت و خجالت سے ایسے دوچار ہوئے کہ الفاظ ساتھ چھوڑ گئے، جبکہ وہ کہہ رہی تھی۔

کہاں سے اے اقبال تو نے سیکھی ہے یہ درویشی

کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

”دیکھیں بی بی روشن آراء صاحبہ..... میں.....“

”ہائیں..... بلکہ ادوف..... آپ نے اتنے خوب صورت نام روشنی کو، یہ کیسا بد نما بنا دیا خاں صاحبہ.....!“ اس پہ بھاری بھر کم لائقہ بی بی کا بھی ہضم نہ ہوا۔

”دیکھیں ہماری شادی ہونے والی ہے، آپ ایسے بات کرتے ہیں جیسے پہلی بار مخاطب ہو رہے ہوں، تکلیف دہ انداز اب تو چھوڑ دیں۔“ سلیمان اپنی مخصوص بر باد باری و حمل سمیت کچھ کہنے لگے تھے مگر وہ تو بلبل گئی، یہ بلبلانا ایسا شدید تھا کہ سلیمان خاں کو واقعی لگا وہ کسی زیادتی کے مرتکب ہو گئے ہیں خواہواستہ۔

”آئی ایم سوری، اکیچو نیلی میں اپنی ذاتی مصروفیات کی بنا پر نام نہیں نکال پا رہا تھا۔“ وہ صاف گو صاف دل انسان تھے، انداز ایسا ہی مجرمانہ تھا گویا وعدہ کر کے وقت پہ نبھانے پانے پہ شرمسار ہو سکتے تھے۔

”بیٹی کی شادی تو خیر و عافیت سے ہوگئی نا خاں صاحبہ..... پھر کیا مسئلہ ہے اب؟“ اس کا انداز لا جواب کرنے والا تھا، سلیمان لا جواب ہوئے بھی، صرف لا جواب نہیں خجالت زدہ بھی، بات وہی کہ روادار انسان تو اپنی معمولی کوتاہیوں پہ بھی نگاہ رکھتا ہے، شرمندہ رہتا ہے، ازالے میں مصروف ہو جاتا ہے، یہی حال تھا ان کا مگر ایسے کیا بتاتے کیا انھیں یا پریشانی تھی، بیٹی کے معاملے میں کسی تیسرے فریق کو راز داں کیا بھی نہیں جاسکتا تھا۔

”آپ بھی سوچتے ہوں گے کیسی اتاؤلی خاتون سے پالا بڑ گیا، وہ پنجابی کی ایک کہاوٹ ہے اردو ترجمہ ہی سن لیں، آپ ٹھہرے پٹھان خان، پشتو بولنے والے یا پھر انگلش میں عبور حاصل ہے، لے دے کر آگئی تو اردو آگئی، پنجابی سے نا بلد جی کہہ رہی ہوں کہ، چور سے زیادہ چوری کیے ہوئے سامان کی گٹھڑی بھاگنے کو تیار ہے، ہے نا یہی بات، کہ آپ سے زیادہ مجھے جلدی ہو رہی ہے شادی کی، دراصل میں اب بھی آپ سے نہ مہتیں مگر سوشل میڈیا پہ کسی نے ہمارے تمہارے اس تعلق کو لے کر بہت کچھ شعلہ بیانی کی ہے، طرح طرح کے بیانات اور اعتراضات اٹھ رہے ہیں، آپ یہ..... میں تو پریشان ہوگئی، شاید آپ نے دھیان نہ دیا، سوچا آگاہ کردوں، یہ معاملہ نازک ہے، آخر میری عزت کا سوال ہے، آپ کا کیا ہے، آپ تو پورے کل میں ہونے کی وجہ سے اسکیڈنڈلز کی

رو میں رہتے ہی ہیں۔“ وہ ان پہ انوکھے انداز میں دباؤ ڈال رہی تھی، وہ عزت کا واویلا مچا رہی تھی جس کی کوئی عزت ہی نہ تھی، عزت سے دور کا واسطہ نہ تھا، مگر پریشاں کرنا خوب جانتی تھی، سارے اسٹوڈنٹس سے باخبر تھی، کب کون سا کھیل کھیلا ہے، کب پانسہ پلٹا ہے، کب شہدہ دینی ہے کب مات اٹھائی ہے، سلیمان خان کے چہرے کا رنگ بدل گیا، وجہ یہ چہرے پہ کتنے رنگ اترے، اندر لاتعداد سوال اور صدمہ مچا کر رہ گئے۔

”کون سا تعلق۔“ وہ پوچھنا چاہتے تھے کہ الفاظ کی معنی خیزی نے جزبہ کیا تھا، مگر جواز اور سوال اتنے طویل ایسے انجمن آمیز تھے کہ ان کا ہر سوال اسی انجمن میں کھو گیا، پیچھے رہ گیا تو وہ نظر کر وہ تشویش وہ اضطراب جس میں اس سارے سلسلے میں انہیں مبتلا کرتا مقصد تھا، عزت دار کے سامنے عزت کے لئے واویلا کیا جائے تو خود داری کا تقاضا ہے، وہ سب سے پہلے عزت کے حصول کی جدوجہد کرے گا، یہی حال سلیمان کا ہوا، جسے وہ اپنے نام کی چادر اوڑھ رہے تھے، اس کی عزت کے معاملے میں انہیں حساس ہونا ہی تھا۔

”جی..... میں نہیں دیکھ سکا، بہت معذرت..... کہ آپ کو میری کوتاہی کے سبب اس اذیت سے گزرنا پڑا، اب بے فکر ہو جائیں میں پہلی فرصت میں نکاح کا بندوبست کروانا ہوں، جب درمیان سے شک نکلے گا، بات جائز طریقے سے کھل کر سامنے آئے گی تو باتیں کرنے والوں کے منہ از خود بند ہو جائیں گے، اپنا خیال رکھیے، ٹیک کیئر۔“ انہوں نے بات سمیٹ لی، من پسند جواب سننے کو ملا تھا، پھینکا گیا جال نشانے پہ بیٹھا، وہ پہلے کبھی ناکام ہوئی تھی جواب ہوتی، وہ من پسند حاصل کرنے کو ہر حد تک جاتی تھی، پھر ناکام ہوتی تھی کیسے۔

☆☆☆

شام خفا ہے اور رات بھی نہیں ہوتی  
سلے ہیں ہونٹ کوئی بات بھی نہیں ہوتی  
میں اس کی ذات کا حصہ بن نہیں سکتا  
مگر جدا اس سے میری ذات بھی نہیں ہوتی

آیا ماں چلی گئیں تو کمرے میں تاریکی چھا گئی، وہ خود کو اسی تاریکی کا حصہ سمجھتی وحشت زدہ بیٹھی تھی، کتنے خیال تھے جو پریشان کن تھے بلکہ یہ خیال ہی پریشان کن تھا، اضطراب بڑھاتا ہوا وحشت بھی مبتلا کر ڈالنے والا، سب سے پہلا خوف تو یہ پریشانی پرید کا طویل مرحلہ اور اس کی اذیتیں، پھر ڈیوری کے ٹائم کی کڑی اور طویل اذیت..... اپنے بچپن میں اس نے آیا ماں کی اپنے شوہر سے ناراض ہو کر ان کے پاس پناہ لینے والی حاملہ بیٹی کو اس حال کی ہر آزمائش سے گزرتے دیکھا تھا اور ایسا خوف اندر بیٹھا تھا کہ اس کا تصور اس کا خیال ہی لرز جاتا، وہ وہ علی شیر تھا جس سے اسے محبت ہی ایسی ہوگئی تھی کہ شادی لفظ کے نام سے خوف کچھ کم ہوا تھا مگر دل میں سوچ کے بیٹھی تھی ہر گز بھی جلدی ماں نہ بننا چاہے گی اسے یقین تھا علی شیر اس کی بات ضرور مانتا، مگر..... سب کچھ درہم برہم ہو گیا، الٹ پلٹ ہو گیا، علی شیر کو ایسی باتوں پہ قائل کیا کرتی کہ اس سے شادی کی نوبت نہ آئی اور جس سے شادی ہوئی اس نے پہلی رات ہی اسے خود سے مزید متفر مزید بدظن کر



والا، اس بندھن اس تعلق اس رشتے سے گھن کھانے یہ مجبور کر دیا، خوف انتہاؤں پہ پہنچا دیا، وہ جتنا مرضی کہتا کہ یہ اس کی محبت تھی، محبت کا اظہار تھا، قدر یقین نہ کر سکتی تھی، یقین دلانے کا طریقہ ایسا نہیں ہوتا۔

پھر اس کا یہ دکھ یہ بلال ختم نہ ہوتا تھا پیمانے اس کے ساتھ ظلم و زیادتی کی انتہا کر دی ہے، اپنی اصلاح اپنی بہتری وہ اس جذباتی کیفیت نا تجربہ کاری اور نادانی کے باعث کیسے پرکھتی، علی شیر اس سے دور کر دیا گیا، اس کا واحد دوست اکلوتا جانثار، وہ کیسے اتنے سارے صدمے سنبھالتی، اسے ٹوٹنا تھا وہ ٹوٹ پھوٹ کا ہی شکار تھی، پوری دنیا اندھیر نظر آرہی تھی، جو بھی تھا ایک ظلم کے بعد وہ دوسرا سہنے برداشت کرنے پہ آمادہ نہیں تھی، اس نے فیصلہ کر لیا تھا، چاہے کچھ ہو جائے وہ اس بچے کو دنیا میں نہیں آنے دے گی، یہ بچہ تو اس کے قدموں کی زنجیر بن جاتا، کبھی بھی راستے الگ نہ کرنے دیتا، جبکہ علی شیر نہ بھی ملتا اب وہ اس حمدان کے ساتھ کو بھی قبول نہیں کر سکتی تھی، یہ طے تھا مگر کوئی حل نظر نہ آتا تھا، اتنی سمجھ تو اسے بھی تھی آیا ماں اس آگاہی کے بعد اس پہ ایسا پہرا دیں گی گویا خزانے پہ سانپ بن کر بیٹھی ہوں، اسے آیا ماں سے جان چھڑانا تھی اور کسی دوسرے طریقے سے مصیبت سے نجات حاصل کرنا تھی، ایسے میں لے دے کر ایک وہی رہ جاتا تھا جس سے اس وقت اسے سب سے زیادہ نفرت تھی، یعنی منصف حمدان۔

بہت خود سے الجھنے لڑنے اور دل پہ جبر کرنے کے بعد وہ خود کو اس سے بات کرنے پہ آمادہ کر پائی کہ اس کے سوا چارہ نہیں تھا کوئی۔

”ہیلو۔“ اپنا آف کیا ہوا موبائل نکال کر چارج کرنے کے بعد اس نے جس وقت حمدان کا نمبر ملایا، رات کے گیارہ بج رہے تھے اور یہاں گاؤں میں یہ آدمی رات کا وقت ہوتا ہے اور جاگتا ہوا کوئی خوش قسمتی سے ہی مل سکتا ہے۔

”زہے نصیب..... صد شکر کہ آپ کو ہماری یاد آگئی۔“

دوسری جانب وہ نہ صرف جاگ رہا تھا بلکہ فریش محسوس ہوتا تھا، یا شاید اس کی آواز سن کر یہ بشارت آواز کا حصہ بنی تھی، قدر کا حلق کڑوا ہونے لگا۔

”سیانے سچ کہتے ہیں، موت کا فرشتہ گاہک اور بیوی کا فون کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔“ اپنے پاس سے من پسند اخراج کرتے ہوئے وہ چپک کر کہہ رہا تھا، قدر کے حلق کی کڑواہٹ اس کے لہجے میں خود بخود اتر آئی۔

”تم مجھے اپنے لئے صرف موت کا فرشتہ سمجھو تو زیادہ بہتر ہے۔“ اس نے اپنے تئیں سفاکی کی انتہا کی، جوابا حمدان کی ہنسی سنائی دی تھی۔

”آپ اس کی عملی مظاہرہ کر چکی ہیں، میرا زخم ابھی بھرا نہیں ہے بھولا نہیں ہے مجھے، آپ کا شکر یہ کہ اگر یاد کیا تو کیا خوب یاد دلایا ہے کہ۔“

عیادت کو میری آکر

وہ یہ تاکید کرتے ہیں

تمہیں تو ہم ہی ماریں گے

اس دراصل ایک ہو جاؤ

اس کے گہرے دل میں عجیب سی سلگن تھی، شرمندگی کا احساس تھا یا کچھ اور کہ قدر کچھ تانیوں کو بالکل بیکہ نہ نہ پائی، مگر یہ شرمندگی زیادہ دیر تک اپنا غلبہ بحال نہ رکھ سکی۔

”درست ہے، میں وہاں آنا چاہتی ہوں۔“ اس نے سن رکھا تھا، مطلب کے وقت گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے، کیا حرج تھا اس میں اگر اپنی ضرورت پوری کرنے کو جانی دشمن سے فائدہ حاصل کر لیا جائے۔

”یعنی میرے پاس آنے کو دل کر رہا ہے؟“ حمدان کی ٹون ہی بدل گئی اس بات کو سنتے، شوشی سے سوال کیا، قدر کی تیوری لمحے کے ہزاروں حصے میں چڑھی۔

”یہ تو میں تمہیں وہاں آکر بتاؤں گی کہ کیا دل کر رہا ہے۔“ وہ ایسے بولی گویا لفظ نہیں دانتوں تلے اسے چھپایا ہو، حمدان نے ساختہ ہنستا چلا گیا۔

”ضرور بتانا..... میں نکل ہی تمہیں لینے آ جاؤں گا، کوئی اور حکم؟“ قدر نے جواباً کچھ کہنے کی بجائے فون بند کر دیا، وہ ایسی بد اخلاقی بے مروت اور بد لحاظ بھی نہ تھی، مگر وہ یہ سارے ستم حمدان پہ ضرور آزمانا چاہتی تھی، اجنبی الفاظ ابھی لہجہ اور انداز بے حد بیگانے پہ سب ستم اس نے حمدان پہ توڑے تھے، وہ کسی کو کیا بتاتی..... اس خبر کے بعد سے تو اس کے دماغ کی رگیں باقاعدہ جھجھکی اٹھیں، تناؤ کا شکار تھیں، ایسی اذیت میں مبتلا تھی جو ناقابل بیان تھی، آنکھیں بار بار جھپکتی تھیں، اسے یہاں آئے دوسرا ہفتہ ہی تھا جب اسی گاؤں میں باہر سے بیاہ کر آئی فرانسسی لڑکی اس کے باپ کے فین ہونے کے ناطے اس سے ملنے چلی آئی تھی۔

”سلیمان خان سے ملاقات تو اک خواب تھا، میں نے سوچا ان کی بیٹی سے ہی ملاقات کا شرف حاصل کر لیا جائے۔“ فرانسسی لہجے میں پہنچائی اور انگلیش بولی وہ بہت دیکھنے کی چیز لگتی تھی، بھی بھی سے حد پیاری مگر قدر نے اسے بھی کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔

”تم نے خوشخبری بھی نہیں سنائی اوپر سے میاں کو اتنی دور بھیج دیا، بڑا حوصلہ ہے تمہارا کیلی رہ رہی ہو یہاں۔“ وہ خاصی بے تکلف تھی اور بے باک بھی، اس کا گال چھو کر شرارت سے کہہ رہی تھی، قدر کا چہرہ کچھ غصے سے کچھ جاب سے سرخ پڑا، اس کے اختیار میں ہوتا تو اس خوب صورت چہرے کو دھکے مار کر وہاں سے نکلوا دیتی۔

”تم بہت یونیک اور معصوم ہو، بالکل سر سلیمان کی طرح..... انہیں میں نے ایک جلمے میں دور سے دیکھا تھا، وہ اس سے کہیں بڑھ کر امیر یو اور گڈ لکنگ میں جیسے وہ اپنی تصویروں میں نظر آتے ہیں تمہارا نام بھی یقیناً انہوں نے رکھا، بہت منفرد اور پیارا ہے، جیسا تمہارا حسن ہے، دیکھنے والے کے دل میں اتر جانے والا۔“

وہ اور بھی بہت کچھ کہتی رہی، مگر قدر سخت بے زار تھی، بے زار رہی، ہر کوئی ان دنوں میں اسے بچے کے متعلق ہی دعاؤں سے نوازتا رہا، ایسے ہی سوال کرتا رہا تھا، اس کا ذاتی خیال تھا اور بہت پختہ تھا یہ اسی نحوست کا شاخسانہ تھا، معاً تاریک کمرے میں روشن سی پھوٹ پڑی، اس کا موبائل اندر سے میں جگمگا اٹھا، ایک پیغام موصول ہونے کی اطلاع کے ساتھ، اس نے بے دلی سے فون



اٹھایا تھا، مقصد دھیان بنانا تھا۔

ایک لمحے کو میرے پاس آؤ  
اور لمحے کی آنکھ لگ جائے

وہ ایک دم سکتے میں آگئی، یہ پیغام علی شیر کے نمبر سے تھا، علی شیر..... جسے وہ بھولی نہیں تھی، بھول سکتی ہی نہیں تھی، جو اس کے دل کے ہر کوئے دماغ کی ہر رگ میں زندہ تھا، ان مٹ تھا۔

☆☆☆

کسی رنجش کو ہوا دو کہ میں زندہ ہوں ابھی  
مجھ کو احساس دلا دو کہ میں زندہ ہوں ابھی  
میرے رکنے سے میری سانس بھی رک جائے گی  
فاصلے اور نہ بڑھاؤ کہ میں زندہ ہوں ابھی  
چلتا رہا میں یونہی آنکھ لگی ہو گی  
بھیز لوگوں کی ہٹا دو کہ میں زندہ ہوں ابھی  
زہر پینے کی تو عادت تھی ایذا دینا والو  
اب کوئی اور دوا دو کہ میں زندہ ہوں ابھی  
یہ زندگی زندگی نہیں اس کے بغیر وحی  
صرف سانس لینا اگر زندگی ہے تو میں زندہ ہوں ابھی

مسلسل ٹہلتے اس کے پیرشیل ہو گئے، آنکھوں کی جلن جد سے سوانحی، پورے وجود میں بھانپ  
جل اٹھے تھے، یہ کیسا انکشاف ہوا تھا، حمدان کے باپ بننے کی خبر نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا، وہ قبول  
کرتی، کیسے کرتی، وہ اتنی اعلیٰ ظرف ہی کب تھی، تقدیر نے اپنی بساط پہ اسے ایسے بچھاڑا تھا کہ  
اٹھنے کے قابل نہ رہی، جیتی بازی ہار جانے کا دکھ ہی ختم نہ ہوا تھا کہ یہ نئی افتاد، اس کا بس نہ چلتا تھا  
پوری دنیا کو آگ لگا دے، کچھ تو اس کے دل کو بھی سکون ملے، کچھ لوگ ہوتے ہیں، خود اپنی جان  
کے دامن جن کی شریں فطرت شیطانی سوچ انہیں تک کر بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتی، جلتے پیر کی بلی  
کی مانند پھرتے وہ ہر کسی کی کن سونیاں لیتے رہتے ہیں، اپنے گناہوں میں اضافہ تو کرتے ہیں ہی  
وہ اس دنیا میں بھی اپنے لئے کچھ نہ کچھ عذاب خود ضرور مول لئے رکھتے ہیں، یہی حال شانزے کا  
تھا، حمدان کی شادی کے بعد سے تو اسے سچ معنوں میں ملتا بھال ہو گیا تھا گویا، چھپ کر باتیں سننے  
کی عادت تو پہلے بھی تھی مگر شادی کے بعد تو یہ اور چمک اٹھی تھی، قدر کے کمرے میں کون گیا کس  
نے کیا بات کی اس نے کس سے کیا کہا، اس کا رویہ سب سے کیسا تھا یہ سب خبریں شانزے کو اپنی  
اس عادت کی وجہ سے مل چکی تھیں، وہ تو اپنے تئیں بہت مطمئن تھی بہت سرشار بھی کہ زبردستی  
چڑھائی جانے والی یہ تیل بہر حال منڈھے چڑھے گی نہیں، مگر قدر کی خرابی طبیعت اور پھر اس کے  
بعد غائبہ و آیامان کی گفتگو نے اس کے اندر ہول اگا ڈالے، دل خاردار جھاڑیوں میں الجھا دیا، یہ کیا  
ہوا تھا، وہ جتنا فاصلے کم کرنے کی کوشش کرتی جدائیاں بڑھ رہی تھیں، فاصلے ختم نہ ہوتے تھے، اولاد  
کا ہونا مطلب ان کے رشتے کی مضبوطی، جو کسی طور بھی اسے گوارا نہ تھا۔

”میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی، یہ طے ہے۔“ ہتھیلی پہ ہاتھ کا مکا مارتی وہ طیش میں

ہو جاتی۔

”یہ بچہ دنیا میں نہیں آئے گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے، میں چاہے قدر کی جان کیوں نہ لوں،  
اسے زہر کیوں نہ دوں، مگر اب ہرگز نہیں چھوڑوں گی اسے؟“ اس کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا،  
وہ ایسی بلا سے مشابہ لگ رہی تھی جو اپنا شکار پھانسنے کو بے تاب ہو۔

☆☆☆

بے خواب لمحوں کا پرستار کون تھا  
اتنی اداس رات میں بیدار کون تھا  
کس کو یہ فکر ہے کہ محبت میں کیا ہوا  
ہم اس پہ لڑ رہے تھے کہ وفادار کون تھا  
سو کشتیاں جلا کے چلے ساحلوں سے ہم  
اب تم کو کیا بتائیں کہ اس پار کون تھا  
یہ فیصلہ تو شاید وقت بھی نہ کر سکے  
سچ کون بولتا تھا اداکار کون تھا

اونچے اونچے درختوں پہ گھنی تاریک رات چھا گئی تھی، ہر سوسناٹا تھا، ویسا ہی سناٹا جیسا اس  
کے اندر اتر آیا تھا، حالانکہ قدر کی کال موصول ہونے کے بعد اس کے اندر مری ہوئی امید نے جنم  
لیا تھا، پھر سے لیا تھا، خوش فہمیوں کا انت نہ رہا، اس پہ اگلے دن غائبہ کا خوشی سے نہال ہو کر فون  
کرنا۔

”آپ فوراً آ جاؤ یا رسن، میرے بیٹے..... جہاں بھی ہو بس آ جاؤ۔“ قدر کے باقاعدہ چیک  
اپ سے ملنے والی تصدیقی خبر نے ان کے پیر زمین پہ کہاں ٹکٹے دیئے تھے، وہ تو ہواؤں میں تیر  
رہی تھیں، فضاؤں میں پرواز کر رہی تھیں۔

”سب خیریت تو ہے والدہ، رات آپ کی بہو صاحبہ بلا رہی تھیں اب آپ میں تو چکر اگیا  
ہوں ایسا کون سا مجھڑ ہو گیا آخر۔“

اس کا موڈ خوشگوار بیت سمیٹ لایا تھا، غالب امکان یہی تھا آیا ماں کے سمجھانے بچھانے پہ  
قدر نے پسپائی اختیار کر لی ہے، سب کی خوشی کی وجہ یہی سمجھ سکتا تھا۔

”مجھڑ ہی سمجھو، اللہ نے بڑا کرم کیا، ہم گناہ گاروں پہ، اور کیا کہا، قدر نے فون کیا تمہیں، خود  
بایا؟ ماشاء اللہ، اللہ میرے گھر کو میرے بچوں کی خوشیوں کو یونہی شاد آباد رکھنا۔“

مزید جلدی آنے کی تاکید کے بعد انہوں نے بھی اصل بات کھولے بنیابی فون بند کر دیا،  
حمدان مسکرا دیا تھا، ڈیوٹی آف ہونے پہ وہ گاؤں جانے کو نکلا تو شام ڈھل رہی تھی، موسم آج سارا  
دن بہت شدید رہا تھا، مگر اس سے آکر خوش گوار انگڑائی سے تبدیل ہوا اور ٹھنڈی ہوا میں چلنے لگی  
تھیں، وہ گھر پہنچا تو حسب معمول رات اپنے سیاہ لباس میں کائنات کو ڈھانپ چکی تھی مگر اس  
کے گھر میں معمول کے خلاف چہل پہل تھی اور گویا یون چڑھا ہوا تھا۔



سارے رستے غانیہ سمیت دونوں بہنیں بھی بار بار فون کر کے کتنی دیر تک پہنچنے کا بے تابانہ سوال کرتی رہی تھیں، اس کے گھٹنے آدھے گھٹنے کے جواب میں ناراضگی سے آدھی رات ہو جانے کا کہہ کر شکوہ کیا جاتا کہ وہ جلدی نکل آتا کیا تھا، حمدان گھر پہنچا تو سب کو جاگتے انتظار کرتے پا کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

”کمال ہے بھئی.....“ وہ جیسے تو ہر کوئی آدھی رات ہو جانے کا اعلان کرتا نظر آ رہا تھا مگر سو یا ہوا کوئی بھی نہیں۔“ اس کا انداز شریعت تھا، جس کے جواب میں سب سے پہلے غانیہ نے اسے پکڑ کر سینے سے لگایا یا تھا چوہا، حجاب نے آؤ تاؤ دیکھے بغیر اسے سینھلنے کا موقع دیئے بغیر اس کے منہ میں پورا گلاب جاسن ٹھونس دیا تھا۔

”میرے چاند میرے شیر، مبارک ہو، اللہ تمہیں ہمیشہ دائمی خوشیوں سے نوازے، مبارک ہو میری جان کہ تم باپ بننے والے ہو اور میں دادی۔“ غانیہ کی آواز خوشی سے فخر سے انبساط سے لرز رہی تھی، حمدان ایک دم ساکن ہو گیا، غیر یقینی سے حیرت سے اور کسی حد تک جھینپ کر انہیں پھر بہنوں اور باپ کو دیکھنے لگا، جو وہ ہیں تھے اور مسکرا رہے تھے۔

”ہم چاہتے تو اس گڈ نیوز کو تمہیں فون پہ بھی سنا سکتے تھے، مگر ہم اس خوشی کو تمہارے ساتھ مل کر ایسے ہی سلیمرٹ کرنا چاہتے تھے۔“

نیب چوہدری خود اٹھ کر اس کے گلے لگے تھے، وہ کچھ اور جھینپ گیا، چہرہ اتنا سا گیا، کچھ فاصلے پہ موجود شانزے کے سینے پہ سانپ لوٹے اور اپنے کمرے کی کھڑکی سے شوہر کی آواز سن کر آنے والی قدر کی آنکھیں اپنی بے بسی پہ بھیک گئیں۔

”آپ سچ کہہ رہی ہیں ماما..... واقعی..... واقعی قدر ایکسپٹ کر رہی ہے، آئی مین، آپ نے کسی لیڈی ڈاکٹر سے چیک اپ وغیرہ کروایا؟“ وہ حجاب اور حرم سے مبارک باد وصول کر کے ان سے مٹھائی کھا کے جب غانیہ کے پاس آ کر بیٹھا تو عجیب سی بے یقینی کے ساتھ بولا تھا، غانیہ سرشار سی ہنسی ہنس پڑیں۔

”ہاں میرے چاند! سب کچھ کنفرم کرانے کے بعد ہی اس خبر کو تم تک پہنچایا ہے۔“

”بھائی..... بھابھی کو لے آئیں نا یہاں، وہ تو بہت گھبرائی ہوئی لگتی ہیں، کسی سے بات ہی نہیں کرتیں۔“ حجاب کے کہنے پہ حمدان محض مسکرایا تھا۔

(سب گھبراہٹیں ختم ہو جائیں گی اب..... بس تم دیکھتی جاؤ، کتنا بھاگی تھیں تم مجھ سے قدر..... مگر اس معصوم جان کی آمد کی خبر پا کر لگا ہے مجھے خدا بھی یہی چاہتا ہے کہ تم میری صرف میری بن کر رہو۔)

”ہاں ہاں..... قدر کو بلاؤ یہاں، آخر اس کا بھی تو پتا چلے وہ کتنی خوش ہے اپنے یار من صاحب کا کیا ہے، انہوں نے تو خوش ہونا ہی ہونا تھا۔“ شانزے موجود ہو اور شر نہ پھیلانے، آگ نہ لگائے یہ ممکن ہی نہ تھا، وہ سب نہ صرف چپ سے ہوئے بلکہ ایک دوسرے کی شکلیں بھی دیکھنے لگے، آیا ماں نے چونک کر پہلی بار قدرے دھیان سے اس لڑکی کی شکل دیکھی جس کے لہجے سے بغض اور چہرے سے عناد چھوٹا محسوس ہوتا تھا۔

”بچی کی طبیعت اچھی نہیں ہے، آپ لوگوں نے جو بھی خوشی منانی ہو کل منالیزا، تب تک قدر کی طبیعت بھی بحال ہو جائے گی، کیا پتا اب سو ہی گئی ہو۔“ آیا ماں نے تدبیر سے کہتے ہوئے شانزے کے اٹھائے فتنے کو دبایا، جس کی غانیہ نے بھی تائید کر دی۔

”آیا ماں بالکل صحیح کہہ رہی ہیں، رات ویسے بھی بہت ہو گئی ہے اب بہتر ہے کہ تم لوگ بھی آرام کرو، حمدان آؤ بیٹے آپ کھانا کھا لو، تھکے ہوئے آئے ہو سفر سے تمہیں بھی ریلیکس کرنا چاہیے۔“

حمدان کچھ نہ بولا، ان کے ساتھ ہولیا، آیا ماں کو حرم ان کے لئے تیار کیے کمرے میں چھوڑنے جا رہی تھی۔

”آپ کی بہو صاحبہ کا کیا ٹھیک نہیں ہے، موڈ یا طبیعت؟“ کچن میں کرسی کھینچ کر بیٹھتا وہ شرارت بھرے انداز میں سوال کر گیا تو غانیہ نے جواباً اسے سنجیدگی سے دیکھا تھا۔

”دونوں ٹھیک ہیں الحمد للہ! بس تم اسے خواہ مخواہ تنگ نہ کرنا، ورنہ چڑ کر ضرور طبیعت خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔“ اس جواب پہ حمدان کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

”یعنی محترمہ کو آپ بھی جاننے لگی ہیں کچھ کچھ، اور یہ نہ چھیڑنے والی بات بھی خوب کہی آپ نے، اگر اسے نہ چھیڑوں تو جیسے میرا تو کھانا ہضم نہیں ہوتا۔“ وہ منہ بسور کر کہہ رہا تھا، غانیہ نے اب کے محض اسے مصنوعی ناراضگی سے گھورا، وہ مسکراتا ہوا کھانے کی سمت متوجہ ہو گیا۔

”ویسے یہ زیادتی نہیں، آج کے دن ہی کم از کم ہمیں ایک ساتھ کھانا کھانا چاہیے تھا۔“ وہ مصنوعی آہ بھر کے بولا تو غانیہ کے جیسے دل پہ ہاتھ پڑا۔

”اللہ جوڑی سلامت رکھے ہمیشہ، سدا اک دو بے کے ساتھ کھاؤ پیو رہو، اگر دل چاہ رہا ہے تو ٹرے اندر لے جاؤ بیٹے۔“

حمدان نے سر جھٹک دیا۔

”تمہیں رہنے دیں، خود ہی کہہ رہی ہیں وہ سو گئی ہوگی۔“ اس بات کے جواب میں غانیہ مصلحتاً خاموش رہیں، کھانے کے بعد وہ ان سے چائے کاگ لیتا حسب عادت ان کے ہاتھ پہ پیار کرنا اپنے کمرے کی میز ہیوں کی جانب آیا جہاں شانزے اس کا راستہ ایک طرح سے روکے کھڑی تھی۔

”کیا تم واقعی مبارک باد کے حق ہو، یہ خوشی ہر کسی کو تھوڑا نصیب ہوتی ہے۔“ اس کا لہجہ روکھا انداز طنز یہ تھا، حمدان نے اس کے منہ نہ لگنا ہی مناسب سمجھا۔

”میں تمہیں مبارک باد ضرور دوں گی مگر تب جب اگر تم واقعی باپ بن گئے، ابھی تو آغاز سفر ہے، آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا، حالات بتاتے ہیں تمہاری تک چڑھی مفروضہ بیوی یہ کام پایا تکمیل تک نہیں پہنچائے گی۔“

”شٹ اپ۔“ آخری بات آگ لگانے والی تھی، وہ جھلس ہی گیا تھا۔

”مجھ پہ چیخنے کی بجائے بہتر ہے جا کر تم اپنی عجوبوں والی دلہن سے اس کی رائے جان لو، چیخ سبھ لو میرا کہ تمہارا بچہ اس دنیا میں نہیں آئے گا، کم از کم اس لڑکی سے تم یہ خوشی نہیں پاسکتے۔“ وہ ہنوز پھنکار رہی تھی، حمدان کا چہرہ شدت جذب سے بے تحاشا سرخ پڑ گیا۔



”اپنی منہوس شکل اور باتوں سمیت یہاں سے دفع ہو جاؤ، اس سے زیادہ میں تمہیں برداشت نہیں کر سکوں گا۔“ اب کے وہ بولا تو اس کی آواز بھلے دہی ہوئی تھی، مگر قہر و غضب سے بھری ہوئی تھی، شانزے اٹھلا کر لہر کر سائیڈ پہ ہو گئی، ویسے بھی اس کا کام ہو چکا تھا، جو آگ دہکانا بھی دہکا دی تھی، جس بدگمانی کا بیج بونا تھا بویا تھا، اب چاہے بھلے وہ خود کچھ بھی کرتی، الزام اس کے سر آنے والا نہیں تھا، کمرے میں آنے سے قبل حمدان کو خود کوریلیکس کرنے کی خاطر چھت پہ نہلنا اور سگریٹ پینا پڑا، تب کہیں جا کر دماغ کا کچھ تناؤ کم ہوا تھا تو جوش و جذبہ بھی ویسا نہ رہا جیسا غائبہ سے اس خبر کو سننے کے بعد اندر سے اٹھا تھا، وہ اندر آیا تو مزاج میں ٹھہراؤ اور عمل تھا، لائٹ آن تھی اور قدر بیٹھ پہ گھنٹوں میں سردیئے بیٹھی نظر آئی، ٹیوب لائٹس کی روشنیوں میں اس کے گھنیرے سیاہ ریشمی بال بکھرے ہوئے مگر حسین نظر آرہے تھے، اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے وہ آہستگی سے کھنکرا، مقصد اس کی توجہ حاصل کرنا تھا، جو پورا نہیں ہوا تو اسے باقاعدہ مخاطب کرنا پڑا۔

”قدر!..... تم جاگ رہی ہو.....؟ میرا مطلب ہے طبیعت ٹھیک ہے نا تمہاری؟“ وہ بے حد پر اعتماد تھا مگر اس وقت جانے کیوں کنفیوژڈ نظر آنے لگا، قدر کے ساکن وجود میں تحریک پیدا ہوئی، سراٹھا کر اس نے ساٹ گرہورنگ آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

”ہاں..... جاگ رہی ہوں، کیونکہ میری نیندیں غارت ہو گئی ہیں، طبیعت ٹھیک نہیں ٹھیک سمجھے اور ایسا صرف تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔“ اس کے نقوش تنے ہوئے اور آواز میں غضب کی سرد مہری تھی۔

”قدر!.....! حمدان اس کے موڈ سے خائف ہوتا تیزی سے قریب آیا تو وہ وحشت میں مبتلا ہوتی بے ساختہ پیچھے سرکی۔

”یاد کرو، یاد کرو میں نے منع کیا تھا تمہیں، مگر تم..... تم باز نہیں آئے۔“ اس کے آنسو پٹپٹ بر سے، حمدان بے چین ہو کر رہ گیا۔

”میں کسی طور پہ نہیں ہونے دوں گی سن لو تم۔“ حمدان نے اسے شانوں سے تھا منا چاہا جواب میں وہ اس کے گلے پڑی اس کا گریبان پکڑ کر جھجھوتے ہوئے چینی، حمدان کے اعصاب کو دھچکا لگا، شانزے یہ بات پہلے نہ کہہ چکی ہوئی تو شاید اسے اب سننا اتنا برا نہ لگتا، اس کے ماتھے پہ بل پڑنے میں لمحہ نہیں لگا۔

”کیا کرو گی تم؟ اب کر ہی کیا سکتی ہو تم۔“ اسے بے تحاشا بے حساب غصہ آیا، قدر اس کی جواب میں خفت یا شرمندگی دیکھنے کی قیامت تھی، یہ رویہ اسے پھرانے کا باعث ہی بن سکتا تھا۔

”تمہاری خوشیاں غارت کر دوں گی، جو تم ابھی منار ہے تھے، اب ارٹن کر دوں گی۔“ وہ بلا دریغ چلائی تو حمدان کے چہرے پہ عجیب سا تناؤ آ گیا تھا، چہرہ اٹھتا اور بھی پرکشش لگنے لگا۔

”تمہیں کوئی خوف خدا بھی ہے کہ نہیں؟ اتنی ناشکری عورت میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔“ قدر کو اس کے الفاظ نے گہری اذیت پہنچائی، شدید ہجیان اس کے ہر انداز سے چھٹک پڑا۔

”میں نے بھی اپنی زندگی میں تم سے بڑھ کر وحشی اور بدتمیز انسان نہیں دیکھا، کیا سمجھتے ہو تم

نود کو آخر، ہو کیا تم کہ مجھے یہ بات سننے کو ملتی اور میں خوشی سے چھوٹنے لگتی؟ پاگل ہو تم یا مجھے سمجھ رکھا ہے؟“ اسے دھکا دیتے ہوئے وہ غصے میں بالکل آؤٹ ہو گئی، حمدان نے جواب میں اسے متاسفانہ نظروں سے دیکھا تھا۔

”قدر بیگم! شادی کے بعد عورت اپنے اعلیٰ حسب نسب اور شان و شوکت سے نہیں اپنی دفا داری شوہر پرستی سے پہچانی اور جاچی جاتی ہے، بہر حال اپنی یہ سابقہ اکڑ یہ طظنہ اور غرور بہتر ہے خود چھوڑ دو، اب تم میری بیوی ہو۔“ اس نے لفظ بیوی پہ زور دیا اور انگوٹھے سے اپنے چوڑے مضبوط سینے کی جانب اشارہ کیا۔

”اور میں خواہ مخواہ تمہیں سر چڑھانے کا ارادہ ہرگز نہیں رکھتا، مجھے اچھی طرح علم ہے کہ مجھے تمہیں کہاں رکھنا ہے اور کس چیز کی تمہیں اجازت دینی ہے وغیرہ وغیرہ۔“ اس کا لہجہ دو ٹوک واضح اور چبھتا ہوا تھا، قدر کو تو کچھ زیادہ ہی چبھا، جیسی جتانے سے باز نہیں آئی۔

”اور میں تمہیں بتاؤں کہ تم اپنی اوقات بھول گئے ہو اور کچھ بھی نہیں ہے، زبردستی مجھے اپنی زندگی میں شامل کر کے تم کیا سمجھتے ہو مجھے بے بس بھی کر لیا اور اپنے اختیار میں بھی، حمدان منصف، یاد رکھنا کہ تو میں تمہارے اختیار کے دائرے میں ہوں نہ تم مجھے بے بس کر سکو گے۔“ انگلی تنبیہ کے انداز میں اٹھا کر جتلاتی وہ اپنے آخری لفظوں سے حمدان کی نظروں کا رخ اور موڈ دونوں بدل گئی۔

”بے بس تو میں تمہیں کر چکا ہوں مسز منصف حمدان، یہ ساری اس وقت کی چیخ اسی بے بسی کا ہی تو شاخسانہ ہے۔“ وہ گویا اسے چڑا رہا تھا، جتلا رہا تھا، ستارہا تھا، قدر کا چہرہ خفت سے سکی سے ذلت سے سرخ پڑا، آنکھوں میں اس کی کمینگی کے اس مظاہرے نے آنسو بھر دیئے، اب کی بار وہ لڑنے کے مقابلہ کرنے کے بھی قابل نہ رہی گویا، گلے میں تیزی سے پھسنے والے آنسوؤں کے گولے نے کچھ کہنے کی اجازت نہ دی تو منہ پہ ہاتھ رکھے بھاگتی ہوئی واش روم میں بند ہو گئی، روتی رہی، از سرے نو خود سے عہد باندھتی رہی کہ وہ حمدان منصف کا یہ غرور ضرور توڑے گی، اس کی اس خوشی کو غارت ضرور کرے گی۔

(جاری ہے)

”اعتزاز“

نایاب جیلانی کا سلسلے وار ناول ”پریت کے اس پار کہیں“ تاخیر سے موصول ہونے کی بناء پر اس ماہ شائع نہیں ہو سکا، معذرت خواہ ہیں۔



# وکی ویسٹ

سیمانت عاصم



میں نے اس سے پہلے ہی آواز شیری کی کوئی نہیں سنی تھی۔  
"شیری" شیری۔ اگلے ہی پل بوتل

کے ان کی طرح شیری نازل ہوا تو اس کی نظروں میں شرارت کی جگہ گاہت کا اجیرن بندھا ہوا تھا۔  
"میں ہم" وہ نیاز مندانہ انداز میں جھکا

تھا۔  
"آپ کی بیٹی ریڈی ہے، ناشتہ آپ کے

تیار ہونے سے پہلے تیل پر ہوگا، انچوٹیں ان  
کھانوں نے مجھے جگ سے کھنچ کر بنایا ہوا ہے،  
ماہر کی کھٹی، نوشر کی کھٹی، کیبل کی کھٹی، اف خدایا!

اگر انسان کی زندگی سے یہ گھنٹیاں نکال دی  
جائیں تو زندگی کتنی پرسکون ہو جائے گی نا۔" اس  
کا انداز ہنوز سخرانہ تھا۔

"شیری پلیز، کم از کم اس وقت میں کسی  
پرچیت لگائی۔"

مکمل ناول

مکمل ناول

مکمل ناول

مکمل ناول

مکمل ناول

مکمل ناول

مکمل ناول

مکمل ناول

مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں میری گاڑی خراب  
ہے یار، اف خدایا رکشہ میں آفس جانے کے  
خیال سے ابھی سے میرے دماغ میں "تاقتیا"  
شروع ہو گئی ہے۔"

"اگر آپ مجھے بائیک الاؤ کر دیں تو آپ  
کے ساتھ مجھے بھی ٹرانسپورٹ کے دھکوں سے  
نجات مل سکتی ہے، پلیز تھنک اوور اٹ۔"

"نو مجھے ساری زندگی رکشہ میں آفس آنا  
جانا پڑے تب بھی میں تمہیں بائیک الاؤ نہیں  
کروں گی شیری۔" سارہ کی بات درمیان میں

تھی، کہ صدر دروازے پر کار کا ہارن سنائی دیا،  
پھر کال بیل بجی۔  
"لیجئے اک اور گھنٹی، وہ بھی کار کے ہارن

کے ساتھ۔"

"اوہ مائی گاڈ۔" سارہ نے اپنے ہی ماتھے

پر چپت لگائی۔

مکمل ناول

مکمل ناول

مکمل ناول

مکمل ناول

مکمل ناول

مکمل ناول

مکمل ناول

مکمل ناول





”میں تو بھول ہی گئی، یہ تیسرے صاحب ہوں گے، پتا ہے کل آف کے وقت اک ٹریفک پرائیلم میں تیسرے صاحب نے ہی مجھے گھرنیک ڈراپ کیا تھا، ان کا گھر بھی یہیں کہیں اریب قریب ہے اور آفس میرے آفس سے نزدیک، تم پلیز انہیں پانچ منٹ دیت کا کہو، میں بس ابھی ریڈی ہو کر آئی، میں نے کار کی خرابی کا بتایا تھا، شاید اسی لئے وہ پک کرنے کے لئے بھی آگئے ہیں۔“ وہ غلت میں سیلپیر پیروں میں ڈالتی ہاتھ روم میں گھس گئی اور پانچ منٹ بعد پانچ بج بیگ سنبھالتی تیزی سے صدر دروازے سے باہر آئی نظر آئی، تو اپنی ریڈ کرولا میں منتظر تیسرے جہانزیب کے لبوں پہ اک جاندار مسکراہٹ ابھر آئی تھی، سارہ فاروقی کے چہرے پہ گزری عمر کی چھاپ تھی، سیاہ و سرخ اسٹائلش لباس میں، اس کا انداز رواں اور لا پروا سا تھا، اس کا ملکوتی حسن کھلا پڑ رہا تھا، صرف کچھ گھنٹے قبل کی تو شناسائی تھی اور وہ کل شام سے اب تک اس کے تصور کو بھی نہ جھٹک سکے تھے، سارہ فاروقی کی شخصیت میں، کشش و جاذبیت ہی اتنی تھی، اک بار اسے دیکھ کر کوئی فراموش نہ کر پاتا اور یہ تیسرے تھے، جنہیں پہلی ہی ملاقات میں لگا کہ اب تک وہ ایسی ہی کسی طلسماتی دل کو چھو جانے والی شخصیت کی تلاش میں تھے، سارہ کو پا کر جیسے ان کی کھوج کو اک سرامل گیا تھا، انہوں نے دھیرے سے فرنٹ ڈور داکیا، تو سارہ نے فرنٹ سیٹ سنبھالی اور تیسرے کے آس پاس اک شناسائی مہک پھیلتی چلی گئی تھی۔

”تھینک یو، اگر آپ مجھے یک اینڈ ڈراپ نہ کریں تو پبلک ٹرانسپورٹ کے دھکے کھا کھا کے میرا تو بھیجا ہی جواب دے گیا تھا، ایک ویک ہو گیا میری گاڑی خراب ہے۔“

”مجھے آپ کو پک اینڈ ڈراپ کرنے میں

کوئی تکلیف نہیں، مگر آپ پک اینڈ ڈراپ سروس بھی تو ہائیر کر سکتی ہیں۔“

”پک اینڈ ڈراپ، اوہ نو، آپ کو پتا ہے میری اک فرینڈ پک اینڈ ڈراپ سروس سے آف کے پورے دو گھنٹے بعد گھر پہنچتی ہے، پورے شہر کی سیر کرنے کے بعد، اوہ مانی گاڑ۔“

”ہم پھر تو آپ کے لئے ایک کار ارنیج کرنی پڑی گی، جب تک آپ کی اپنی کار ٹھیک ہو کر نہیں آ جاتی۔“ انہوں نے شکر اکر لطیف سا لہجہ اپنایا۔

”آپ میرے لئے کار بہت خوشی سے ارنیج کریں مگر پھر آپ کو ایک ڈرائیور بھی ارنیج کرنا ہوگا، کیونکہ میں تو کبھی اپنی کار ڈرائیو نہیں کر سکتی ہوں مجھے کار نوٹیا ہے۔“ جواباً ان کا تہقہہ خاصا جاندار تھا۔

”ہوتا ہے، انسان بہت سے معاملات میں Usattoo ہوتا ہے۔“

”جی بالکل اک بچہ بھی، اپنی من پسند چیز کا عادی ہو سکتا ہے، پتا ہے اک بار شیریں کی فیڈر کہیں رہ گئی، ساری رات اسے بہلانے کے باوجود بھی شیریں نے کسی اور فیڈر کو منہ نہیں لگایا، اگلے روز، وہی فیڈر مجھے لا کر اسے دینی پڑی۔“

”شیریں یقیناً یہی لڑکا ہے، معصوم صورت، پنڈسم، جو ابھی دروازے تک آپ کو بائے بائے کہنے آیا تھا۔“

”جی بالکل، شیریں اب بیس سال کا ہے، این ای ڈی کا اسٹوڈنٹ۔“

”تو کیا آپ کی امی اسے کیئر نہیں کرتی تھیں۔“ انہوں نے موڑ کاٹتے ہوئے اک نظر اس پر ڈالی تھی اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”شیریں ایک سال کا تھا، جب ان کی ڈیڑھ ہو گئی، مجھے آفس جانا ہوتا، تو اس کی کیئر ٹیکنگ

کے لئے اک میڈ ضرور رکھی تھی، مگر اسے پالا میں لے لی ہے۔“

”ویل ڈن پھر تو وہ آپ ہی سے زیادہ کلوز ہوگا۔“

”بالکل بالکل اور میرے لئے بے حد مخلص ہے، اگر میں اسے بائیک الاؤ کر دوں تو پانچ منٹ کے لئے اس کا وقت ضائع نہ ہو اور میرے لئے بھی کچھ تو آسانی ہو ہی جائے، مگر

”تو بس پھر سمجھ لیجئے، آپ کو پک اینڈ ڈراپ سروس ڈرائیور کے ساتھ فری مل لگتی ہے، اب تک آپ کی کار ٹھیک نہیں ہو جاتی۔“

”اوہ نو، آپ کو پرائیلم ہو سکتی ہے مجھے تو ہر روز آفس جانا ہوتا ہے۔“

”پرائیلم کیسی، مجھے تو خوشی ہے، اک بلاک میں رہتے ہوئے اس سے پہلے بھی ہماری ملاقات ہوئی نہ ہو سکی، میرا اپنا سفر بہت اچھا

”تھینک یو۔۔۔۔۔ تھینک یو۔۔۔۔۔ ویری جج۔“

”نو سوری، تھینکس اینڈ پلیز ان گڈ

”پہر آفس آ گیا ہے اور شاید اگلے موڑ پر آپ کا آفس ہے۔“

”شام کو میں یہیں سے آپ کو پک کر لوں گا۔“ تیسرے مسکرائے تھے۔

”اوہ رینلی، تھینک یو ویری جج۔“ وہ کہتی ہوئی اتر گئی۔

☆☆☆

اس روز سارہ کو باس نے طلب کیا، سارہ ان کے روم کا دروازہ ٹاک کر کے اندر آئی، ان کے سامنے سیٹ سنبھالی، تو وہ بنا کچھ کہے، مک

تک اسے دیکھے چلے گئے تھے، وہ کچھ کنفیوزی ہو کر رہ گئی، ان کی نظریں عجیب سی تھیں۔

”آپ نے بلایا تھا سر۔“ اسے یاد دلانا پڑا، مگر انہوں نے جیسے سنائی نہیں۔

”آپ کو کسی نے بتایا کہ آپ ایک حسین ترین عورت ہیں۔“ ان کا جملہ غیر متوقع تھا، سارہ دانت کچکا کچکا کے رہ گئیں، اک پل کودل چاہا، ادھیڑ عمر کی سنبھے باس کی چٹیا ہی بجادے اور پچھلے کئی روز سے ان کے تیور اور نظریں اسے یوں نیکی تاؤ دلا رہے تھے، مگر وہی سارہ فاروقی کا ازلی اعتماد، جو سامنے والے کو چت کر دیا کرتا تھا۔

”یہ تو سب ہی کہتے ہیں، اس میں نیا کیا ہے۔“ اس نے بے نیازی اپنائی تھی۔

”اچھا، سب ہی کہتے ہیں، یعنی میرے کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ ان کی نظروں میں وہی ذومعنی انداز اُبلد آیا۔

”ہاں۔“ باس نے تو اب تک واقعی نہیں کہا تھا۔

”باس بھی انسان ہوتا ہے، اس کے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہے۔“ ٹیمبل پر کہنیاں رکھ کر وہ کچھ آگے کو جھک آئے تھے۔

”اور آپ کو پتا ہے سارہ، کبھی کبھی یہ دل کسی کے لئے دھڑکنے لگتا ہے۔“ ان کے انداز میں اتنا سستا پن تھا، کہ سارہ کو خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔

”کام کی بات کریں؟“ اس کا لہجہ خشک تھا، نظروں کے تیور تھکے پڑ گئے۔

”یہ ہی آج کی کام کی بات ہے اور مجھے اس کا جواب چاہیے۔“

”آفس میں صرف آفیشل بات ہی سوٹ کرتی ہے۔“

”تو حلے پھر رسل، کر لڑا، ڈن، کر



لیتے ہیں۔“ ان کی وہی ڈھٹائی۔

”اٹھارہ سال ہو گئے ہمیں ایک ساتھ کام کرتے ہوئے اور اتنے عرصے بعد اگر آپ کا دل اپنی رفتار بھول رہا ہے تو اس کی کوئی وجہ ضرور ہو گی۔“ اس نے ان کی طبیعت صاف کرنے کی ٹھان لی۔

”وجہ آپ جانتی ہیں سارہ، میری مسز کی ڈیڑھ ہو چکی ہے اور آپ بھی تنہا ہیں، اگر میں اپنے اور آپ کے اکیلے پن کو کوئی نام دیتا چاہوں تو میرا خیال ہے ہم دونوں اک دوسرے کے مسائل اچھی طرح solve کر سکتے ہیں۔“

”میری لائف میں کوئی مسئلہ نہیں ہے اور اگر ہے تو آئی کین ہینڈل اٹ، آپ اپنے مسائل کی فکر رکھیے، اپنا خیال رکھیے، میں اپنا خیال رکھ سکتی ہوں۔“

”مگر مجھے لگتا ہے آپ کو اب بھی کسی کی ضرورت ہے مس سارہ۔“

”میں نے اپنی زندگی شیری کے نام کر رکھی ہے اور یہ آپ جانتے ہیں، یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔“

”فیصلے بدلے تھی تو جاسکتے ہیں، میری بیوی کے مرنے کے بعد میں تو سوچنے لگا ہوں۔“

”اس اتباع میں، بیوی کے مرنے اور جوان بچوں کے ہوتے آپ کو شادی کا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔“

”اس سب سے بڑھ کر اک چیز اسٹیشن بھی ہوتی ہے، مرد کا اسٹیشن اپورٹس رکھتا ہے، آج کل لوگ اوور رائج بوڑھے کو بھی نو جوان لڑکی کا ہاتھ تھما دیتے ہیں۔“

”اگر آپ کسی کی مجبوری کو کیش کر کے اسے اپنا بھی لیں تو پھر اس سے بڑھ کر میں آپ کی

میں کہتی اٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

اور نہ جانے کیسا سحر تھا، سارہ فاروقی کی دلکش اور چھا جانے والی شخصیت میں کہ تیور کو اپنا آپ خود اپنے ہی ہاتھوں سے لکھتا محسوس ہونے لگا تھا۔

انہیں لگتا، انہوں نے سارہ فاروقی جیسی دلکش اور مکمل لڑکی کی تلاش میں ہی اپنی آدھی عمر گنوائی ہے، ابھی دن ہی کتنے گزرے تھے، اس سے پہلی ملاقات کو، مگر لگتا، جیسے اندر کا، عرصہ سے خالی، کوئی گوشہ، یکدم جگ اٹھا تھا، وہ بار بار اس کے تصور کو جھٹکتے اور سارہ فاروقی، اسی جج جج سے ان کے خیال کو آباد کرنے چلی آتی۔

اچلی بار انہوں نے اسے اک شاننگ سینئر میں چالیا تھا، وہ ڈیڑھ ساری شرٹس کے سلیکشن میں الجھتی اپنی اسی جاذبیت سمیت دل میں اتڑی جا رہی تھی۔

”ارے۔“ انہیں لگا، اس کے آس پاس ڈیڑھوں ڈیڑھ تھکے جل اٹھے۔

”یہ شرٹ یقیناً آپ نے شیری کے لئے سلیکٹ کی ہو گی؟ لیکن یہ پنک لائننگ والی شرٹ بھی اسے سوٹ کرے گی۔“

”واقعی مگر وہ زیادہ لائٹ کلرز Acoide کرتا ہے، ایچو نیلی وہ اپنے سلیکشن کے لئے کانٹش رہتا ہے۔“

”اور آپ شیری کے لئے..... ہے نا؟“

”ہم دونوں کا اک دوسرے کے سوا اور ہے ہی کون؟“

”پھر تو آپ کو اپنے درمیان کسی تیسرے کی جگہ ضرور بنانی چاہیے۔“

”اوہ، مجھے تو اس کی ضرورت کبھی نہیں

”مے لی، کسی اور کو آپ کی ضرورت ہو۔“

میری نگاہوں سے اسے دیکھتے اک بے خودی کے عالم میں، بے ساختہ وہ کہہ گئے، تو سارہ لمحہ بھر کی خاموشی میں، بھر پور سلیکشن میں کی دخل اندازی پر اس کا وہاں اٹ گیا، اپنی منتخب کردہ، شرٹ اس کے حوالے کر کے وہ ان کی طرف مڑ گئی تھی۔

”میں شیری نہ سہی اب آپ سلیکٹ کرنے کے لئے تو ایک کلر لے ہی سکتی ہیں، آپ کا سلیکشن تو زبردست ہے۔“ انہوں نے کہتے ہوئے لیڈیز کپڑوں کی درائی سے اک فینسی پنک ڈریس سلیکٹ کر کے اس کے سامنے لہرایا۔

”یہ میرا نیوٹرل کلر ہے، آپ پر بہت سوٹ کرے گا۔“

اور جب وہ کاؤنٹر پر شرٹ کے ساتھ اس سوٹ کی نمائندگی کرنے لگی تو انہوں نے سارہ کا ہاتھ ہاتھ روک کر، مطلوبہ رقم بے کردی، وہ نہ نہ ہی کر رہی تھی۔

”پلیز میری خوشی کی خاطر۔“

”اوہ نو، دس ازناٹ فیر۔“

”اس او کے۔“

”اب چلیں۔“

”آپ کو کچھ خریدنا نہیں ہے؟“ سارہ نے یاد دلایا۔

”مجھے جو خریدنا تھا، وہ خرید لیا ہے، مجھے تو سمجھیں کہ آپ کی مہک یہاں تک کھینچ لائی تھی۔“

”تیور صاحب!“ وہ بے یقینی سے ہنس پڑی تھی۔

”کیا آپ میری جاسوسی کرنے لگے ہیں۔“

”ہاں، کیونکہ مجھے آپ کا ساتھ اچھا لگنے لگا ہے۔“

”راختہ وہ کہہ گئے۔“

”اس کریم کھانے چلیں؟“

”جناب اب ہم بڑے ہو گئے ہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی بڑے۔“ سارہ نے چڑایا تھا۔

”ہاں، مگر ہر انسان کے اندر اک بچہ ہوتا ہے اور اس بچے کو کبھی بڑا نہیں ہونا چاہیے۔“

”یو آر رائٹ مگر ہر انسان کے اندر اک دہشت گرد بھی ہوتا ہے۔“

”تو چلیے پھر مجھے گن پوائنٹ پر آئیں کریم.....“ وہ دھیرے سے ہنس کر ان کی مصیبت میں ریڈ کر دلا تک آگئی اور کروڑوں اسٹونپ کی جانب مڑ گئی۔

☆☆☆

تیور کے لئے دروازہ شیری نے کھولا تھا، انھوں نے مصافحہ کیا۔

”جی مجھے سارہ سے ملنا ہے؟“

”تیور صاحب!“ اس کے چہرے پر ہزاروں تھکے جلے بچنے لگے۔

”پلیز آئیے نا، ایچو نیلی انہیں Suddenly مارکیٹ جانا پڑ گیا But now on the way of home کچھ دیر میں آتی ہوں گی۔“

”اس او کے، میں ویٹ کر لیتا ہوں۔“ وہ اندر آ کر لاؤنج میں ایزی ہو کر بیٹھ گئے۔

”شیور، آپ یہ بتائیں کہ آپ کیا لیں گے؟“

”سارہ آجائے تو سوچتے ہیں۔“

”اوہ نو، انہیں یہ اچھا نہیں لگے گا، آپ پہلی بار آئے ہیں ایچو نیلی وہ کب سے گئی ہیں نا، تو واپسی کے لئے کچھ نام تو لگے گا؟“

”اس او کے، اگر تمہارے پاس بایک ہوتا تو ایسے وقت میں آسانی رہے۔“

”ایچو نیلی میری ماٹ مٹی الاؤ نہیں کرتی،



بانیک، جب تک میں اسٹبلش نہیں ہو جاتا مجھے اپنے اخراجات کنٹرول رکھتے ہیں، مام کہتی ہیں، اگر انکم لاکھوں میں ہو تب بھی بجٹ ڈیولپ کرنا چاہیے، اگر مجھے اپنی پاکٹ منی سے روز دو سو روپے خرچ کرنے ہیں تو بس، اس سے زیادہ نہیں۔“

”یہ تو ٹھیک ہی ہے، انسان پہ ایک وقت ہوتا ہے، جب دوسرے اس کے لئے سروائیو کرتے ہیں اور ایک وقت ایسا بھی ہوتا ہے، جب اسے دوسروں کے لئے سروائیو کرنی پڑتی ہے۔“

”میں کچھ سالوں میں اسٹبلش ہو جاؤں گا، تو ہی خود کے لئے کچھ سوچ سکوں گا۔“

”گڈ، انسان اسٹبلش ہو کر ہی اپنی زندگی جیتا ہے۔“

”بس اور پھر مام میرے لئے بچی بھی تو رہتی ہیں نا، بانیک انہیں پسند نہیں ہے۔“

”تمہارے لئے تو وہ ٹھیک ہی بچی رہتی ہیں ابھی تمہاری عمر بانیک والی نہیں ہے۔“

”ویسے تمہاری مام ہیں کہاں؟“

”وہ مارکیٹ گئی، شاید میں نے آپ کو بتایا تھا۔“

”کیا سارہ کے ساتھ؟“ انہوں نے خاصی بے نیازی سے دریافت کیا تھا اور شیر کی جواب پہ تیمور پر بچی گر پڑی تھی۔

”اوہ نو، کیا مام نے آپ کو نہیں بتایا؟ سارہ ہی تو میری مام ہیں۔“ تیمور کی نظروں کے سامنے زمین و آسمان گول گول گھومنے لگے، وہ دلکش و کامنی سی لڑکی، جو کچھ ہی دنوں میں انہیں اپنی دھڑکن کے ساتھ دھڑکنے محسوس ہونے لگی تھی اور وہ اتنی نازک سی تھی کہ کبھی اک پل کو بھی انہیں یہ گمان چھو کر نہ گزرا تھا کہ وہ شیر کی جیسے کسی لڑکے

کی ماں بھی ہو سکتی ہے، شیر کی اپنی دھن میں کہتا رہا۔

”لگتا ہے کوئی مس انڈر اسٹینڈنگ ہوئی ہے، لیکن آپ کا بھی قصور نہیں، میری مام اتنی بیک لگ اور اسارٹ ہیں کہ ہر کوئی انہیں میری بڑی بہن ہی سمجھتا ہے۔“

تیمور کو لگا وہ اک پل بھی اپنے قدموں پہ کھڑے رہے تو گر جائیں گے، مگر اب سارہ کا سامنا بھی ممکن نہ تھا، دل و دماغ کسی آندھی کی زد میں آگئے، وہ یکدم اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”ارے آپ جا رہے ہیں، پلیز کچھ دیر تو ویٹ کریں وہ آتی ہی ہوں گی۔“ شیر کی نے انہیں روکنا چاہا۔

اور تیمور بنا کچھ کہے، وہاں سے نکلتے چلے گئے تھے، پل بھر میں جیسے ساری دنیا ان کے لئے بے گانی سی ہو گئی تھی، ان کا دماغ چکراتا ہی رہ گیا تھا۔

پھر اسی رات جب شیر کی رجاؤ سے کال پر، باتیں کر رہا تھا، لاؤنچ کی طرف بڑھتے سارہ کے قدم تھم سے گئے تھے۔

”یو نو، اتنے ڈسینٹ اور اتنے چارمنگ ہیں تیمور انکل کہ بس، تم بھی انہیں دیکھو تو دیکھتی رہ جاؤ، نفی کے قریب ہیں، دیکھنے میں بالکل بیک لگ، ہاں ہاں وہی تیمور انکل جو آج کل مام کو پک اینڈ ڈراپ کرتے ہیں اور تمہیں پتا ہے رجاؤ، انہوں نے مجھے خود بتایا، انہوں نے اب تک کسی ہارٹ ٹچنگ پر سٹیلٹی کی تلاش میں شادی ہی نہیں کی، امیزنگ نا، پتا ہے بڑی زبردست مس انڈر اسٹینڈنگ ہوئی سب کی طرح انہیں بھی یہی لگا کہ مام میری بڑی بہن ہیں ہم میں ڈس ٹینس ہی اتنا کم ہے۔“

فریج سے پانی کی بوتل نکال کر گھونٹ

گھونٹ پانی میں اتارتے ہوئے سارہ نے اس کا لہلاہٹا ہوا اپنے کمرے میں آکر موبائل ہاتھ میں لئے کچھ دیر سوچتی رہی، پھر اک نمبر پیش کر دیا۔

☆ ☆ ☆

سارہ سے تیمور اگلی صبح، گھر سے نزدیکی ہالک پارک میں ملے تھے، سارہ ان کے قریب آکر رکھی، تو انہیں لگا ان کے قریب زندگی جگمگا رہی ہو۔

”زے نصیب، اچھی لگ رہی ہیں۔“ تیمور نے مسکراتی نظروں سے فیروز کی وینک فینسی اریس میں مہکتی دھنکی سارہ کو دیکھا تھا۔

”اچھا، لگ رہی ہوں، ہوں نہیں؟“

”اچھی ہو، تبھی تو اچھی لگتی ہو۔“ دونوں ساتھ ساتھ چلتے اک سنگی بیچ پر جا بیٹھے تھے۔

”وائی زبردست مس انڈر اسٹینڈنگ ہوئی ہے اور غلطی میری ہی ہے، میں اسی گمان میں تھا کہ شیر کی تمہارا چھوٹا بھائی ہے، اچھو نیل تم اتنی بیک لگ، اسارٹ ہو کہ تمہیں دیکھ کر گمان تک نہیں گزرتا۔“

”میرے اور شیر کی درمیان ڈس ٹینس ہی اتنا کم ہے کہ سب ہی مجھے اس کی بڑی بہن سمجھتے ہیں۔“

”اس امیزنگ، تھری فائیو سے فورٹی کے درمیان تو آج کل لڑکیوں کی شادی ہوتی ہے، اس سے پہلے یا تو وہ بچہ ہی رہتی ہیں، یا آئیڈیل کے نام پر ٹائم ویسٹنگ۔“

”جو بات کچھ بھی ہوں، شادی تبھی ہوتی ہے جب قسمت میں درج ہو، ہماری زندگی کا لیس اور نہیں اوپر سے ہوتا ہے اور جب تک یہ اد کے نہیں ہوتا کوئی بھی وجہ سامنے کھڑی ہو کر اس لیس کو نو بنائے رکھتی ہے۔“

”یو آر رائٹ شادی کے لئے سب کا ایک نظریہ ہوتا ہے، مگر قسمت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، میں نے بھی اب تک کی عمر شادی کے لئے Fight کرتے گزاری ہے، بس کبھی بھی کسی کے لئے دل ہی نہ آمادہ ہوا، میرا نہیں خیال کہ میں کسی بھی لڑکی سے شادی کر لوں پھر اسے اپنی پسند کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے سر پیختا رہوں، اس سے بہتر تھا کہ میں اپنی پسند کی لڑکی تلاش کروں، شاید وقت پر شادی ہو جاتی تو شیر کی جیسے کسی بیٹے کا باپ ہوتا۔“

”بیس سال کی عمر میں شیر کی میری زندگی میں تھا، میرے ساتھ میری مام تھیں، میں گھر کو سپورٹ کرتی تھی، مام بیڑا لائیز ڈھیں، مجھے شیر کی کو کیئر کرنے کے ساتھ جاب بھی کرنی تھی، بہت کم عمری میں، پروفیشنل اور پرسنل لائف کو ہینڈل کرنا سیکھا۔“

”اس کا مطلب ہے آپ نے اسے ماں باپ بن کر پایا؟“

”بالکل..... بالکل..... ہمارے درمیان کبھی کسی تیسرے کا نہ گزر ہوا نہ ذکر، ہم دونوں نے زندگی میں اک دوسرے کے لئے گزاری ہے، جیسے آپ بھی اب تک سنگل ہیں؟“ وہ دھیرے سے ہنس دئے۔

”کیونکہ میرا بھی لیس اور نو کہیں اوپر سے ہی ہونا تھا نا۔“ اگلے ہی پل ان کے لہجے میں وہی لگاؤ در آئی تھی۔

”یایوں کہیے، مجھے اک ہارٹ ٹچنگ لڑکی کی تلاش رہی، اک ایسی لڑکی جو دل کو چھو جائے، اور اب تک کوئی ہارٹ ٹچنگ پر سٹیلٹی مجھ سے نکرائی ہی نہ تھی۔“ ان کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ سارہ کا دل اپنی رفتار بھولنے لگا، زندگی میں کھلنے والا پہلا محبت کا در پھر اس نے سر جھٹک



دیا۔

☆☆☆

اس رات سارہ شیر کی سیر اپنی گود میں رکھے، دھیرے دھیرے سہلا رہی تھی۔

”تمہیں پتا ہے مجھے پہلی سیری پانچ ہزار ملی تو مجھے وہ پانچ ہزار، پانچ لاکھ کے برابر محسوس ہوئے تھے، اب اگر مجھے پچاس ہزار ملتے ہیں تو۔“

”تو وہ آپ کو پانچ کروڑ لگتے ہیں، ہیں نا۔“

”نہیں، بلکہ وہ پچاس مجھے پانچ سو لگتے ہیں، شیر کی مجھے لگتا ہے، میں تمہیں کچھ نہیں دے پائی، تمہارے لئے کچھ نہیں کر پائی۔“

”نو مام، آپ غلط سوچتی ہیں، آپ نے مجھے سب کچھ دیا ہے، سب کچھ، میں نے Peace full لائف گزاری تو صرف آپ کی وجہ سے۔“

”انسان زندگی میں جو کچھ حاصل کرتا ہے، یا حاصل نہیں کرتا ہے، وہ سب اس کی قسمت ہے، دینے والا ہاتھ تو بس وسیلہ ہے۔“

”جی مام اور یہ بھی تو ہوتا ہے، انسان جو کچھ قسمت سے وصول کرتا ہے، اس سے کہیں زیادہ زندگی کو عطا کرتا ہے۔“

”ابھی وہ وقت دور ہے، ابھی تو تمہیں.....“

”لیس مام، آئی نو، ابھی مجھے اپنی اسٹڈی کمپلیٹ کرنی ہے، کچھ کرنا ہے، کچھ بننا ہے اور پھر رجاء سے شادی کرنی ہے۔“

”ہاں مگر تب تک تو رجاء جیسی بلکہ اس سے بھی اچھی نہ جانے کتنی لڑکیاں تمہاری زندگی میں آئیں گی۔“ سارہ کی بات پر وہ سنجیدہ ہو گیا۔

”میری زندگی میں ہزار لڑکیاں آئیں

جائیں، لیکن میری لائف پارنر رجاء ہی ہوگی۔“

”میں تمہارے لئے ایک مضبوط لڑکی چاہتی ہوں، شیر کی کیونکہ میں نے تمہیں مضبوط بنایا ہے۔“

”ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے مام، جسٹ 20 اور بیس کی اینج میں آپ بھی، اتنی ہی معصوم لاپرواہ ہو گئی جتنی رجاء ہے۔“

”بیس سال کی عمر میں، تم میری زندگی میں تھے، میں گھر کو سپورٹ بھی کرتی تھی، میرے ساتھ بھی میری مام تھیں، جو پیر الائیڈ تھیں، مجھے ان کی اور تمہاری کیئر کے ساتھ پرنسپل اور پرنسپل لائف اک ساتھ بیچ کرنی پڑی تھی مجھے۔“

”آئی نو مام، لیکن رجاء کو مضبوط بنانے کے لئے میں ہوں نا۔“

”شیر کی اب زندگی کسی کے نام کر دینے کے زمانے گئے۔“

”میں آج کل کی نسل کو دیکھتی ہوں تو ان کے لئے کسی کو چھوڑ دینا یا اپنا لینا بہت آسان کام ہے۔“

”لیس..... میں بھی یہی دیکھتا ہوں، آنا ہے تو دیکھ، جانا ہے تو بائے بائے، لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔“ شیر کی اٹھ بیٹھا تھا۔

”میں اک کال کروں؟“

”کسے کال کرنی ہے؟“

”ایک دوست کو۔“ وہ نظریں چرا گیا تھا۔

”جب انسان سچ بولتا ہے نا تو اس کی آنکھیں اس کا ساتھ دیتی ہیں جب وہ جھوٹ بولتا ہے تو نظریں چرا لیتا ہے۔“

”نہیں مام..... میں آپ سے جھوٹ نہیں بول سکتا، مجھے رجاء سے ہی بات کرنی ہے۔“

”میں نے تم سے کہا تھا نا، تم رجاء سے لیٹ

ایک بات کہیں کر دے۔“

”مام مجھے اس سے صرف ایک بات کہنی

”اسے بیچ کر دو، وہ ایک بات اگر لمبی ہو گئی تو بیچ لوں گا کو کے اور تمہاری آف ہو جائے گی۔“

”پلیز مام، جسٹ دو منٹ۔“ اس نے اشارت میں سر ہلایا۔

”او کے جسٹ نو منٹ۔“ وہ کمرے سے اٹھ گیا، سارہ مسکراتے لگی۔

”کیا چیز ہوتی ہے یہ محبت بھی۔“ بیڈ کی تخت سے سر نکالے وہ بے ساختہ تیور کو سوچے، زندگی میں کھلنے والا پہلا محبت کا در، تیور کی محبت اتنی سحر انگیز اور چھا جانے والی تھی، کہ اس کا دل اپنی رفتار بھولنے لگتا، کبھی کبھی دل کہتا کہ ان کا ہاتھ تمام کر کہیں دور نکل جائے، مگر

شیر کی کہا وہ تیور کو اک نئے رشتے کے ساتھ منہ زور کرے گا، نہیں کبھی نہیں، میں انہیں کیسے بتاؤں

کے بتاؤں کہ شیر کی میری زندگی کی اک سچ

کال ہے اور میری زندگی شیر کی پر ختم ہے، سارہ

کی سوچ محسوس پھر کر اک ہی سچ پر انگ لگ جاتی۔

اس روز شام تیور کی کال آئی تھی۔

”آپ جیسے لوگ زندگی کو مکمل کرتے ہیں

سارہ اور جو لوگ مکمل نہیں ہو پاتے بیسویں کریں، ان

کی زندگی میں بہت توڑ پھوڑ بہت سناٹا ہوتا ہے،

انسان ادھورا رہ جاتا ہے، تو زندگی میں خالی پن رہ

جاتا ہے۔“

”آپ نے کبھی اس ادھورے پن کو فیل

فیل نہ کرتا تو تلاش نہ کرتا، کسی ہارٹ

ٹینک پر سیٹھی کی، مجھے ہمیشہ کسی کی تلاش رہی،

اک ایسی ہستی جو دل کو چھو جائے اور اک بات

بتاؤں آپ کو، وہ تلاش آپ پر آ کر ختم ہو گئی ہے اور یہ میرا خیال ہے، اب مجھے یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں کہ وہ لڑکی آپ ہیں سارہ۔“ سارہ گنگ سی رہ گئی تھی، اگرچہ تیور کا لہجہ و انداز، ان کی فینٹکسوں کا رنگتے تھے مگر۔

”پہلی ہی نظر میں، وہ تلاش ختم ہو گئی تھی، مجھے لگا میں آپ ہی کے لئے ادھورا ہوں۔“

”میں آپ کو پروپوز کرنا چاہتا ہوں

سارہ۔“ اک بل کو لگا، آسمان اپنی سارے وزن سمیت اس پر آگرا ہو، دوسری جانب سے تیور

کوئی جواب نہ پا کر، پکارتے تھے۔

”سارہ.....!“ سارہ موبائل کان سے

لگائے گم صم صم، انہوں نے پھر پکارا۔

”سارہ.....!“ پھر خاموشی، اس کی نگاہیں

اک نکتے پر لگی تھیں۔

”پلیز سارہ کچھ تو کہیے۔“

اور سارہ کو لگا کوئی ٹرین اسے رو دنتی

گزرتی جا رہی ہے، اس کے ہاتھ سے موبائل گر

گیا تھا، موبائل پر تیور کی پکار گونجتی رہی، مگر سارہ

تو شاید وہاں تھی ہی نہیں۔

اگلے روز جاگنگ پارک میں تیور کے

سامنے، انتہائی سنجیدہ تیور نے کھڑی تھی۔

”زندگی کے فیصلے اتنی جلدی اور بناء سوچے

سمجھ نہیں کیے جاتے تیور صاحب۔“

”میں نے تمہیں بتایا نا، مجھے ہمیشہ تم جیسی

لڑکی کی تلاش رہی وہ مجھے مل گئی، اینڈ ڈٹس

اٹ۔“

”آپ میرے بارے میں ابھی جانتے ہی

کیا ہیں؟“

”آپ ایک مضبوط، بہادر اور صاف و

شفاف لڑکی ہیں اور بس، میرے لئے اتنا ہی کافی

ہے۔“



”نہیں تیمور صاحب، آپ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے، کچھ بھی نہیں۔“

”مجھے آپ کے بارے میں کچھ اور جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔“

”اتنے کم وقت میں اتنا بڑا فیصلہ کرتے آپ نے اک پل کو بھی شیریں کے لئے سوچا؟“

”ہاں شیریں آپ کا بیٹا ہے، سو وہاٹ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، میری شادی وقت پر ہوتی تو شیریں جیسا میرا بیٹا ہوتا۔“

”نہیں تیمور صاحب آپ شیریں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، اور اگر آپ نے مجھے پروپوز نہ کیا ہوتا تو شاید آپ بھی کبھی نہ جانتے، شیریں میرا بیٹا ہے، میں نے اسے پالا ضرور ہے، لیکن میں نے اسے جنم نہیں دیا، میری تو شادی ہی نہیں ہوئی۔“

”وہاٹ؟“ تیمور کو لگا دنیا ان کی نظروں کے سامنے گول گول گھوم رہی ہے۔

”تم کیا کہہ رہی ہو سارہ!“ وہ لب بھینچے اسی خطرناک سنجیدہ انداز میں بازو لپیٹے ان کے سامنے کھڑی رہی۔

”پلیز..... بیٹھ جاؤ..... بیٹھ جاؤ..... اور مجھے بتاؤ..... یہ..... یہ..... سب کیا ہے؟“ سارہ سنگی بیچ پر ان کے نزدیک کچھ دیر لب بھینچے لفظ ترتیب دیتی رہی، پھر اک ٹھنڈی سانس بھر کر کہنا شروع کیا۔

”میری مام اس وقت پیر الائنز ڈھنیں، میں گھر کو سپورٹ کرتی تھی اور مام کی کیئر بھی، جب شیریں میری زندگی میں آیا، بالکل اچانک اور غیر متوقع، ہاں وہ اک طوفانی رات تھی، میری کار سے اک عورت کا ایکسڈنٹ ہوا وہ شیریں کی ماں تھی، شیریں اس کی گود میں، صرف چند ماہ کا تھا، شاید اس کی زندگی کم تھی، وقت نے اسے مہلت

نہ دی مگر اس عورت کا انتہاء اکھڑتی سانسیں، ہاں اس نے شیریں کے لئے میرے سامنے ہاتھ جوڑے تھے شاید وہ حالات کی ستم ظریفی کا شکار تھی اور کسی کڑے وقت میں اپنے گھر سے نکلتی تھی، میں اس حادثے پر بھی خود کو معاف نہ کر پائی، مگر یہ سب شاید یوں ہی ہونا درج تھا، یوں نہ تھا کہ میں نے اپنی زندگی شیریں کے نام کی، میرے بھی کچھ خواب تھے، ہاں اگر اس سمیت کسی نے مجھے منظور نہ کیا تو میں نے کتاب زندگی سے شادی کا ورق ہی پھاڑ دیا۔“ تیمور لنگ سے رہ گئے۔

☆☆☆

تیمور کے ہارن دینے سے پہلے داخلی دروازہ وا ہوا اور یونیورسٹی کے لئے تیار شیریں برآمد ہوا، انہیں پا کر تیر کی طرح ریڈ کروا کی طرف لپکا۔

”اوہ تیمور انکل ہائے مام تو چلی گئیں۔“

”لگتا ہے ان کی کار ٹھیک ہو گئی۔“ وہ کچھ ٹھٹکے تھے۔

”اوہ نو، کار ٹھیک ہو جاتی تو وہ آپ کو کنفرم نہ کرتیں؟ میں نے خود انہیں کیب منکوا کے دی ہے۔“ تیمور اک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئے۔

”اوکے آؤں تمہیں ڈراپ کر دوں۔“

”آپ آؤٹ آف روڈ ہو جائیں گے، مجھے تو این ای ڈی جانا ہے، اچھی نیکی میرا پوائنٹ مٹ ہو گیا ہے۔“

”اٹس اوکے جہاں تک پاسیبل ہوا چھوڑ دوں گا۔“ وہ بناء کچھ کیے فرنٹ ڈور کھول کر سیٹ پر بیٹھ گیا اور تیمور کی کار آگے بڑھ گئی۔

اسی شام انہوں نے سارہ کو آفس سے نکلتے ہوئے چالیا۔

”اس گریز کا مقصد؟ تمہارا کیا خیال ہے کہ تمہارا Past میرے فیصلے کو تبدیل کر دے گا،

لو سارہ، تم میرے لئے اور بلند ہو گئی ہو، پہلے سے بھی زیادہ عظیم۔“

”شیریں میری زندگی کی اک کڑی سچائی ہے، میں نے کسی اور رشتے کو قریب سے نہیں دیکھا، تو یہ کہنا غلط ہے کہ میں نے اسے پالا، حقیقت تو یہ ہے کہ شیریں کی ماں بن کر میں مضبوط رہی، اک تنہا لڑکی، زندگی اور دنیا سے کیسے سروائیو کر پائی، امی کے بعد میں بے سہارا رہ جاتی اگر شیریں کی ماں بن کر نہ جیتی، اب تو مجھے خود بھی یاد نہیں ہے کہ میں شیریں کی ماں نہیں ہوں۔“

”اس نے تمہیں یا تم نے اسے سہارا دیا، بات ایک ہی ہے، تم نے اس کی وجہ سے اک اسٹراٹگ لائف گزاری، تو تم نے بھی اسے اس کے پیروں پہ کھڑا کیا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنے لئے ٹھٹکنے والے سب دروازے بند کر دو، بلکہ اسے بتا دو کہ تمہاری شادی نہیں ہوئی، زندگی کی خوشیوں پر تمہارا بھی حق ہے۔“

”میں مر کے بھی اسے یہ بات نہیں بتا سکتی وہ ڈسٹرب ہو جائے گا، آپ میرے لئے کچھ بھی سوچو، مگر شیریں کو یاد رکھنا اور یہ بھی کہ میری زندگی اس پر ختم ہے۔“

”اسٹریٹج، اک بے حد پال لینے سے زندگی ختم نہیں ہو جاتی، یہ کوئی ایسی وجہ نہیں تھی کہ تم زندگی بھر شادی ہی نہ کرتیں، کسی نے مجھے شیریں سمیت منظور ہی نہ کیا تو میں نے بھی یہ خیال دل سے نکال دیا اور اب وہ اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ میں شادی کے لئے سوچ بھی نہیں سکتی۔“

”اگر تمہیں میرا ساتھ منظور نہیں تو یہ یاد رکھنا کہ تم میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری عورت ہو اور اگر وجہ شیریں ہے تو اسے سمجھایا بھی تو جاسکتا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے شیریں کو یہ اچھا نہیں لگے گا

اور اگر میں اسے منا کر اس سوچ تک لے آؤں؟ میں اسے خود سے اتنا مانوس کر سکتا ہوں کہ پھر وہ بہت آسانی سے مان جائے۔“

”آپ اسے نہیں منا سکتے تیمور، بلیوی کہ آپ اسے نہیں منا سکتے، وہ میرے لئے بہت چچی ہے۔“

”کوشش تو کر ہی سکتا ہوں نا۔“

”آئی ڈونٹ تھنک سو۔“ اس نے مایوسی سے گردن ہلائی۔

”آئی ول ٹرائی مائی بیٹ، کیا اب میں یہ سمجھوں کہ تمہاری طرف سے کوئی ایٹو نہیں ہے؟“

”اب تو آپ کو مان ہی لینا چاہیے۔“ وہ ان کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگی۔

”یا ہو۔“ تیمور جہانریب کو اقرار کے سب رنگ مل گئے تھے، کار کا میوزک تیز تیز بجنے لگا تھا۔

”اٹس کرییم کھانے چلیں؟“

”گن پوائنٹ پر؟“ سارہ کے لپچے میں شوخی در آئی، تو تیمور نے گہری وارفتہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”نہیں لو Love پوائنٹ پر۔“ وہ دھیمے سے ہنسی اور کار تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

”اوہ آپ لیکن مام تو گھر پر نہیں ہیں؟“

شیریں نے تیمور سے ہاتھ ملایا۔

”میں تم سے ملنے بھی تو آ سکتا ہوں، بلکہ میں تم ہی سے ملنے آیا ہوں۔“

”اوہ رینلی، اتفاق سے آج میں بھی فری ہوں۔“ تیمور اس کی معیت میں لاؤنج تک آ گئے۔

”آپ کیا لیں گے، چائے یا کافی؟“



”سارہ نے مجھے بتایا تھا، کہ تم کافی بہت اچھی بناتے ہو۔“

”صرف کافی ہی نہیں، میں تو گھر کے سب کام کر لیتا ہوں، میری مام نے مجھے گھر کے سب کام سکھائے ہیں۔“

”ہم..... گڈ..... ایک بات بتاؤں، کافی میں بہت اچھی بنا لیتا ہوں، شاید تم سے بھی اچھی۔“

”اوہ رینلی، ویسے میں سینڈوچ بھی بہت اچھے بنا لیتا ہوں۔“

”گڈ تو پھر ٹھیک ہے، کافی میری طرف سے تمہارے لئے اور سینڈوچ تمہاری طرف سے میرے لئے۔“

”سینڈوچ تو میں بنا دوں گا، لیکن کافی آپ کو اکیلے ہی پنی پڑے گی، ایچو نیلی مام کی طرف سے مجھے اس کی پرمیشن نہیں ہے، وہ کہتی ہیں کہ کافی پینے سے انسان Lazy ہو جاتا ہے۔“

”اگر سارہ کہتی ہے تو ٹھیک ہی ہے، مگر میرے ساتھ تو تم کافی پی سکتے ہو۔“

”پی تو سکتا ہوں لیکن اس سے مام خفا ہو جائیں گی اور انہیں خفا کرنے سے بہتر ہے میں بغیر کافی گزارا کر لوں۔“ کچھ دیر بعد تیمور کے سامنے کافی سینڈوچ کے ساتھ تھی، انہوں نے پہلا sip لیا۔

”انسان کی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسا ضرور ہوتا ہے وہ جس کا کہا ناں نہیں سکتا۔“

”تیمور آپ کی لائف میں بھی کوئی نہ کوئی ایسا ضرور ہوگا۔“ شیر کی بات پر وہ کچھ کنفیوز نظر آنے لگے تھے، پھر چل بھر میں خود کو سنبھال لال۔

”ہاں پہلے تو نہیں تھا، لیکن اب ضرور ہے۔“

”گڈ، مام کہتی ہیں کافی میں کیفین ہوتی

ہے جو Health کے لئے Better نہیں ہے۔“

”سب کچھ مام ہی کہتی ہیں، تمہاری اپنی کوئی سوچ نہیں ہے۔“

”ہے نا، رجاء۔“ یکا یک شیر کی لہجہ میں بے انتہا محبت در آئی۔

”رجاء۔“ انہوں نے کچھ یاد کیا، پھر کہا۔

”اوہ..... یس..... رجاء تو تمہاری دوست ہے نا، مجھے سارہ نے بتایا تھا۔“

”نو..... رجاء..... میری زندگی ہے۔“ اس نے اک جذب سے کہا تھا، اس کی نظروں میں لو دیتے جذبے جگر جگر کرنے لگے۔

”مام کہتی ہیں، انسانی زندگی میں بہت کچھ ایسا ہوتا ہے، جو وہ کرتا نہیں، بس ہو جاتا ہے، رجاء صرف میری کلاس فیلو، فرینڈ تھی، اس کے بعد بس سب کچھ خود بخود ہوا ہے۔“

”اگر تم چاہو تو میں سارہ کو رجاء کے لئے راضی کر سکتا ہوں۔“

”ابھی وہ وقت دور ہے اور آپ دیکھنا، وہ راضی ہو جائیں گی۔“ اس کے لہجے و انداز میں بے نیازی سی تھی۔

”ایچو نیلی وہ چاہتی ہیں کہ عورت کو سڑاگ ہونا چاہیے، رجاء ابھی معصوم ہے، مگر بہت چیفنس پٹی۔“

”کیونکہ سارہ خود جو اسڑاگ ہے شاید اسی لئے۔“

”یس مام نے لائف کے لئے بہت Stngle کی ہے، وہ خود اسڑاگ ہیں تو انہوں نے مجھے بھی اسڑاگ بنایا، مجھے سب کچھ سکھایا اور میں نے سکھا، کیونکہ جب وہ عورت ہو کر گھر کی گاڑی چلا سکتی ہیں، تو میں کیوں نہیں، ان کا رائٹ پنڈ بن سکتا۔“

”تم نے کبھی خود کے لئے سوچا تو شاید وہ

”سے بی شاید اس لئے کہ اس نے میرے سوا کوئی اور رشتہ دیکھا ہی نہیں، میں نے اسے بازو اور اسڑاگ سوچ دی ہے، نہ وہ کبھی باپ کی کمی محسوس کرتا ہے، نہ اس کے لئے سوال کرتا ہے۔“

”تم نے کبھی خود کے لئے سوچا تو شاید وہ

”گڈ، ویسے کافی کے علاوہ تم اور کیا کام کر لیتے ہو۔“

”سب کچھ، اسپیشلی میرا سارا سنڈے مام کے ساتھ بڑی ہوتا ہے، کیونکہ اتوار کو ہم اپنی ڈیوٹیز ایکس چینج کر لیتے ہیں، میں گھر سے باہر کے سب کام نمٹاتا ہوں، کچن گروسری، یونٹیلٹی بلز، لانڈری، کار واش اور مام گھر کے اندر کے۔“

”ویل ڈن پھر تو تم سے بہت کچھ سیکھنا چاہیے، یونو میرا تو سارہ سنڈے ہی پور گزرتا ہے، گھر میں میرے سوا کوئی اور ہے جو نہیں۔“

”اوہ آئی سی۔“ وہ کافی دیر شیر کی سے ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے۔

☆☆☆

”تم نے ٹھیک کہا تھا، وہ واقعی اک اسپیل اور انوسینٹ لڑکا ہے، مجھے تو ویسے بھی اس سے دوستی کر لینی چاہیے۔“

”وہ بھی آپ کا ویٹ کرنے لگا ہے، آپ کی کمپنی کو انجوائے کرتا ہے۔“

”اور میں اس کی کمپنی کو انجوائے لگا ہوں، پتا ہے یہ جو بچہ لوگ ہوتے ہیں نا، انہیں بہلانا ویسے بھی آسان ہوتا ہے۔“

”لیکن اس بچے کو بھی ہرٹ نہیں ہونا چاہیے، یہ یاد رکھنا۔“ سارہ نے یاد دلایا۔

”لیکن مجھے لگتا ہے تم نے اسے ماما بوائے بنا دیا ہے، وہ تم پر کچھ زیادہ ہی ڈی پنڈ کرتا ہے۔“

”سے بی شاید اس لئے کہ اس نے میرے سوا کوئی اور رشتہ دیکھا ہی نہیں، میں نے اسے بازو اور اسڑاگ سوچ دی ہے، نہ وہ کبھی باپ کی کمی محسوس کرتا ہے، نہ اس کے لئے سوال کرتا ہے۔“

”تم نے کبھی خود کے لئے سوچا تو شاید وہ

”شیری نے لاؤنج میں ٹہلنے اک نظر سارہ کے کمرے پر ڈالی، بند دروازے کی اس پار سارہ کی دھبی آواز شاید تیمور کی کال تھی، یہ سارہ کے سونے کا ناٹم تھا، سارا گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، لاؤنج میں بھی مدھم باور، بلب کی دھبی سی روشنی تھی، اس نے ٹہلنے ٹہلنے رک کر اک نظر وال

اور مضبوط ہوتا۔“

”شیری کے بعد میری زندگی نامکمل ہے اور میں اس سے ہٹ کے اپنے لئے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”لیکن اسے پارٹو اور اسڑاگ سوچ دینے میں تم نے اپنے آپ کو کمزور کر لیا ہے، کیونکہ تم اچھی طرح اس کے دل و دماغ میں یہ بات بٹھا چکی ہو کہ تمہاری زندگی اس پر ختم ہے۔“

”میں اس کے لئے جتنی بچی ہوں وہ بھی میرے لئے اتنا ہی بچی ہے، مجھے نہیں لگتا کہ آپ کسی بھی طرح اسے Agree کر سکتے ہیں۔“ تیمور کو بھی ایسا ہی لگتا تھا، سو وہ ٹال گئے۔

”Let's see“ ویسے کل تم کیا کر رہی ہو؟“

”سنڈے تو میرا سارا، شیر کی کے ساتھ بڑی ہوتا ہے، ہم دن میں مل کر ہفتہ بھر کے کام نمٹاتے ہیں اور شام میں آؤٹنگ ہونٹنگ۔“

”اور تمہیں پتا ہے، میرا سنڈے سب سے زیادہ نا کارہ ہوتا ہے، میری تنہائی مجھے اور زیادہ ڈسٹرب کرنے لگتی ہے۔“

”آں ہاں، پھر تو کچھ نہ کچھ سوچنا پڑے گا۔“

”چلو تو پھر کوئی پروگرام بناتے ہی، کل کے سنڈے ہم مل کر انجوائے کرتے ہیں۔“ سارہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

☆☆☆

شیری نے لاؤنج میں ٹہلنے اک نظر سارہ کے کمرے پر ڈالی، بند دروازے کی اس پار سارہ کی دھبی آواز شاید تیمور کی کال تھی، یہ سارہ کے سونے کا ناٹم تھا، سارا گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، لاؤنج میں بھی مدھم باور، بلب کی دھبی سی روشنی تھی، اس نے ٹہلنے ٹہلنے رک کر اک نظر وال



کلاک پر ڈالی، بارہ بجنے میں کچھ منٹ باقی تھے اس نے اک ٹھنڈی سانس بھر کر اک اور منتظر نظر سارہ کے کمرے کی طرف اٹھائی تھی، وال کلاک نے بارہ کے گھنٹے بجائے اور موبائل پر رنگ ہوتی اس نے موبائل اٹھایا، موبائل اسکرین پر رجا کا نمبر جگمگا رہا تھا اور پھر اس کی سریلی آواز۔

”پپی برتھ ڈے شیری۔“

”تھینک یو دیری مچ۔“ اس نے اک افسردہ نظر سارہ کے کمرے پر ڈالی، بتیاں گل ہو چکی تھیں اور اس نے محسوس کیا، آج اسے رجا کی دشمنی نے بھی اسے خوش نہیں دی۔

☆☆☆

سارہ جاگی تو شیری کا میسج اس کا منتظر تھا۔

”پپی برتھ ڈے ٹومی۔“ سارہ نے سر پیٹ لیا، اگلے ہی پل وہ شیری کے سامنے تھی۔

”آئی ایم ساری شیری، مجھے رات اچھی طرح یاد تھا، بس اچانک ذہن سے نکل گیا، پھر نیند آگئی۔“

”اوہ..... ہاں..... رات تو تینور انکل کی کال آئی تھی نا، میں نے سنا تھا، رات بارہ کچھ پہلے آپ ان سے باتیں کر رہی تھیں۔“ اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ سارہ چونک گئی، مگر کہا کچھ نہیں۔

”اٹس اوکے مام، رات کو آپ بھول گئیں، اس میں براہم کیا ہے، رجا کو تو یاد تھا نا اور اس نے بارہ بجتے ہی مجھے وش بھی کر دیا تھا۔“

”میں تینور کو کال کرتی ہوں، شام میں کسی اچھی سی جگہ تمہاری برتھ ڈے سیلی بریٹ کرتے ہیں۔“

”اوکے۔“ وہ ہنس دیا، ٹوٹی ہوئی شکستہ سی ہنسی، سارہ اندر کی طرف بڑھ گئی شیری اک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا، انداز کسی گہری سوچ

کا غمازہ تھا، پھر لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ گیا، رجا آن لائن تھی اور شیری کو اسے ہر بات بتائے بناء کہاں چین پڑتا تھا۔

”سو وہاٹ شیرے اگر ہم دوسروں سے امید نہ رکھیں تو زندگی بہت آسان ہو جاتی ہے۔“

”میں مام سے امید نہ رکھوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے رجا، مجھے لگتا ہے، وہ مجھ سے زیادہ تینور انکل پر ڈی پینڈ کرنے لگی ہیں اور یہ سب ان ہی کی وجہ سے ہے۔“

”اٹس اوکے شیری، ان کی زندگی تم پر ختم تو نہیں ہو جاتی۔“

”مگر وہ مجھ سے دور ہو رہی ہیں رجا، وہ مجھ سے زیادہ انکل تینور کو ٹائم دینے لگی ہیں۔“

”وہ اگر خوش رہنے لگی ہیں تو تمہیں ان کی خوشی میں خوش خوش ہونا چاہیے۔“

”نہیں رجا، میں ایسا نہیں کر سکتا، مام میرے لئے جتنی چٹی ہیں، ان سے کہیں زیادہ میں ان کے لئے چٹی ہوں۔“

”ڈونٹ لی سلی شیری، وہ جس اتج میں ہیں، اس میں تھکن ہو ہی جاتی ہے، انہیں بھی تو ریٹ کی ضرورت ہے نا۔“

”مگر مجھے، مجھے ان کی ضرورت ہے، یہ وہ جانتی ہیں۔“

”اٹس اوکے شیری، کسی کو اپنے ساتھ باندھ کر رکھنا ٹھیک نہیں ہے، سب کی اپنی لائف، اپنی فیلنگو، اپنی خوشیاں ہوتی ہیں، ہر انسان کو مختلف آپشنز ملتے ہیں، سارے راستے ایک جیسے نہیں ہوتے، ہر کسی سے ہم ہر بات نہیں کہہ سکتے، انسان ہر اتج میں دوست بناتا ہے، کیونکہ اسے دوست کی بھی تو ضرورت ہوتی ہے نا۔“

”ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ وہ کچھ نرم پڑ گیا تھا۔

”مگر ان کی یہ فرینڈ شپ مجھے ڈسٹرب کر رہی ہے، میں خود کو اکیلا محسوس کرنے لگا ہوں، اس سے پہلے تو انہیں بھی کسی دوست کی ضرورت نہیں پڑی۔“

”کم آن شیرے، مے بی اس سے پہلے انہیں کوئی ایسا ٹکرایا ہی نہ ہو۔“ وہ کچھ خاموش سا ہو کر رہ گیا، یہ تو ٹھیک ہی تھا، تینور جیسا جہانذیب کی شخصیت اتنی بھر پور مکمل اور چھا جانے والی تھی کہ انہیں انکوری کیا ہی نہ جا سکتا تھا، وہ بچے کھرے اور مخلص انسان تھے، مگر اسے لگتا، بات نہیں اس سے سوا ہے، کچھ ایسا جو ہے اور شاید نہیں ہونا چاہیے، یا ہونا چاہیے، تو اس کا دل و دماغ وہاں تک نہیں پہنچ پایا، وہ الجھ کر رہ گیا تھا۔

پھر شاید یہ رجا کے لفظوں کا ہی کمال تھا کہ اس شام شیری نارمل تھا، سارہ نے پی سی میں ڈنر کا اہتمام تھا، تینور نے دلش ریپر میں لیٹا باکس اسے تنہا یا تو وہ مسکرا دیا تھا۔

”پپی برتھ ڈے شیری۔“

”تھینک یو دیری مچ انکل، کھول کر دیکھ لوں؟“

”شیور۔“ وہ اک خوبصورت قیمتی اسارٹ واپج تھی۔

”Oh i really need its۔“ اتنے میں اس کی کال آگئی تو وہ اک گوشہ میں چلا گیا۔

”اٹس فارمی؟“ سارہ نے اگلے پیکٹ کی جانب اشارہ کیا۔

”اوہ شیور میں نے شیری کے لئے کچھ لیا پھر کیسے Possible تھا کہ تمہارے لئے کچھ نہ لیتا۔“ تینور نے سارہ کو پیکٹ تھما دیا، سارہ نے باکس کھولا خوبصورت طلائی نگن جگر جگر کر رہے تھے۔

”اوہ ریلی ٹائس، مگر کافی مہنگے ہیں۔“

”تم سے زیادہ نہیں، میں پہنا دوں؟“ وہ مسکرا دی، انہوں نے سارہ کی کلائی تھام کر نگن پہنایا، تو اس کی دودھیا کلائی لودے اٹھی تھی۔

”پتا ہے، ہمارے ہاں کچھ ٹریڈ شینز ہیں، کنواری لڑکی ساڑھی نہیں باندھتی، نگن نہیں پہنتی، تو میں نے بھی ہمیشہ Avoide کیا، لیکن آج ایک اصول توڑ دیا۔“

”ہاں کوئی اصول اگر توڑ بھی دیا جائے تو کیا فرق پڑتا ہے، کوئی قیامت تو نہیں آجائے گی۔“

”آئی..... ایم ساری..... اچھو سکی۔“

شیری لوٹ آیا تھا، اچانک اس کی نظر سارہ کی کلائی میں پڑے نگن پر پڑی تو وہ ہنسنے لگا۔

”تم کچھ کہہ رہے تھے شیری۔“ تینور نے ٹوکا۔

”جی..... ڈنر آرڈر کریں؟“

”شیور۔“ سارہ نے ویٹر کو اشارہ کیا۔

☆☆☆

”ارے یہ تم کہاں سے برآمد ہو رہی ہو؟“

تینور نے دلچسپی سے فان اسپیر اینڈ بلیک سوٹ میں دلکش سی سارہ کو دیکھا، وہ داخلی دروازے کے ساتھ لگی دیوار تلتے، جانے کیا کر رہی تھی، اٹھتی گرتی، پلکوں کی چمکن میں انہیں لگا، ان کا دل الجھ کر رہ گیا، شفاف چہرے پر ہلاکی نرمی تھی۔

”شیری کو کبوتر کا اک Pair کسی نے گفٹ کیا ہے، ہم دونوں اسی کا پنجرہ پٹائیں گے۔“ وہ ہاتھ جھاڑتی، ان کی جانب مڑ گئی تھی۔

”انٹرسٹنگ، مگر شیری ہے کہاں؟“

”کچھ سامان کم تھا، وہی لینے گیا ہے۔“ وہ سارہ کے ساتھ چلتے اندر کی طرف آئے۔

”کافی جلے گی؟“

”دوڑے گی، لیکن یہی کافی ہم کہیں اور چل کر پیس تو کیسا؟“



”شیری کا پنجرہ؟“ سارہ الجھٹی۔  
”وہ ہم اگلے ویک بتالیں گے۔“  
”اوہ..... مگر شیری۔“

”میں اسے سمجھا لوں گا، یو ڈونٹ وری۔“  
”ریٹلی؟“

”میں تم جلدی سے ریڈی ہو کر آ جاؤ، میں ویٹ کر رہا ہوں۔“ سارہ اندر کی طرف بڑھی تھی تیور نے لان سے اندر کو جاتے رستے پر چلتے ہوئے شیری کو کال کے لئے موبائل نکالا ہی تھا، کہ ان کے عقب سے شیری کی آواز ابھری۔  
”ہائے انگل۔“ چہرے پر بلا کی معصومیت لئے اپنے ازلی سادہ و شفاف کچھ اور انداز میں پیرٹ کلر شرٹ پر پینک ٹراؤزر میں ملبوس وہ ہاتھ میں ایک شاپر لئے کھڑا تھا۔

”اوہ شیری میں تمہیں ہی کال کر رہا تھا۔“  
”ریٹلی..... خیریت؟“

”ہیں، کیونکہ ہم آواری چل رہے ہیں اچھے سے بچ کے لئے اور شام تک ساحل سمندر پر انجوائے کریں گے، سمجھو آج سارا سنڈے انجوائے منٹ۔“

”اور مام کیا کہتی ہیں۔“

”بھئی مام کی مجال ہے، جو میرے سامنے انکار کر جائے؟“ وہ دھیرے سے ہنسا تھا، تیور اسے ساتھ لگائے، اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اسے اندر لا رہے تھے، جب سارہ منٹوں سیکنڈوں میں تیار ہوئے لوٹ آئی۔

اس کے سادہ شفاف چہرے پر بلا کی جاذبیت تھی، تیور نے اک وارفتہ نگاہ اس پر ڈالی۔

”آپ کو پتا ہے، دبلے ہونے کی آسان ترین ورزش کیا ہے؟“  
”اپنی گردن کو دائیں اور پھر بائیں

گھمائیے۔“ شیری نے شرارت سے نفی کے انداز میں سر ہلایا۔

”جب آپ کو کوئی کچھ کھلانے پلانے کی آفر کرے۔“ تیور کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

”مام بھی اسی فارمولے پہ عمل کرتی ہیں۔“  
”بھئی تو اتنی اسمارٹ ہیں۔“ تیور نے دلچسپی اور محبت سے سارہ کو دیکھا۔

”لیکن جب اولاد جون ہو کر سامنے کھڑی ہو جاتی ہے نا، تو سارہ جیسے لوگ اپنے آپ کو بوڑھا سمجھنے لگتے ہیں۔“ تیور نے اسے چڑایا۔

”اوہ..... نو..... کم از کم میرا دس بیس سال اور بوڑھا ہونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ سارہ نے فوراً کہا۔

”مگر Activities تو بیس ایکس سال جیسی ہی ہیں اور میں تم سے کم نہیں، تم دیکھنا شیری اور میں اگلے ویک ہم مل کر پنجرہ بنائیں گے۔“

”اوہ..... نو..... آپ..... آپ بتائیں گے پنجرہ۔“ شیری کو حیرت سنبھالنی دشوار ہو گئی۔  
”تو اور کیا، اک زمانے میں، میں نے بھی کبوتر اڑائے ہیں، بلکہ مجھے تو پتنگ بھی اڑانی آتی ہے۔“

”ریٹلی..... آئی ڈونٹ بلیواٹ۔“

”اگلے سنڈے یقین آ جائے گا ہم مل کر پنجرہ بنائیں گے، پھر پتنگ بھی اڑائیں گے، بس تم فنانٹ تیار ہو کر آ جاؤ۔“

شیری بنا کچھ کہے اندر کی طرف مڑ گیا، تو سارہ اور تیور نے داخلی دروازہ عبور کیا، اگلے ہی پل سارہ اور تیور ریڈ کرولا میں شیری کے منتظر تھے، تیور گہری نظروں سے پینک اسٹامپش ڈریس میں ملبوس سارہ کا جائزہ لیا۔

”کسی نے تمہیں بتایا کہ تم دنیا کی حسین ترین لڑکی ہو۔“

”یہ پوچھیے کہ کس نے نہیں بتایا کہ میں حسین ترین لڑکی ہوں۔“ اس نے فٹ سے برجستہ کہا تو وہ دھیرے سے ہنس دیئے۔

☆☆☆

شیری موبائل کان سے لگائے، چلا رہا تھا۔  
”اوہو، یہ تمہارے پاپا کے بزنس پارٹنر کا بیٹا کہاں سے آ گیا اسنو پڈ۔“  
”پلیز اسے اسنو پڈ تو نہ کہو، اتنا چارمنگ،

ویل میئر ڈاور نا کس ہے۔“  
”اسنو پڈ میں نے اسے نہیں، اپنے آپ کو کہا ہے، اتنی دیر میں تمہارا اوپٹ کرنا رہا اور تم فارم

ہاؤس جا رہی ہو، پاپا کے بزنس پارٹنر کی بیٹی کے ساتھ۔“

”میں نے تمہیں بتایا نا، سب نے مل کر گیدرنگ رکھی ہے، میں کیسے انکار کر دوں، آذر نے اتنی ریکوسٹ کی ہے، آئی ایم ساری، اب پلیز اپنا موز تو نہ آف کرو۔“

”او کے مگر اب میں کوئی ایکسیکوز نہیں سنوں گا۔“

”آئی دل ٹرائی مائی بیٹ شیری، پلیز کچھ ویٹ، ہم ملتے ہیں نا۔“

”او کے میں ویٹ کر لوں گا۔“ وہ موبائل آف کر کے، کسی گہری سوچ میں گم تھا، جب اک آواز ابھری۔

”ہائے شیری۔“ وہ تیزی سے مڑا تھا، سامنے تیور تھے۔

”اوہ..... ہیلو..... انگل۔“ شیری نے منٹوں میں خود کو سنبھالا۔

”میں کچھ فری تھا، سو چال کے گپ شپ لگاتے ہیں۔“

”اوہ شیور، اتفاق سے آج میں بھی فری ہوں، آج رجا سے ملنا تھا، مگر آج رجا فارم

ہاؤس جا رہی ہے، ان کے ڈیڈ اور بزنس پارٹنر نے مل کر گیدرنگ رکھی ہے۔“  
”گڈ تو اس نے تمہیں اس گیدرنگ میں انوائٹ نہیں کیا؟“

”وہ مجھے کیسے انوائٹ کر سکتی تھی، اس کی فیملی میں تو کسی کو میرے بارے میں پتا ہی نہیں ہے۔“

”اوہو، اسے کسی نہ کسی سے تو شیئر کرنا ہی چاہیے۔“  
”اچھو نیلی میں تو اپنی مام سے سب کچھ کہہ دیتا ہوں، لیکن اس کی تو مام ہی نہیں ہیں، وہ کس سے شیئر کرے؟“

”جن بچوں کے باب نہیں ہوتے، انہیں مائیں سمیٹ لیتی ہیں، لیکن اگر مائیں نہیں رہتیں تو وہ بہت اکیلے رہ جاتے ہیں۔“

”ہیں اور آپ کو پتا ہے اس کے ڈیڈ نے تو دوسری شادی بھی کر لی ہے۔“

”یہ تو انہوں نے اچھا ہی کیا، کیونکہ ڈیڈ کو بھی تو آخر کسی کی ضرورت ہوگی نا۔“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“  
اس نے لائیلی سے کندھے اچکائے۔

”یہ تو تم نے سنا ہو گا نا، کہ دنیا میں ہر کوئی کسی نہ کسی کے لئے ہے؟ کیونکہ ہر کسی کو کسی کی ضرورت ہوتی ہے، یہی نا۔“

”گڈ، جب تم اسٹیمپلش ہو جاؤ گے تمہاری شادی ہو جائے گی، تب تمہاری مام بھی تو اکیلی رہ جائیں گی نا؟“

”میں مام کو اکیلا نہیں ہونے دوں گا، میں اسٹیمپلش ہو جاؤں گا تو ہم پاکستان نور پر جائیں گے تب تک مام کی جاب بھی میچور ہو جائے گی، ہماری پالیسی بھی مل جائے گی ہم ایک لکڑی فلیٹ خریدیں گے، شادی کا نمبر تو بہت بعد میں



آتا ہے اور مام کہتی ہیں، ابھی بہت وقت پڑا ہے، ابھی تو مجھے بہت کچھ کرنا اور بننا ہے۔“

”وہ ٹھیک کہتی ہیں، ابھی تمہیں صرف اپنی اسٹڈی پر دھیان دینا چاہیے۔“

”ہاں! مین اب میں بڑا ہو گیا ہوں نا اور رجاء سے وعدہ بھی کر چکا ہوں اور کٹ منٹ کسی حال میں توڑنی نہیں چاہیے، اس طرح ریپو قرا ب ہوتی ہے نا۔“

”یہ بھی تمہاری مام کہتی ہوں گی۔“ تیسور نے سگار نکال کر سلگایا۔

”نہ آئے۔“

ہارٹ فچنگ لڑکی کے راگ الاپتے رہے ہو، کہیں کوئی ایسی لڑکی تمہارے دل کو نہ چھو جائے جو تمہارے لئے سوٹ ابل نہ ہو۔“

کے قادر نے دوسری شادی کر لی ہے پھر تو وہ ضرور ایسا محسوس کرتی ہوگی۔“



اور والدین کو اک دوسرے کی طرف کھینچتا ہے۔  
 ”یو آر رائٹ، باب کے لئے تو میں کچھ نہیں  
 کہہ سکتا، لیکن مام کے لئے مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔“  
 ”لیکن تم نے کبھی سوچا، جس طرح تم نے  
 اکثر باپ کی کمی فیل کی اسی طرح سارہ بھی اپنے  
 اندر خالی پن یا کسی کی ضرورت محسوس کرتی ہو۔“  
 ”آئی ڈونٹ تھنک سو۔“ اس نے شدد و  
 سے سر ہلایا۔

”مجھے نہیں لگتا کہ انہیں میرے سوا کسی کی  
 ضرورت ہے۔“  
 ”تم نے کبھی پوچھا؟“

”مجھے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، مام  
 کہتی ہیں جب وقت گزرتا ہے تو تب کچھ بدلتا  
 ہے، کہیں کمی ہوتی ہے تو کہیں اضافہ بھی ہوتا  
 ہے۔“

”سارہ نے تمہیں پازینو اور اسٹرانگ سوچ  
 دی ہے، تمہاری سوچ، تمہاری توجہ سے کہیں زیادہ  
 ہے، مگر یاد رکھنا، زندگی بھی رکتی نہیں ہے، چلتی  
 رہتی ہے، کبھی کوئی پھرتا ہے تو کہیں کچھ نئے  
 رشتوں کا اضافہ بھی ہوتا ہے، انسان کی زندگی میں  
 تب کوئی درکھل جائے، کوئی نہیں کہہ سکتا۔“

”یو آر رائٹ، مام کی طرح آپ کی بھی  
 لائف پر گہری نظر ہے، لیکن آپ یہ سب کیوں  
 پوچھ رہے ہیں انکل۔“ اس بار وہ ہنک گیا تھا۔

”میں نے بھی لائف کے لئے بہت  
 Struggle کی ہے، میں بھی رشتوں کی کمی فیل  
 کرتا تھا اور کرتا ہوں اور اب بھی زندگی میں کسی  
 بھی نئے رشتے کو ویلکم کے لئے تیار ہوں۔“

”یس، لگتا ہے کہ یو آر اے سیلف میڈ  
 پرسن۔“ شیریں ان کی بات کی گہرائی کو نہ جانچ  
 سکا۔

☆☆☆

”لوگ کہتے ہیں مرد کا ساتھ عورت کو مضبوط  
 بناتا ہے، لیکن مرد کا نہ ہونا عورت کو اور زیادہ  
 مضبوط کر دیتا ہے۔“ اس روز سارہ کو انہوں نے  
 آف کے بعد، اس کے آفس کی بلڈنگ تلے  
 Pick کیا تھا۔

”وہ مضبوط ہوتی ہے، یا مضبوط پوز کرتی  
 ہے؟“ تیمور نے پہلا مونڈ کاٹا۔

”بات تو ایک ہی ہے، کم از کم اپنی جنگ تو  
 جیت ہی جاتی ہے۔“

”مجھے حیرت ہوتی ہے، تم جیسی مکمل لڑکی،  
 کبھی کسی سے محبت تک نہ کر سکتی۔“

”ہاں اور اگر مجھے کسی سے محبت نہ ہو سکی، تو  
 کسی اور کو ہی مجھ سے محبت ہو جاتی، ایسا بھی نہیں  
 ہوا۔“

”لیکن اب تو ایسا ہو گیا ہے۔“ تیمور نے  
 مسکراتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہاں لیکن وقت تو گزر گیا نا۔“  
 ”یہ تم سے کس نے کہا؟“

”جب سب لوگ ایک ہی بات کہیں تو مان  
 لینا چاہیے کہ وہ بات ٹھیک ہی ہے۔“

”یہ کسی کتاب میں درج نہیں ہے۔“ تیمور  
 کی بات پر وہ کچھ لا جواب سی نظر آنے لگی تھی،

”تم اتنی دلکش اور مکمل لڑکی ہو کہ اک نظر  
 تمہیں دیکھ کر بھی کوئی بھول نہیں سکتا۔“

”میرا کیش ختم ہو گیا ہے، مجھے بینک پہ اترنا  
 ہوگا، آپ کو جلدی تو نہیں ہے؟“ کار بینک کے  
 سامنے سے گزرتی تو سارہ کو یاد آیا۔

”اب تو میری دنیا تم سے شروع ہو کر تم ہی  
 پر ختم ہے سارہ۔“ انہوں نے کار روک دی، وہ کار  
 سے اتر کر بھاگتی دوڑتی، ٹریفک سے بچتی بچاتی،  
 روڈ کے اس پار تک گئی تو تیمور اپنی کار کی کھڑکی  
 سے ایک ٹک انگویت کے عالم میں اسے دیکھتے

چلے گئے تھے، وہ نورانی واپس آگئی تھی۔  
 ”کیش ختم ہو گیا، اسے لی ایم پر کچھ دیر لگے  
 گی۔“

”تمہیں کتنا کیش چاہیے، یا پھر کہیں  
 چلتے ہیں۔“

”اُس اوکے، میں کل صبح آفس جاتے  
 ہوئے لوں گی۔“

”ایک تو تم اچھی بہت ہو، اتنی اچھی ہو دل  
 چاہتا ہے کہ۔۔۔۔۔“

”کہ دو ہوتیں۔“ اس کے سرعت سے جملہ  
 اچکنے پر وہ بے ساختہ ہنس دیئے تھے۔

”کیریکٹ۔“ انہوں نے کی انیشن میں  
 گھمائی۔

”وہیے تمہیں بھوک تو نہیں لگ رہی؟“  
 ”جی نہیں، میں انسان تھوڑی ہوں، گھاس  
 جیتی ہوں۔“ وہ اس بار پھر خوش دلی سے ہنسنے

تھے اور کروڑا آداری کی طرف مڑ گئی۔  
 ☆☆☆

شیریں میرس پر کھڑا تھا، جب ریڈ کروڑا داغی  
 دروازے پر رکی، اس کی نظر فرنٹ ڈور کھول کر

برآمد ہوئی سارہ کے چہرے پر ٹھہر کر رہ گئی تھی،  
 کچھ ہی دنوں میں سارہ کی شخصیت میں اک انوکھا

سانکھارا کہ حسین تبدیلی نظر آنے لگا تھا، اس نے  
 فرنٹ ڈور کی کھڑکی سے جھک کر کچھ کہا اور پھر

دھیرے سے ہنسی۔  
 سارہ اور تیمور کے درمیان تہمتیں بڑھ رہی

تھیں اور یہ کوئی کہنے والی بات نہ تھی، مگر اسے لگتا  
 اس کے اندر کا کوئی گوشہ دھیرے دھیرے سسک

رہا ہے، کہیں کچھ ٹوٹا تھا اور دور تک بھرتا چلا گیا  
 اس نے کلائی مونڈ کے وقت دیکھا، رات کے دس

بج رہے تھے، وہ دھیمے قدموں سے نیچے اتر آیا،  
 گھر میں داخل ہوتے ہی سارہ کی نظر اس پر

پڑی۔

”ہائے شیریں تم ابھی تک سوئے نہیں؟“  
 ”آپ کا ویٹ کر رہا تھا مام ڈنر کے لئے۔“

”اوہ شیریں تم نے ابھی تک ڈنر نہیں کیا؟“  
 ”اس سے پہلے بھی کیا ہے؟“

”اوہ مائی گاڈ۔“ اسے سچ سچ دکھ ہوا، تیمور  
 کی سنگت میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا

تھا اور واپسی میں وہ ٹریفک جام میں پھنس گئیں،  
 کا ش اسے اک کال ہی کر دیتیں۔

”پلیز تم کھانا لگاؤ، میں پیچھ کر کے آتی  
 ہوں۔“

پھر وہ صرف شیریں کا ساتھ دینے کے لئے  
 ٹیبل پہ بیٹھی تھی، خلاف طبع، سلو اور برائے نام ہی

کھاتی رہی، تو شیریں نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔  
 ”مجھے بھوک نہیں ہے مام، اپنے روم میں جا

رہا ہوں۔“ سارہ اک تاسف سے اسے دیکھتی رہ  
 گئی تھی اور وہ اپنے روم میں چلا آیا۔

شیریں نے اپنا روم لاک کر کے اک نمبر پیش  
 کیا تھا، رجا سے کچھ کہے بغیر اسے کہاں قرار تھا

اور وہاں رجا کی وہی نسلی آہیز باتیں۔  
 ”اوہ شیریں اب تم بچے نہیں ہو، کہ تمہیں ہر

قدم پر ان کی انگلی تھامنی پڑے، آفٹر آل ان کی  
 بھی ایک لائف ہے کہ نہیں؟“

”میں نے زندگی میں پہلی بار مام کو اتنا کھل  
 کر ہنسنے دیکھا ہے، تمہیں پتا ہے وہ ہر روز آفس

سے لیٹ آنے لگی ہیں اور آج تو وہ ڈنر بھی ان  
 کے ساتھ کر کے آئیں، میں ویٹ ہی کرتا رہا۔“

”سوہاٹ شیریں زندگی کی خوشیوں پر ان کا  
 بھی حق ہے، وہ اگر اپنی زندگی جینا سیکھ رہی ہیں تو

تمہیں ان کی خوشی میں خوش ہونا چاہیے۔“  
 ”رجا۔۔۔۔۔ یہ سب۔۔۔۔۔ یہ سب تیمور انکل

کی وجہ سے ہے، وہ تیمور انکل کے لئے مجھے



Avoide کرنے لگی ہیں اور تمہیں پتا ہے، تیمور انگل مجھ سے کیا کہہ رہے تھے؟ کہ مام خود میں ادھورا پن قیل کرتی ہیں، انہیں یہ سب کیسے پتا؟ نہیں رجا، یہ جسٹ فرینڈ شپ نہیں ہے، مجھے لگتا ہے وہ تیمور انگل کے لئے سرکس ہو رہی ہیں وہ مجھ سے بہت کچھ چھپانے لگی ہیں رجا، دس از ناٹ فینر۔

”ٹیک اسٹ ایزی شیری، پلیز ٹیک اسٹ ایزی۔“ شیری اتنا بکھرا ہوا شکستہ سا لگ رہا تھا کہ رجا کو بھی لفظ کم پڑ گئے۔

☆☆☆

”تم نے جان بوجھ کر جوشن کو الجھا دیا ہے، بغیر اس سے کچھ کہے سنے، تم نے شیری کو ایٹو بنا کر رکھا ہوا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے، شیری ڈسٹرب ہو رہا ہے، اسے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔“

”تو تم اس سے سب کچھ کہہ کیوں نہیں دیتیں؟“

”کسی عورت کا بیٹا جوان ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ زندگی اس کے لئے ختم ہو گئی ہے۔“

”یہ اتنا آسان نہیں ہے تیمور، اس اتج کے لڑکے جذباتی ہوتے ہیں، وہ کچھ کرنے بیٹھے، اسے شاک لگے گا۔“ سارہ کی آواز پر شیری کے قدم سارہ کے روم کے باہر تھم گئے تھے۔

”تم غلطی کر رہی ہو سارہ، یو آر اسیسولوٹی رائگ، تم نے اس کی خاطر اپنے لئے نہیں سوچا، اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم بھی اپنی اپنے لئے نہیں سوچو۔“

جب مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، مجھے تمہارا ساتھ، تمہارا پیار چاہیے بس۔“

”اس سے سب کچھ کہہ دینا اتنا آسان نہیں ہے تیمور، پلیز ٹرائی تو انڈر اسٹینڈ۔“

”تم مجھ سے شادی کر لو گی، تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی، زندگی کے لمحے لمحے میں اسے یہ جتا کہ تمہاری لائف صرف اس کے نام ہے، اس پر تمہاری زندگی ختم ہے، تم یہ بات اس کے دماغ میں بٹھا چکی ہو، اسے اسٹر انک بنانے کے لئے تم نے خود اپنے آپ کو کمزور کر لیا ہے، کچھ سالوں میں وہ اسٹیمپش ہو جائے گا، اس کی اپنی زندگی شروع ہو جائے گی تو اسے تمہاری انگلی پکڑ کر چلنے کی ضرورت نہیں رہے گی، تب..... تب تمہیں میری بات یاد آئے گی جب تم اکیلی رہ جاؤ گی سارہ اور اس وقت تمہارا ہاتھ تھامنے والا کوئی نہ ہوگا۔“

”میں بہت پہلے، خود یہ زندگی کا دروازہ بند کر چکی ہوں۔“

”اور یہی تمہاری غلطی ہے سارہ، کہ تم نے کبھی خود کے لئے نہیں سوچا۔“

”دیکھو سارہ زندگی ایک بار ملتی ہے، محبت بھی ایک بار ہوتی ہے، اگر قسمت زندگی میں محبت کا رد کھول رہی ہے تو اسے اپنے ہاتھوں سے بند مت کرو۔“

”تیمور وہ ڈسٹرب ہو رہا ہے اور یہ نظر آرہا ہے، میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا، اس کا ایگری ہونا مشکل ہے۔“

”اس میں پرالم کیا ہے؟“

”تم جیسی چھپ چھپ کر رونے والی لاکھاں ہوتی ہیں، یہ بظاہر کتنی بھی مضبوط اور بہادر نظر آنے کی کوشش کرتی رہیں، ان کے اندر ایک دنیا ہوتی ہے اس دنیا میں ان کے خواب اور خواہش ہوتی ہیں پلیز اس دنیا کو مت اجاڑو، تم نے شیری کو بغیر کسی سہارے کے پال لیا، لیکن شیری کو تو سہارے کی ضرورت ہو سکتی ہے نا، اگر اس نے بھی کہا نہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے کسی ٹیل بھی نہ کیا ہو، اینڈ آئی ایم شیور میں اس کی کمی پوری نہ بھی کر سکا تو اس کا اجماد دوست ہونے کی کوشش ضرور کروں گا، پلیز ہمت کرو میری خاطر اگر تم کچھ نہیں کہو گی تو میں تمہارے جاؤں گا۔“

”وہ میری زندگی بھر کا حاصل ہے تیمور، میں اسے نہیں کھو سکتی، آپ نہیں جانتے، وہ ان دلوں کتنا Senstive نظر آنے لگا ہے۔“

”اور میں تمہیں نہیں کھو سکتا سارہ، کبھی نہیں، یاد رکھنا۔“ تیمور کے ٹوٹے قدموں کی آہٹ پر شیری دیوار کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔

☆☆☆

”کیا..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو رجا، تمہارے ڈیڈ نے تمہاری شادی کی ڈیٹ فکس کر دی اور تم مجھے اب بتا رہی ہو؟“

”میں نے تمہیں بتایا تو تھا، ان کے بزنس پارٹنران کی کیا ڈیلنگ چل رہی ہے مجھے خود پتا نہ تھا۔“

”رجاء..... رجاء..... پلیز..... دیکھو تمہیں پتا ہے نا، ابھی میری اسٹڈی کمپلٹ ہونے میں کچھ سال ہیں، آفٹر آل شادی تو میں نے تم ہی

سے کرنی ہے تب تک..... پلیز..... پلیز تم کسی طرح، انہیں بینڈل کر لو، کچھ پانے کے لئے کچھ کھانا تو پڑتا ہے نا۔“

”میں سمجھتی ہوں، مگر ڈیڈ نہیں سمجھتے شیری، ان کے اپنے پیچھے ہیں، تم اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ تب بھی یہ ایک بزنس ڈیلنگ، دس سال بعد بھی وہ میری شادی تم سے نہیں کر سکتے، تمہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں وقت لگے گا اور ڈیڈ کو، اپنے پیچھے اسی طرح حاصل ہو سکتے ہیں۔“

”تم رجا..... یہ تم کہہ رہی ہو، نہیں رجا تم ایسا نہیں کر سکتیں۔“ شیری کا لہجہ ٹوٹ گیا تھا، بے یقینی سے۔

”ہاں شیری میں ایسا نہیں کر سکتی، لیکن مجھے ایسا کرنا ہو گا، جب انسان کے ایک سمجھوتے سے، سب کچھ برابر ہو جائے سب کو خوشیاں مل جائیں تو اسے وہ کپرو مائیز کر لینا چاہیے، پلیز شیری ٹرائی تو انڈر اسٹینڈ، وہ میرے ڈیڈ ہیں، میرے لئے فیصلہ لے سکتے ہیں، یہ زندگی ہے اور زندگی ہماری مرضی کے مطابق ہو، یہ ہو نہیں سکتا، انسان اس زندگی میں بہت کچھ حاصل کرتا ہے، تو بہت کچھ کھوتا بھی ہے، رشتے بھی، کبھی ہم سے بہت کچھ مانگتے ہیں اور ہمیں دینا پڑتا ہے شیری۔“ شیری کو لگا اس کے اندر ٹوٹ کر کچھ دور دور تک بکھرتا چلا گیا ہے۔

☆☆☆

”تم آج یونیورسٹی نہیں گئے شیری۔“ فریج سے پانی کی بوتل نکال کر غنا غٹ چڑھاتی شیری کی نظروں میں اک اضطراب تھا، بے ترتیب لباس میں اس کا سارا وجود بکھرا ہوا لگ رہا تھا۔

”یہ آپ پوچھ رہی ہیں مام، آپ کو نہیں پتا، آج رجا کی شادی ہے، اک دو روز میں وہ فلائی



کر جائے گی؟“

”مجھے پتا ہے شیری، لیکن تم بھول رہے ہو، کہ تمہیں ہارنا نہیں ہے، تم اگر ٹوٹ بھی جاؤ تو بکھرنا نہیں ہے، کیونکہ میں نے تمہیں اک مضبوط انسان بنایا ہے۔“

”میں آئی نو مام، لیکن ٹوٹ کر سنبھلنے میں وقت تو لگتا ہے نا۔“ سارہ نے اس کے قریب آ کر دھیرے سے اس کا شانہ تھاما۔

”شیری جب رب انسان سے کچھ لیتا ہے نا، تو اس سے کہیں زیادہ اسے عطا کرتا ہے، بلیو می۔“ شیری کی نظروں میں کروٹیں لیتا اضطراب کئی گنا بڑھ گیا تھا، سارہ کو لگا کسی بھی پل وہ اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر زودے گا، مگر اس نے خود کو سنبھالے رکھا۔

”یو آر رائٹ مام، میرے پاس آپ ہیں، جو میرے لئے سب سے بڑھ کر ہیں۔“

”تو پھر آؤ، ٹینس کھیلتے ہیں۔“

”شیور۔“ وہ ریکٹ سنبھالے، گھر کی داخلی احاطہ کی باتیں جانب نیٹ کی جانب بڑھ گئے تھے، مگر شیری ڈسٹرب تھا، ٹشل کا ک بار بار اس سے مٹ ہو رہی تھی، اسی رات تیور نے اسے بیٹھ کر کافی دیر سمجھایا تھا۔

”جو فیصلے محبت کے قہر و آؤٹ کیے جاتے ہیں وہ صرف جذباتیت ہوتے ہیں، لیکن زندگی سے اگر محبت کو مائنس کر دیا جائے تو باقی صرف Struggle بچتی ہے اور وہ سارہ نے تمہارے لئے تمہیں اسڑانگ بنانے کے لئے کی ہے، تمہارے فادر نہیں، لیکن مام تو ہیں نا، لیکن مام کی تو مام بھی نہیں ہے، تمہیں سب سے پہلے اس کے لئے سوچنا ہے۔“

”سو وہاٹ انکل، مام نہیں تو میں تو ہوں نا۔“ اس کا لہجہ سنجیدہ و گہمیر تھا۔

”کیریکٹ یہی تمہیں یاد رکھنا ہے، اس خوشی تمہاری خوشی میں ہے، چیز آپ، بوائے۔“ انہوں نے شیری کا کندھا تھپتھپایا۔

”تمہیں ڈسٹرب پا کر وہ بھی ڈسٹرب ہیں اس کی خاطر خود کو سنبھالو۔“ اس روز انہوں نے اک اور شام انجوائے کی، یا کم از کم پوز تو یہی رکھا، اگرچہ ماحول میں اک گہمیرنا آگ کھنچاؤ رہا۔

☆ ☆ ☆

سارہ نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ لیپ آن کیا پھر موبائل پر نظر پڑی تو ہڑ برا کر اٹھ بیٹھی، غلٹ میں بال سینتے ہوئے شیری کو پکارا تو اگلے ہی پل وہ حاضر تھا۔

”میں مام۔“

”دس بج گئے ہیں، تم پلیز تیور کو کال کرو آج میں لیٹ ہو جاؤں گی۔“

”لیکن آج تو سنڈے ہے مام، اس لئے الارم نہیں بجا۔“

”او مانگی گا ڈیں تو بھول ہی گئی۔“

”پھر تو آپ یہ بھی بھول گئی ہوں گی کہ سنڈے کو ہم اپنی ڈیوٹیز، ایکس چیجنگ کر لیتے ہیں۔“

”تو مجھے بالکل یاد ہے کہ اس سنڈے تمہارے کیور کا پنجرہ بنانا ہے۔“

”لیکن کیور تو میں نے آزاد کر دیئے ہیں مام، اچھا لگتا ہے نا، کسی کی فرسٹریشن دور ہو جائے، کسی کو آزادی مل جائے، مجھے لگتا تھا وہ کافی تکلیف میں ہیں۔“ اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ سارہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”یہ تم کس طرح کی باتیں کر رہے ہو شیری؟“

”آپ ہی نے تو کہا تھا مام، من مرضی کی

ازان سکھ دیتی ہے، بلیو می کہ وہ بہت ٹینس تھے، مکلی فضا میں سانس لی ہوگی، تو سکھ ملا ہوگا، ٹینس ریلیز ہو گئی ہوگی۔“ اس کے لہجے میں اتنی سنجیدگی تھی کہ سارہ دنگ رہ گئی، سینے پر بازو لیٹے وہ انتہائی خطرناک انداز میں مخاطب تھا۔

”شیری تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”مام اگر تیور انکل نے آپ کو پروپوز کیا ہے تو پلیز آپ پر پوزل ایکسپٹ کر لیجئے۔“ سارہ نے اس میں آگئی تھی۔

”شیری!“ وہ صرف اتنا کہہ سکی تھی۔

☆ ☆ ☆

کمرے میں مکمل اندھیرا تھا، سارہ بیڈ کی پشت سے سر نکائے لیپ آن آف کر رہی تھی، جب شیری نے اس کے کمرے میں قدم رکھا۔

”آج آپ آفس نہیں گئیں مام۔“

”اک روز تمہیں جاؤں گی تو کیا ہو جائے گا۔“ اس کے چہرے پر انفریڈی کی چھاپ تھی۔

”آپ ٹھیک تو ہیں مام۔“

”ہاں بس کچھ ٹھکن سی ہے۔“ وہ اس بار نظریں چراہ گئی تھی۔

”آپ نظریں چراہی ہو مام، مجھ سے، اپنے بیٹے سے؟ آپ کو یاد ہے نا، آپ نے کیا تھا، اپنے بیٹے سے؟“

”آپ کو یاد ہے نا، آپ نے کہا تھا، جب انسان جھوٹ بولتا ہے تو نظریں چراہ لیتا ہے اور سچ بولتا ہے تو اس کی آنکھیں اس کا ساتھ دیتی ہیں۔“ اس کا لہجہ جتنا ہوا سوا تھا۔

”تم کچھ زیادہ ہی سوال نہیں کرنے لگے ہو شیری۔“ وہ اس بار چڑ گئی تھی، مگر شیری اس کے نزدیک جا بیٹھا۔

”مام یہ آپ ہی نے کہا تھا، ہماری زندگی کا ہر بس اور نو کہیں اوپر سے ہوتا ہے اور جب ہم کسی

کو اس بس اور نو سے ہٹ کر رد کرتے ہیں تو ڈسٹرب ہو جاتے ہیں، کہہ دیجئے مام، جو کچھ آپ کے دل میں ہے کہہ دیجئے، اپنی ساری فرسٹریشن مجھ سے شیئر کر دیجئے، پلیز تاکہ آپ ریلیکس ہو جائیں۔“ سارہ کا موبائل بجنا تو شیری کی بات ادھوری رہ گئی، مگر اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے موبائل پر اک نظر تنک نہ ڈالی، بیڈ کی پشت سے سر نکائے ہنوز لیپ آن آف کرتی رہی، مگر موبائل بجنا ہی رہا۔

”آپ کا موبائل بج رہا ہے مام۔“

”اسے بجنے دو اور پلیز، مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“ اس نے ٹھکے ٹھکے لہجے میں کہتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں، جانے کتنا وقت بیتا تھا۔

مگر اگلی صبح جب وہ آفس کے لئے تیار ہو کر کمرے میں آئی تو قدرے پرسکون تھی، شیری تیر کی طرح اس کی طرف لپکا۔

”مام، میری فکر نہ کریں، مجھے اپنے زندگی جینے دیں، آپ اپنی زندگی کے بارے میں سوچیں۔“

”تم اتنے بڑے نہیں ہوئے ہو شیری کہ مجھے Advice کرنے لگو، سمجھتے تم۔“

”یو آر رائٹ مام، آفٹر آل آپ مجھ سے بڑھ کر زندگی پر نظر رکھتی ہیں، آپ نے مجھے سب کچھ دیا، بہت کچھ سکھایا، لیکن یہ نہیں بتایا کہ اگر انسان کی ایک اوکے سے کسی کو خوشیاں مل جائیں سب کچھ برابر ہو جائے تو اسے وہ اوکے کر دینی چاہیے۔“ اس کے لہجے میں اک کرب تھا۔

”لیکن اگر اس اوکے سے کچھ بگڑتا یا بکھرتا ہو تو۔“

”میری زندگی تمہاری زندگی سے جڑی ہے شیری اس لئے، میں نے تیور کا پروپوزل ری فیوز کر دیا ہے، تم ڈسٹرب ہو اور یہ نظر آ رہا ہے، مجھے



پہلے ہی پتا تھا، تمہیں یہ اچھا نہیں لگے گا اور میرے لئے تمہاری زندگی تمہاری خوشی سے بڑھ کر کچھ نہیں۔“

”اور میری خوشی آپ کی خوشی سے جڑی ہے مام، کچھ وقت لگتا ہے، شاید میں بھی سنبھل جاؤں گا۔“ اس نے اذیت سے لب بھینچے۔

”شیری پلیر نو آریو منٹس تمہیں پتا ہے میں اپنے فیصلے بدلائیں کرتی، آج تیمور نہیں آئیں گے، تم ذرا ٹیک کے لئے کہہ دو۔“ سارہ کی بات درمیان میں تھی کہ صدر دروازے کے اس پار تیمور کی کار کا ہارن بجا۔

”لیکن وہ تو آگئے ہیں مام۔“ اس کا انداز سنجیدہ اور کچھ جتنا ہوا سا تھا، سارہ نے اک ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

”اگر میرے ایک سرینڈر، ایک سمجھوتے سے آپ کو خوشاں مل سکتی ہیں تو کیا میں وہ کپڑے واپس نہیں کر سکتا، نہیں مام، میرے لئے آپ کی خوشی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے، کچھ بھی نہیں، آئی ری کوسٹ یو مام، یہ ایک گولڈن چانس ہے میری خاطر اس گولڈن چانس کو کس نہ کریں۔“

”ہر بات کا اک وقت ہوتا ہے اور جب وہ وقت گزر جائے تو وہ بات بے معنی ہو جاتی ہے۔“ وہ جیسے ہار رہی تھی۔

”نہیں مام، یہ کسی کتاب میں نہیں لکھا ہے، اگر آپ نے اب تک اپنے لئے نہیں سوچا تو اب سوچے، قسمت کے دروازے بار بار نہیں کھلتے، زندگی میں بہت کچھ بے معنی بھی تو ہوتا ہے۔“ تیمور کی کار کا ہارن اک بار پھر بجاتا تھا، شیری نے ٹوٹے بکھرے شکستے سے انداز میں اپنے پیشانی پر بکھرے بال سینٹے تو اس کی نظروں میں اک اضطراب تھا۔

”پلیر مام آپ بہت لیٹ ہو رہی ہیں۔“

مگر سارہ نے بیگ سے موبائل نکال کر اک نمبر پیش کر دیا۔

☆☆☆

تیمور اسی شام سارہ کے سامنے تھے۔  
”تمہارا کیا خیال ہے تمہارے انکار کو میں سن کر خاموش ہو جاؤں گا اب جب کہ ہمارے درمیان اتنی اسٹراٹجی انڈر اسٹینڈ ٹیک ڈیولپ ہو چکی ہے، تم میرا پوزل ری فیوز کر رہی ہو، نہیں سارہ تم ایسا نہیں کر سکتیں، میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔“ ان کا لہجہ اتنا خطرناک تھا کہ سارہ خائف سی ہو کر رہ گئی۔

”کیونکہ مجھے پتا ہے کہ تمہارے انکار کی وجہ شیری ہے، کہہ دو، کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے، کہہ دو کہ تم نے بہت خوشی سے یہ انکار کیا ہے، بلیوی کہ میں کبھی پلٹ کر تمہیں دیکھوں گا بھی نہیں۔“

”تیمور پلیر، میں بہت ڈسٹرب ہوں، مجھے اور پریشان نہ کریں۔“  
”تم شیری کو ہوا بنا کر اپنے سر پر سوار کر لیا ہے، وہ تمہیں صرف اپنی پر اپنی سمجھتا ہے، مگر تم بھول رہی ہو سارہ، اسے خود سے قریب کر کے اس شادی تک لانے کے لئے میں نے بھی بہت کچھ کیا ہے، ٹھیک ہے تم نے اسے نہیں بتایا کہ تم اک کنواری لڑکی ہو، اس کی ماں نہیں تم نے ماں باپ بن کر اس کی پرورش کی یہ بھی کم نہیں، تم نے اسے اک کامیاب زندگی دی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم خود اپنے لئے اپنی زندگی کا ہر دروازہ بند کر لو، اس طرح تم نے اپنے ساتھ زیادتی کی ہے اور اب وہی زیادتی تم میرے ساتھ کر رہی ہو اور میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا سارہ، سناتم نے۔“

”ہی از ہیسو ٹوٹی رائٹ مام، یو آر ناٹ مائی

اون ہائی۔“ سارہ یکدم مڑی تھی اور اگلے ہی لمحے ہاتھ رکھ کر خوفزدہ انداز میں دو قدم پیچھے اٹلی، سامنے شیری تھا، اس کا سنجیدہ و خطرناک انداز، اتار رہا تھا، کہ وہ تیمور کا اک اک لفظ سن چکا۔

تیمور اسے پا کر پل بھر کے لئے ٹھٹھکے تھے، شیری کی آنکھوں میں آنسو، چہرے پر شکستگی و اذیت تھی، یکدم وہ بلا کی بے نیازی سے نظریں پھیر کر سارہ سے مخاطب ہوئے تھے۔  
”سارہ میں باہر ویٹ کر رہا ہوں۔“ وہ لاؤنج سے نکلتے چلے گئے تھے۔

”ہمارے درمیان اتنا فاصلہ تو کبھی نہیں تھا مام، کہ آپ کو مجھے کچھ بتانے کے لئے کسی تیسرے کا سہارا لینا پڑے، جتنا ٹرسٹ آپ نے مجھ پر کیا، جو بات آپ نے ان سے شیری کی مجھ سے کہیں تو کیا آپ مجھے کھودیتیں، نہیں مام میرا اور آپ کا رشتہ اتنا نازک اتنا کمزور نہیں ہے میری زندگی ہی ہیں میری خوشی بھی آپ کی خوشی سے جڑی ہے۔“ اس کے ٹوٹے لہجے میں اک اذیت کرب و اضطراب تھا۔

”اگر آپ مجھ سے صرف اتنا کہہ دیتیں، کہ آپ کو تیمور انگل کا ساتھ چاہیے تو آپ کی خوشی میں میری خوشی تھی۔“  
”شیری!“ سارہ اک قدم آگے بڑھی تھی۔  
”پلیر میری بات سنو۔“

”انس اوکے مام، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں کیا تھا، میرے لئے اپورٹنٹ یہ ہے کہ میں کیا ہوں اور میں جو کچھ بھی ہوں، آپ کی وجہ سے ہوں اور یہ بات میں کبھی نہیں بھول سکتا۔“ داخلی دروازے کے اس پار تیمور کی کار کا ہارن بجاتا تھا۔

”جائے مام، آنے والا لائف آؤٹینگ فار

یو۔“ شیری نے آگے بڑھ کے دروازہ کھولا تھا۔  
”نہیں شیری میرے لئے تم اور تمہاری خوشی دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر ہے، میں تمہیں چھوڑ کے نہیں جاؤں گی، میں نہیں جاسکتی۔“  
”پلیر مام، میری خاطر۔“ تیمور کی گاڑی کا ہارن پھر بجاتا تھا۔

اس نے اک اک قدم مجبوراً بڑھایا، پھر دروازے تک آکر پلٹ کر دیکھا، اس کی نظروں میں اذیت، شکستگی تھی۔  
”زندگی اور اس کی خوشیوں پر آپ کا بھی حق ہے مام، پلیر مام، جائیے، جائیے مام۔“ سارہ نے پلٹ کر اک قدم بڑھایا۔

”مگر یہ مت بھولیے گا کہ مجھے اب بھی ہر قدم پر آپ کی ضرورت ہے۔“ شیری کے لفظوں میں اتنی بے چارگی اور اذیت تھی کہ سارہ مڑ کر تیر کی طرح لپکتی اس تک آئی تھی اور اس سے پلٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، شیری نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔

”Need you mam میری زندگی آپ کے بغیر ادھوری ہے۔“ عقب سے سارہ کے کندھے پر اک مضبوط لمس جاگا تھا، وہ پلٹی تو سامنے تیمور تھے۔

”اور مجھے تم دونوں کی ضرورت ہے۔“ انہوں نے بڑھ کر شیری اور سارہ کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا، زندگی چار سو مسکرا اٹھی تھی۔

☆☆☆





”سلوٹی اچھے بہت ڈر لگ رہا ہے اگر کسی  
”ارم نے یونورسٹی میں سلوٹی کے  
”ہارے میں جان کر کہا، تو سلوٹی  
”اگر تم ڈرو گی تا تو ضرور کوئی نہ کوئی دیکھ ہی  
”میرا تو ابھی سے طلق شک ہو رہا ہے۔“  
”ارم بولی۔“  
”تو جا کے پانی پی لو۔“  
”روزہ ہے میرا۔“  
”روزہ ہے نا، تو اللہ یہ بھروسہ رکھو وہ ضرور  
”واری مدد کرے گا۔“ سلوٹی نے سنجیدگی سے کہا۔  
”لو وہ سامنے سے آرہا ہے چاند، امجد کے  
”ساتھ۔“ ارم کی نظر سامنے سے آتے شیراز چاند  
”اور امجد پر پڑی تو کہنے لگی۔  
”تم ان دیکھا کرو انہیں اور لائبریری چلو

اس وقت لائبریری ہی اس کام کے لئے موزوں  
ہے کم آن۔“ سلوٹی نے آہستگی سے کہا اور اپنا  
بیگ جس میں لیپ ٹاپ اور موبائل تھا اٹھا کر  
لائبریری کی طرف بڑھنے لگی۔  
”وہ ادھر ہی آرہے ہیں۔“ ارم نے کن  
اکھیوں سے دیکھتے ہوئے بتایا۔  
”آنے دو بس لیپ ٹاپ اور موبائل ان  
کے پاس ہو۔“ سلوٹی بولی، دونوں لائبریری میں  
اپنی مخصوص جگہ پر آکر بیٹھ گئیں، امجد کو زرقاں لگی  
تھی اس لئے وہ اس کے ساتھ باتیں کرنے لگا،  
چاند لائبریری میں داخل ہو گیا، اس کی نظریں  
سلوٹی کو تلاش کر رہی تھیں اور سلوٹی کو معلوم تھا کہ  
وہ کہاں کھڑا ہے۔  
”یا اللہ پاک! ہمیں کامیابی سے نواز  
آمین۔“ سلوٹی نے دل سے دعا مانگی۔  
”میرے تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے

## ناولٹ

دوسرا اور آخری حصہ





ہیں۔“ ارم بولی۔

”خبردار اگر کوئی جھنڈ کیا ہو ورنہ میں تمہیں ٹھنڈا کر دوں گی۔“ سلوٹی نے اسے گھورتے ہوئے دھمکایا۔

”تو یہ ہے اب تم تو مت ڈراؤ۔“ ارم مسکین سی صورت بنا کر بولی تو سلوٹی بولی۔

”اچھا بھلا نامت ورنہ ساری کیم خراب ہو جائے گی۔“

”اوکے میں جاؤں کتاب ڈھونڈنے؟“

”چاند کو تو یہاں آنے دو۔“ سلوٹی نے سرگوشی کی۔

”اتنے سارے اسٹوڈنٹس ہیں اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟“

”تو میں نے ادھر ہی تمہاری پٹائی شروع کر دی ہے۔“ سلوٹی نے دانت پس کر کہا۔

”تھانیدارنی کی طرح بی بیو کر رہی ہوں۔“ ارم نے منہ بسورا۔

”چپ وہ آ رہا ہے ادھر ہی۔“ سلوٹی نے کہا تو وہ پلان کے مطابق خود کو تیار کرنے لگی۔

”ہائے گرلز۔“ چاند نے ان کی میز پر آکر مخاطب کیا۔

”بس رہنے دو، تم تو بات مت کرو مجھ سے ذرا سا کام کہا تھا وہ بھی نہ ہوا تم سے۔“ سلوٹی نے ناراض لہجے میں کہا۔

”ہاں کیا ہوا میں لیپ ٹاپ لایا تو ہوں یہ لو کر لوائی میل۔“ چاند سمجھا کے وہ ای میل نہ کر سکنے پر غصہ ہے فوراً ہی اپنا لیپ ٹاپ بیگ سے نکالا اور اس کے سامنے رکھ دیا۔

”ٹھیکس چاند، مگر میں تم سے نہیں ارم سے کہہ رہی تھی ایک کتاب ڈھونڈنے کو کہا تھا اس سے اسے مل ہی نہیں رہی حالانکہ چار روز پہلے میں نے لائبریری میں دیکھی تھی مگر اس وقت کسی نے

ایڈیٹر کرائی تھی، آج واپس آئی تھی اور لائبریریئن کہہ رہی ہے کہ ایک اور کاپی موجود ہے آپ ڈھونڈ لیں۔“ سلوٹی نے فوراً بات بناتے ہوئے کہا۔

”مجھے تو نہیں ملی اور یہ مجھ سے ناراض ہو رہی ہے۔“ ارم نے بتایا۔

”ہو سکتا ہے کسی اسٹوڈنٹ کے پاس ہو جو یہاں موجود ہیں میں دیکھتا ہوں۔“ چاند نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”پلیز ڈھونڈ دو“ ماہر نفسیات کی ڈائری“

”یک کا نام ہے۔“ سلوٹی نے اسے دیکھتے ہوئے ہنسی لہجے میں کہا۔

”ڈونٹ وری یار، میں ڈھونڈتا ہوں تم چل کرو، میری چیزیں ادھر ہی رکھی ہیں میں آتا ہوں کتاب لے کر۔“ چاند نے اپنا کالا چشمہ اور ایک کتاب بھی سلوٹی کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”تھینک یو سوچ۔“ وہ لشکر سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”مائی پلیشر۔“ چاند مسکرا دیا۔

”میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“ ارم بھی اس کے ساتھ ہو لی، سلوٹی نے ایک منٹ لگایا تھا، چاند کا لیپ ٹاپ اپنے بیگ میں رکھا تھا اور اس کے بیگ میں اپنا لیپ ٹاپ رکھ دیا تھا، اب موبائل فون تبدیل کرنا باقی تھا۔

”سلوٹی evo ہے تمہارے پاس، نیٹ کیسے آن کروں گی؟“ چاند دو چار منٹ بعد ہی واپس آ گیا تھا اور اس سے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں، ای میل تو میں نے ارم کے لیپ ٹاپ سے کر دی تھی، ای میل کا مسئلہ حل ہو گیا ہے ٹھیکس۔“ سلوٹی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اوکے گڈ۔“ چاند نے مسکراتے ہوئے کہا

اور لیپ ٹاپ بیگ میں رکھ لیا۔

”مجھے وہاں کھڑا کر کے خود یہاں آ گئے کتاب مل گئی ہے تو بتا دو مجھے۔“ ارم بھی اس کے پیچھے ہی چلی آئی تھی اور منہ بسور کر بولی، سلوٹی نے اسے اشارہ کر دیا تھا کہ کام ہو گیا ہے۔

”ارے بھی نہیں ملی کتاب آ رہا ہوں میں چلو تم۔“

”میں نہیں جا رہی روزے میں اتنی دیر نہیں کھڑی رہ سکتی میں، تم خود ہی ڈھونڈو۔“ ارم منہ بنا بولی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

”بہت ہی تک چڑی دوست ہے تمہاری۔“ چاند نے سلوٹی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ہے تو۔“ سلوٹی نے شرارت سے مسکراتے ہوئے ارم کو دیکھا تھا۔

”کیا کیا کہاتم نے؟“ ارم چیخ اٹھی۔

”تم اسے سنبھالو میں آتا ہوں کتاب ڈھونڈ کر۔“ چاند نے ہنس کر سلوٹی سے کہا اور تیزی سے جانے کے لئے مڑا ہی تھا کہ دوسری جانب سے آتے ہی اسٹوڈنٹ سے ٹکرا گیا، اس کے ہاتھ میں کتابیں تھیں جو ٹکرانے سے نیچے گر گئیں، سلوٹی اور ارم نے میز پر رکھی کتابیں بھی بھانے سے نیچے گرا دیں کہ کسی کو پتا بھی نہیں چلا اسی حکم پیل اور ٹکراؤ میں چاند کے ہاتھ سے اس کا موبائل چھوٹ کر گر گیا تھا اور ارم نے لپک کر اٹھ لیا تھا، سلوٹی نے قریب آ کر اس کے ہاتھ سے موبائل لیا اور چپکے سے وہاں سے باہر نکل آئی اور لان میں بیٹھ کر بڑی ہوشیاری سے اس نے چاند کے موبائل فون سے سم نکال کر ویسے ہی اپنے ساتھ لائے ہوئے موبائل میں لگا دی اور سیل آن کر کے وہی رنگ ٹون سیٹ کر دی جو چاند کے موبائل پر سیٹ پر آن تھی یہ سب اس نے اس لئے کیا تھا کہ چاند کو شک نہ ہو کہ اس کا موبائل

فون تبدیل ہو گیا ہے، یہ سب کرنے کے بعد وہ دوبارہ لائبریری میں آ گئی، وہاں ابھی تک چاند اور ٹکرانے والے اسٹوڈنٹ کے درمیان توں توں میں میں ہو رہی تھی، ارم کو اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کام ہو جانے کا اشارہ کیا تھا اور چاند کا موبائل اسی میز کے نیچے رکھ دیا جہاں وہ کھڑا تھا اور اس کے گرد اسٹوڈنٹس کا ہجوم لگا ہوا تھا، اب جھگڑا چاند کا موبائل فون کم ہونے پر ہو رہا تھا، کسی نے کہا کہ اپنے موبائل فون پر مسڈ کال دے کر چیک کر لو کہ موبائل کہاں گرا ہے، اس دوران سلوٹی تیزی سے باہر گئی اور یونیورسٹی کے باہر کھڑے وجاہت سعید کی گاڑی کو تلاش کیا وہ دائیں جانب ایک درخت کے سایے تلے گاڑی کھڑی کر کے بیٹھے ہوئے تھے، سلوٹی تیزی سے ان کی گاڑی کی طرف بڑھی وہ اسے آتے ہوئے دیکھ چکے تھے لہذا فوراً فرنٹ ڈور کھول دیا تھا۔

”یہ سنبھالیں موبائل اور لیپ ٹاپ کام ہو گیا ہے آپ یہ لے کر جائیں گھر ملتے ہیں۔“ سلوٹی نے دونوں چیزیں ان کی طرف بڑھا کر کہا تو وہ لیپ ٹاپ اور موبائل لے کر بولے۔

”اوکے ویری گڈ، آپ ساتھ نہیں جائیں گی؟“

”نہیں، میں اپنے وقت پر آؤں گی تاکہ کسی بھی چاند کو شک نہ ہو کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا ہاتھ کیا ہے، اوکے یہ امانت ہے آپ کے پاس ہائے۔“ سلوٹی اپنی بات مکمل کر کے گاڑی سے اتری اور یونیورسٹی میں واپس چلی آئی۔

☆☆☆

یاسر کی کال سلوٹی کے موبائل پر آ رہی تھی، غنوی کی نظر پڑی تو غصے کی لہر اس کے تن بدن میں دوڑ گئی، سلوٹی عصر کی نماز ادا کر رہی تھی۔

”شٹ نہ کہا بکواس سے میرے موبائل فون



سے سارا ڈیٹا اڑ گیا یہ کیسے ممکن ہے؟“ چاند نے رات کو فری ہو کر اپنے سیل فون کا حسب عادت جائزہ لیا تو گیلری سے لے کر فیس بک سب غائب تھا وائس ایپ آن کیا تھا کیونکہ سلوٹی نے انسٹال کر دیا تھا اسی کے نمبر پر آن تھا پہلے بھی، وہ حیران پریشان اپنے موبائل کو بار بار چیک کر رہا تھا، سلوٹی نے سیم ویسا ہی موبائل خریدا تھا جتنا، لہذا اسے شک اتنی جلدی ہونے والا نہیں تھا۔

”شاید نیچے گرنے کی وجہ سے میرے سیل فون میں یہ مسئلہ ہوا ہے اب پھر سے فیس بک انسٹال کرنا پڑے گی۔“ چاند نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا اور اپنا فیس بک اکاؤنٹ بنانے لگا، ابھی تو اس کا دھیان اپنے لپ ٹاپ کی طرف نہیں گیا تھا ورنہ ایک اور دھچکا لگتا اسے اور شک بھی ہو جاتا کہ یہ کوئی حادثہ نہیں ہے کسی کی سازش اور پلاننگ ہے۔

☆☆☆

افراء، رمشا اس وقت سلوٹی کے گھر موجود تھیں اور سلوٹی کی ہدایت کے مطابق دونوں عبا یا پہن کر چہرہ چھپا کر کتے میں بیٹھ کر اس کے گھر آئیں نہیں تاکہ چاند یا اس کے دوستوں میں سے کسی کی نظر نہ پڑے ان پر کیونکہ چاند اسی کالونی میں رہتا تھا اور ان دونوں کو ان کے اصل حلیے میں دیکھ کر وہ شک میں پڑ سکتا تھا، اسی لئے سلوٹی نے ان کو عبا یا پہن کر چہرہ چھپا کر آنے کی سختی سے تاکید کی تھی۔

”سلوٹی! یو آر جینس تم نے یہ کام کر دکھایا میں کس منہ سے تمہارا شکر یہ ادا کروں۔“ افراء خوش اور تشکر سے روتے ہوئے بولی۔

”شکر یہ مت کہو بس خود کو بدلو آئندہ کسی کی باتوں میں مت آنا اور خدا را اپنا پہناؤ تبدیل کرو یہ آدھا، ادھر وہ لباس تمہیں دیکھنے والوں کو دعوت

گناہ دیتا ہے اور تمہیں کتنا گناہ ملے گا کچھ احساس ہے تم دونوں کو؟ بدلو خود کو اللہ سے معافی مانگو، توبہ کرو، یہ ماہ رمضان ہے اس میں تو اللہ کی نعمتیں، برکتیں اور رحمتیں نازل ہوتی ہیں، تم دونوں اگر سچے دل سے معافی مانگو تو اللہ تعالیٰ نہ صرف تمہیں معاف کر دیں گے بلکہ تمہاری پریشانیاں بھی ختم کر دیں گے تمہارے لئے آسانیاں پیدا کریں گے۔“ سلوٹی نے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے سمجھایا۔

”تم بہت اچھی ہو سلوٹی! ہم نے ہی تمہیں سمجھنے میں غلطی کی ہمیں معاف کر دو اور یہ سب ڈیلیٹ کر دو۔“ رمشا نے روتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”فکر نہ کرو یہ سب ڈیلیٹ ہو جائے گا ابھی چاند کو سزا دلوانے کے لئے یہ ثبوت ضروری ہیں، انشاء اللہ اسی جتنے چاند ماند پڑ جائے گا اب تم دونوں جاؤ فون پر بات ہوگی اور ہاں اپنے سیل فون بھی چیک کر رکھو۔“ سلوٹی نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

”اوکے، تھینک یو سو مچ اگین یو آر گریٹ۔“ افراء نے اس کے گلے لگ کر کہا تو سلوٹی مسکراتے ہوئے بولی۔

”گریٹ تو اللہ تعالیٰ ہیں جنہوں نے یہ کام آسان کیا۔“

”بے شک مگر وسیلہ تو تم بنی ہونا، اللہ تمہیں ہمیشہ خوش اور کامیاب رکھے۔“ رمشا نے بھی اس سے گلے ملتے ہوئے دل سے دعا کی۔

”آمین!“ سلوٹی مسکرا دی۔

”چلی گئیں تمہاری سہیلیاں؟“ صائمہ بیگم نے سلوٹی کو دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”جی امی۔“

باتیں۔“

”امی! وہ لڑکیاں نماز، روزے والی نہیں تھیں کے انہیں افطار تک روکا جاتا، وہ تو بہت ہی باذن اور بے حیا لڑکیاں ہیں لڑکوں کے ساتھ انہیں زچل رہے ہیں ان کے۔“ غنوی نے جلتے ہوئے لہجے میں بتایا، سلوٹی کو اس کی سوچ پر افسوس ہونے لگا۔

”سلوٹی یہ میں کیا سن رہی ہوں، تمہاری دوستی اس قسم کی لڑکیوں سے بھی ہے کیا ہوتا جا رہا ہے تمہیں؟“ صائمہ بیگم نے دکھ سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”امی! صبح کا بھولا اگر شام کو گھر لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے، وہ بدل چکی ہیں آپ نے دیکھا ہی تھا ان کا حلیہ اور توبہ کے دروازے تو ہر وقت کھلے رہتے ہیں اس مہینے میں تو اللہ سب کے گناہ معاف کر دیتا ہے، اگر کوئی گناہوں سے توبہ کر کے اچھی زندگی گزارنا چاہتا ہے تو کیا نہیں یہ زیب دیتا ہے کہ ہم اسے اس کی گزشتہ گناہوں، برائیوں بھری زندگی کے طعنے دے دے کر مار دیں، جب اللہ معاف کر سکتا ہے تو ہم کون ہوتے ہیں کسی کو بے حیا اور بے کردار کہنے والے، دھتکارنے والے؟ ہمیں تو ایسے لوگوں کی زندگی آسان کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ وہ لوگ ہماری نفرت اور برے رویے کی وجہ سے بدل نہ ہو جائیں اور پھر سے اسی گناہوں اور خطاؤں والی زندگی کی طرف نہ لوٹ جائیں، مسلمان کا ایمان اگر مضبوط ہوتا تو اس کا دل اور ظرف بھی کشادہ ہوتا ہے وہ کسی کو اس کی غلطی یا گناہ پر طعنے نہیں دیتا، معافی مانگنے پر دھتکارنا نہیں ہے۔“ سلوٹی نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔

”ہماری بیٹی بالکل درست کہہ رہی ہے۔“ افطار حسین چوہدری وجاہت سعید کے ساتھ ٹی وی

لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے اس کی باتیں سن کر بولے۔

”تھینک یو ابو، ایک آپ ہی ہیں جو مجھے سمجھتے ہیں۔“ سلوٹی نے مسکراتے ہوئے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ نے ہی سر چڑھا رکھا ہے اسے آج کل تو یہ سمجھ میں ہی نہیں آ رہی پہیلی بنتی جا رہی ہے۔“ صائمہ بیگم نے شکایتی لہجے میں کہا۔

”اور آپ پہیلی کو بوجھنے کی بجائے خود بھی بدلتی جا رہی ہیں، آپ دونوں کے رویے بدلے بدلے سے ہیں ہماری سلوٹی بیٹی کے ساتھ پوچھ سکتا ہوں وجہ کیا ہے؟“ افطار حسین چوہدری نے سلوٹی کے شانوں کے گرد بازو حاصل کیا اور صائمہ بیگم کو دیکھتے ہوئے سوالیہ لہجے میں کہا۔

”وجہ بعد میں سن لیجئے گا وضو کر کے آجائیں افطار میں چند منٹ باقی ہیں۔“ صائمہ بیگم نے وجاہت سعید کی موجودگی کا خیال کرتے ہوئے کہا اور کچن میں چلی گئیں۔

”ہاں ابھی جلدی کریں وجاہت بیٹا آپ بھی چیخ کر آئیں ہم بھی آتے ہیں وضو کر کے۔“ افطار حسین نے وجاہت کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ جی انکل کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا، سلوٹی بھی افطاری کی اشیاء میز پر بچانے لگی۔

☆☆☆

”آپ دوسروں کی اولاد کو تو بہت سمجھاتے، سنوارتے ہیں نیکی کی تلقین کرتے ہیں غلطی کی تیز بتاتے سیکھاتے ہیں مگر اپنی اولاد کی طرف کوئی توجہ نہ ہی نظر رکھتے ہیں، کہ وہ کیا کرتی پھر رہی ہے؟ کس قسم کے لوگوں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا ہے؟“ صائمہ بیگم نے سونے سے پہلے افطار حسین چوہدری سے بہت سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں کہا۔



”آپ تو سر اس الزام دھری ہیں ہم پر ایسا کب ہوا کے ہم نے اپنی اولاد پر نظر نہیں رکھی، اچھے برے کی تمیز نہیں سیکھائی، توجہ نہیں دی، الحمد للہ ماشاء اللہ ہمارے چاروں بچے نیک سیرت با کردار اور اچھے انسان ہیں، آپ کو ایسا کیوں لگا؟ ہماری اولاد میں سے کس نے آپ کو ایسا سوچنے پر مجبور کیا ہے ذرا بتائیں؟“ افتخار حسین چوہدری نے خیر آمیز نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آپ اچھی طرح جانتے ہیں میں کس کی بات کر رہی ہوں۔“ صائمہ بیگم بیڑ پر بیٹھتے ہوئے بولیں تو انہوں نے کہا۔

”غٹوئی میں تھوڑی کمی ہے چیزوں اور لوگوں کو سمجھنے میں غلطی کر جاتی ہیں، شکی مزاج ہے ان کا بات کی تہ تک پہنچنے کی زحمت نہیں کرتیں اور نتائج اخذ کر لیتی ہیں جو صحیح نہیں ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ سمجھ جائیں گی۔“

”سمجھنے کی ضرورت غٹوئی کو نہیں سلوئی کو ہے۔“ وہ بولیں۔

”میرا خیال ہے کہ آپ اس وقت غصے میں ہیں سو جائیں ہم صبح بات کریں گے سحری کے وقت آنکھ نہیں کھلیں گی آپ کی۔“

”میری آنکھیں تو کھل چکی ہیں افتخار صاحب بہتر ہوگا کہ آپ بھی اپنی آنکھیں کھول لیں، ایسا نہ ہو کہ لوگوں سے آنکھیں ملانے کے لائق نہ رہیں۔“ صائمہ بیگم کا لہجہ اور انداز بدستور سناٹ اور غصیلہ تھا افتخار حسین چوہدری نے زندگی میں پہلی بار انہیں اتنے غصے میں، بد لحاظی سے پیش آتے دیکھا تھا وہ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان بھی ہو گئے تھے۔

”آخر ایسا کیا ہوا ہے جو آپ اس قدر ہولناک نقشہ کھینچ رہی ہیں ہمارے مستقبل کا؟“

افتخار حسین چوہدری نے متشکر لہجے میں پوچھا۔

”آپ کی لاڈلی سلوئی ہاتھوں سے نکل گئی۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ افتخار حسین چوہدری رنگ رہ گئے۔

”ٹھیک کہہ رہی ہوں کبھی چاند کے چکر میں نکل جاتی ہے، کبھی یاسر کو الو بناتی ہے اور تو اور وجاہت کو بھی بیوقوف بنا رہی ہے بے شرم لڑکی اپنی نہیں تو ہماری ہی عزت کا خیال کر لے، کسی ایک کا ہاتھ تھام لے تاکہ ہم اس کے ساتھ عزت سے اسے رخصت کر دیں اور یہی نہیں یونیورسٹی کی آوارہ مزاج آزاد خیال لڑکیوں سے بھی دوستی ہو گئی ہے سلوئی کی آج انہیں گھر بلا لیا تھا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر لپ ٹاپ پر واہیات تصویریں دیکھ رہی تھی، غٹوئی نے خود دیکھا تھا اسے دیکھتے ہی لپ ٹاپ بند کر دیا تھا سلوئی نے اور یوں ہو گئی تھی جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو، مجھے تو یہ سب بتاتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے مگر خاموش رہنے سے مسئلہ تو حل نہیں ہوتا لہذا بے شرم ہو کے بتا رہی ہوں آپ کو، ابھی بھی وقت ہے سنہال لیں اپنی لاڈلی کو ورنہ یہ ہمارے منہ پر کالکٹل کر رہے گی۔“ صائمہ بیگم تیز اور سپاٹ لہجے میں بولتی چلی گئیں، سلوئی جو ان دونوں کو اصل بات بتانے کے ارادے سے آئی تھی دروازے سے لوٹ گئی تھی اپنی ماں کی باتیں سن کر، دل دکھ سے بھر گیا تھا اس کا آنسو بے اختیار ہی بہتے چلے جا رہے تھے۔

”لوگ اسی لئے تو کسی کے ساتھ نیکی نہیں کرتے کیونکہ دنیا والے انہیں برا ثابت کر دیتے ہیں، الزام لگاتے ہیں، مگر یہ تو دنیا والے نہیں ہیں یہ تو میرے اپنے ہیں میرے ماں باپ، میری بہن ہے جو مجھے اتنا گرا ہوا سمجھ رہی ہیں میری ہی

نظروں میں گرا دیا ہے مجھے امی نے، آپ نے میری بات سنی ہوئی، اعتبار کیا ہوتا تو میں سب کچھ پہلے دن ہی آپ کو بتا دیتی لیکن آپ کے عدم اعتماد کی وجہ سے میں آپ سے کچھ بھی سیکر نہ کر پائی، چلیں اچھا اس بہانے پر تو معلوم ہوا کہ آپ کو مجھ پر اپنی بیٹی پر بالکل بھی بھروسہ نہیں ہے، کوئی بات نہیں امی، ابو غٹوئی ڈیر کوئی بات نہیں، ایک یقین اور مان تھا جو آپ تینوں نے آج توڑ دیا ہے، مگر میں اپنا کام مکمل کر کے رہوں گی بری تو میں بن گئی ہوں آپ کی نظروں میں تو اب کس لئے پیچھے ہٹوں؟ میں افراد اور مشا کو چاند کے چنگل سے آزاد کرانے رہوں گی، کیا ہوا اگر میں آپ سب کی نظروں میں بری بن رہی ہوں، اللہ تو دیکھ رہا ہے نا، وہ تو جانتا ہے کہ سچ کیا ہے؟ نیکی کے راستے میں رکاوٹیں اور مشکلات تو آتی ہیں، اچھائی اور سچائی کی راہ کانٹوں کی شاہراہ ہے جس پر سے ننگے پاؤں گزرنا پڑتا ہے بنا آہ کیے، بنا اٹک بہائے، لہذا مجھے بھی ہمت اور حوصلے سے چلنا ہے اس سفر میں پاؤں سے پہلے میرا دل ابولہان ہو گیا ہے، کوئی بات نہیں مجھے رکنا نہیں ہے، تھکنا نہیں ہے رونا نہیں ہے، آگے بڑھنا ہے اور کامیاب ہونا ہے انشاء اللہ، پلیز اللہ تعالیٰ، آپ میرا ساتھ مت چھوڑیے گا مجھے آپ کی اشد ضرورت ہے۔“

سلوئی ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی سوچ رہی تھی آنکھوں سے رخساروں پر بہنے والے آنسوؤں کو اس نے اپنے نرم گلابی ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے صاف کیا تھا، کٹھڑی کے اس پار اندھیرے میں دو آنکھیں اس منظر کو دیکھ کر ترپ اٹھی تھیں۔

”سلوئی!“ افتخار حسین چوہدری کی آواز نے سلوئی کو چونکا دیا، وہ فوراً آچل سے اپنے چہرے کو صاف کر کے کٹھڑی ہو گئی۔

”جی ابو!“ اس نے آواز کی سمت دیکھا وہ بہت غصے میں تھے، سلوئی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ امی کی باتوں پر یقین کر چکے ہیں، صائمہ بیگم بھی ان کے پیچھے آ رہی تھیں۔

”تمہاری ماں نے جو کچھ کہا کیا وہ سچ ہے؟“ وہ غصے سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

”ابو! ماں جھوٹ نہیں بولتی، انہوں نے کیا کہا ہے یہ میں نہیں جانتی، آپ بتادیں۔“ سلوئی نے خود کو سنہال کر سنجیدگی سے کہا۔

”ایک باپ اپنی جوان بیٹی سے اس بارے میں بات کرتے ہوئے شرم سے ڈوب مرے گا۔“ افتخار حسین چوہدری غصیلے لہجے میں بولے۔

”ہوا کیا ہے ابو! اور یہ حصہ آپ پر بالکل بھی سوٹ نہیں کر رہا۔“ سلوئی نے نارل لہجے میں کہا۔

”سوچا تو میں نے بھی نہیں تھا کہ مجھے تم پر کبھی حصہ بھی کرنا پڑے گا لیکن تم نے کام ہی ایسا کیا ہے کہ میرا غصہ بجا ہے۔“

”کیا کیا ہے میں نے؟“ وہ انجان بن وہ ان کی زبان سے سنا جانتی تھی اپنا جرم۔

”دیکھا آپ نے کیسی انجان بن رہی ہے ہمارے منہ پر کالکٹل ملتی پھر رہی ہے اور اسے ابھی معلوم ہی نہیں ہے کہ کیا کیا ہے اس نے؟“ صائمہ بیگم تلخ لہجے میں بولیں۔

”مجھے صرف ہاں یا ناں“ میں جواب دو۔“

”ابو! ایسا تو فلوں، ڈراموں میں ہوتا ہے اصل بات کوئی جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا اور ہاں ناں کی کسوٹی پر فیصلہ سنا دیا جاتا ہے۔“ سلوئی مسکرا کر بولی۔

”مث! اب، جتنا کہا ہے اتنا جواب دو۔“

افتخار حسین چوہدری گر بے، وہ اندر سے سہم گئی، ان کا یہ روپ اس نے پہلی بار دیکھا تھا اس کا ڈرنا



جائز تھا۔

”جی پوچھیں۔“

”تم چاند کے ساتھ کوئی گیم کھیل رہی ہو اور یا سر اور وجاہت کو بھی اس گیم کا حصہ بنایا ہے تم، ہاں یا ناں۔“ افتخار حسین چوہدری نے مناسب لفظوں میں اپنی بات کہتے ہوئے جواب چاہا تھا۔

”ہاں۔“ سلوٹی کے اس جواب پر افتخار حسین چوہدری کا بھاری ہاتھ زور دار طمانچہ رسید کر گیا، ایک لمحے میں وہ لڑکھڑا کر نیچے جاگری تھی، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا، رخسار جیسے آگ میں دھک رہا تھا، وہ شاکد تھی، بند آنکھیں کیسے کھلتی ہیں یہ احساس اس لمحے اسے بخوبی ہو رہا تھا۔

”اس ایک تھڑو اور ننگ سمجھنا دوبارہ اپنے باپ کو یہ موقع مت دینا۔“ صائمہ بیگم نے افتخار حسین چوہدری کے وہاں سے جانے کے بعد سلوٹی کی طرف دیکھتے ہوئے تنبیہی لہجے میں کہا۔

”امی! اسے تو رمضان جیسے مقدس مہینے کا بھی خیال نہیں آیا ایسی بے شرمی کے مظاہرے کرتے ہوئے ٹھیک کیا ابو نے جو اس کا منہ توڑ دیا ورنہ یہ تو ہمیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑتی۔“ غنوی بھی دور کھڑی یہ واردات دیکھ رہی تھی، آکر طنز یہ لہجے میں کہنے لگی۔

”تم جاؤ اپنے کمرے میں سحری میں جاگنا بھی ہے۔“ صائمہ بیگم نے غنوی سے کہا وہ ان کا بگڑا ہوا مزاج دیکھ کر فوراً اپنے کمرے میں چلی گئی، صائمہ بیگم بھی سونے چلی گئیں۔

سلوٹی ہمت کر کے وہیں کارپٹ پہ بیٹھ گئی تھی، دل اور روح دونوں ایک ساتھ زخمی ہوئے تھے اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیسے مرہم لگائے کہ دوا دے؟ آنکھ کے آنسو پوچھے یا دل کا لہو

صاف کرے؟ وجاہت سعید نے کھڑکی کے پار سے یہ تکلف دہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور بہت دھمی ہو گیا تھا، وہ بھی اپنی جگہ مجبور تھا اس کے لئے فی الحال کچھ نہ کرنے سے قاصر تھا سو بے بسی سے ہاتھ ملتا ہوا اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔

☆☆☆

سحری حسب معمول سلوٹی نے تیار کر کے ٹیبل پر سجادی تھی، ابھی تک کوئی بھی اپنے کمرے سے نہیں نکلا تھا، وجاہت سعید اپنے مقررہ وقت پر سحری کرنے آیا تو سلوٹی کو سحری کرتے دیکھ کر خود بھی کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔

”آج کوئی سحری نہیں کرے گا کیا؟“

”جس نے کرنا ہوگی آکر کر لے گا، آپ شروع کیجئے۔“ سلوٹی نے پراسٹے اور قہر مٹر کے سالن اس کے سامنے رکھ دیا، سلوٹی کا سرخ چہرہ سوچی ہوئی آنکھیں، وجاہت سعید کو اس کے دکھ درد کی کہانی سنا رہا تھا، وہ بہت افسردہ ہو رہا تھا اسے یوں دیکھ کر۔

”رات جو کچھ بھی ہوا آپ کے ساتھ آئی ایم ریٹلی شاکد۔“ وجاہت سعید نے نوالہ توڑتے ہوئے کہا۔

”اوہ، تو آپ نے دیکھ لیا وہ سب۔“ سلوٹی جھل ہو کر بولی۔

”جی ہاں دیکھ بھی لیا اور سن بھی لیا، انکل آئی اور غنوی میں آپ پر شک کیسے کر سکتے یہ سب کیا وہ آپ کو جانتے نہیں ہیں؟ آپ ان کی نظروں کے سامنے پلے بڑھی ہیں انہیں ایسا نہیں سوچنا چاہیے تھا اور ایک باہر کا آدمی آپ کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہے اس کی موجودگی میں یہ ہنگامہ نہیں ہونا چاہیے تھا انہوں نے معاملے کو نوعیت اور نزاکت کو سمجھا ہی نہیں اور غصے اور جوش کا مظاہرہ

کر بیٹھے، بیٹی کا معاملہ تو بہت نازک ہوتا ہے بہت محتاط ہو کر بولنا چلنا پڑتا ہے، اچھے خاصے کچھ دار لوگ ہیں سب ایک لمحے میں سب بھلا دیا ویری اسٹریٹج اینڈ ویری بیڈ۔“ وجاہت سعید نے کھانا کھاتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔

”مردوں کی عزت اپنے گھر کی عورتوں سے منسوب ہوتی ہے جہاں خلاف توقع بات ہوئی وہیں ان کی غیریت کا پتلا جوش میں آکر کھڑا ہو جاتا ہے چپخنے، چلانے لگتا ہے، مرنے مارنے پرتل جاتا ہے، ہمارے معاشرے کا مزاج ہے خواہ کوئی کتنا ہی تعلیم یافتہ، مہذب اور قابل کیوں نہ ہو بہن، بیٹی کے معاملے میں سب ایک سے غیرت مند ہیں، عورت کی کمائی کھانے، اس پر ہاتھ اٹھانے، اس سے اپنی خدمت کروانے میں مرد کی غیرت نہیں جوش مارتی اسے وہ اپنا حق سمجھتا ہے، دو غیلے اور منافق ہیں سب کے سب۔“

سلوٹی نے جی سے کہا تو وہ سنجیدگی سے بولا۔

”آپ کی بات درست ہے اور جو آپ کے ساتھ ہوا وہ غلط ہے انہیں اصل بات کا علم ہونا چاہیے میں سلوٹی۔“

”صورتحال آپ کے سامنے ہے اب اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انہیں اصل حقیقت آج معلوم ہو یا دس بیس دن بعد معلوم ہو جو ہونا وہ ہو گیا، مجھے اس سب کا اینڈ کرنا ہے آپ ساتھ دیں گے؟“ سلوٹی نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے وجاہت سعید کا چہرہ دیکھا جہاں اسے اپنے لئے عزت، احترام اور دکھ دکھائی دیا۔

”ہمیشہ۔“ وجاہت سعید کا یہ یک لفظی جواب اس کے لئے بہت بڑی ڈھارس بن گیا۔

”شکریہ۔“ وہ مدھم لہجے میں بولی۔

”فکر مت کیجئے انشاء اللہ سب کی نظروں میں آپ کی عزت بحال ہو جائے گی پہلے جیسا ہو

جائے گا سب کچھ۔“

”پہلے جیسا۔“ وہ تلخی سے مسکرائی اور برتن سمیٹ کر اٹھ گئی۔

☆☆☆

”تم کہاں جا رہی ہو آج تو سنڈے ہے؟“ غنوی نے سلوٹی کو چادر اوڑھ کر باہر نکلتے دیکھا تو تفتیشی انداز میں پوچھا۔

”کیوں سنڈے کو گھر سے باہر نکلنا منع ہے کیا؟“ سلوٹی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”لگتا ہے رات والا تھپڑ بھول گئی ہو۔“ غنوی طنز یہ مسکرائی۔

”نہیں وہ تھپڑ تو میں مرتے دم تک یاد رکھوں گی۔“

”تو کیا ابو کے ہاتھوں گردن کٹوانے کا ارادہ ہے جو جا رہی ہو؟“

”ارادہ تو بہت نیک ہے رہی بات گردن کٹوانے کی تو وہ میرے واپس آنے پر کٹوا دینا مجھے پروا نہیں ہے، میں دو گھنٹے تک واپس آ جاؤں گی گیٹ بند کر لو اور امی ابو جاگ جائیں تو انہیں بتا دینا اور ہاں وہی بتانا جو میں نے کہا ہے اپنی طرف سے مصالحو لگانے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ حافظ۔“ سلوٹی نے سنجیدگی سے کہا اور باہر نکل گئی۔

سلوٹی، وجاہت سعید کے ساتھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جیب اللہ قریشی کے گھر آئی تھی، انہیں اس نے چاند کے متعلق ساری معلومات دینا تھیں، وجاہت نے انہیں ساری صورتحال سے آگاہ کیا، ثبوت موجود تھے، جیب اللہ قریشی نے چاند کو یونیورسٹی سے نکالنے کی یقین دہانی کرائی تھی۔

”سرا! کسی کو معلوم نہ ہو کہ چاند کا لیپ ٹاپ اور سیل فون میں نے تبدیل کیا تھا اور نہ ہی



افراء رمشا کے نام سب کے سامنے آنے چاہیں اور سر شیراز چاند کے دوست امجد کو بھی آڈٹ کریں وہ زرقا کو چیت کر رہا ہے ان لڑکیوں کو الگ سے وارننگ دیجئے گا اور چاند کے پیرنس کو آفس میں بلا کر ان کے بیٹے کے کارناموں سے آگاہ کرتے ہوئے وارن بھیجے گا۔“ سلوٹی نے سمجھداری سے سنجیدگی سے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

”مس سلوٹی! آئی ایم پراؤڈ آف یو، آپ ہمارے ادارے کا فخر ہیں، شان ہیں، آپ جیسی ذہین اور سمجھدار لڑکیاں چاند جیسے لڑکوں کے ناپاک عزائم خاک میں ملا سکتی ہیں آپ نے اپنی کلاس فیلوز کی عزت بچانے کے لئے اتنا کچھ کیا یہ اس ادارے کی عزت بچانے کی مترادف ہے میں دل سے آپ کا شکر گزار ہوں تھینک یو وری مچ مس سلوٹی۔“

”تھینکس سرا“ وہ مسکرا دی۔

”یونیورسٹی میں سب کو معلوم ہونا چاہیے کے چاند اور امجد کو کس جرم کی پاداش میں فارغ کیا گیا ہے اس سے لڑکیاں بھی الارٹ ہوں گی اور ان دونوں کی اصلیت بھی سب پر عیاں ہوگی ان کے لئے یہی سزا بہت ہے پولیس میں دینے دھمکی بھی دیجئے گا اور پولیس کو شامل کرنا ہو تو میں آپ کی ہیلپ کر سکتا ہوں، اس کے علاوہ یونیورسٹی سٹوڈنٹس کو یہ پیغام پہنچا دیں کے ایسے کسی بھی جرم میں شامل لڑکے، لڑکوں کو یونیورسٹی میں نہیں رکھا جائے گا اور آپ نے چیک رکھنے کے لئے ایک خفیہ ٹیم تشکیل دے دی ہے اور چاند کا سیل فون لیپ ٹاپ بھی اسی ٹیم نے حاصل کیا ہے، یہی نہیں ان دونوں گزرو کو بھی آپ اپنے آفس میں بلا کر چاند اور اس کے پیرنس کے سامنے ڈانٹیں سمجھائیں تاکہ چاند کو یہ یقین ہو

جائے کے افراء اور رمشا کا اسی معاملے ہاتھ نہیں ہے وہ بھی آپ کی اس کارروائی سے بے خبر تھیں، بانی آپ خود سمجھدار ہیں کس کو کیسے ہینڈل کرنا ہے آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔“ وجاہت سعید نے حبیب اللہ قریبی کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

”مجھے میرے سونے سمجھنے کے لئے تو آپ دونوں نے کچھ چھوڑا ہی نہیں سب تا، سمجھا دیا کے کیا کرنا ہے کیسے کرنا خاصا ہوم ورک کیا ہے آپ دونوں نے اس اکسیں پر، ویل ڈن انشاء اللہ، کل ہی اس پر عمل ہوگا میں چاند کے والد کو آج ہی کال کر کے کہتا ہوں کے وہ کل صبح وہ یونیورسٹی ضرور آئیں، افراء رمشا اور زرقا کو ڈانٹا واقعی ضروری ہے ان کے پیرنس کو ہم نہیں بتائیں گے اگر انہیں احساس ہو گیا ہے اپنی غلطی کا تو ہمیں بھی معلوم ہے بیٹیوں کی عزت بہت نازک ہوتی ہے انہیں والدین کی نظروں میں نہیں گرنا چاہیے، ہم خیال رکھیں گے ڈنٹ وری اور بہت شکریہ آپ نے یہ نیک کام کیا اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔“

”انشاء اللہ۔“ وجاہت سعید اور سلوٹی نے ایک ساتھ کہا اور وہاں چلے آئے۔

☆☆☆

”میں تو آپ کو ابویں سمجھ رہی تھی آپ تو خاصے جینٹلس ہیں۔“ سلوٹی نے وجاہت سعید کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”تھینک یو، آپ ہی کا اثر ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔

”تھینک یو آپ نے یہاں تک میرا ساتھ دیا۔“

”میں ہمیشہ آپ کا ساتھ دوں گا یقین رکھیے۔“

”یقین، مان اعتبار کیسے ایک لمحے میں ٹوٹ جاتے ہیں ناں جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔“ سلوٹی دلگیر لہجے میں بولی۔

”مجھے اندازہ ہے آپ کے دکھ کا مگر آپ تو بہت بہادر ہیں ناں بہادر اور اچھے لوگوں کا زندگی اسی طرح امتحان لیتی ہے آپ نے ہمت نہیں ہارنی آپ کے گھر والوں کو بھی جلد یقین آ جائے گا کے آپ نے کچھ غلط نہیں کیا، ٹینشن مت لیں میں ہوں نا آپ کے ساتھ۔“ وجاہت سعید نے پر خلوص لہجے میں کہا۔

”ابھی تو آپ کے ساتھ میرے آنے پر گھر پہنچ کر میری عزت افزائی ہوگی۔“ وہ زخمی سی مسکراہٹ لبوں پر لا کر بولی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیر رہی تھی وجاہت سعید نے بے قراری سے اسے دیکھا تھا اور بے بسی سے ہونٹ بھیج لئے تھے، سلوٹی کے گہرا سانس لبوں سے خارج کیا اور افراء رمشا کو باری باری کال کر کے ساری بات سمجھا دی تاکہ کل اگر پرنسپل آفس میں انہیں طلب کیا جائے تو وہ ذہنی طور پر تیار ہوں، وجاہت سعید اسے گھر ڈراپ کر کے اپنے آفس چلے گئے۔

”کہاں سے آرہی ہو؟“ صائمہ بیگم نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا۔

”باہر سے۔“ سلوٹی چادر اتار کر تہہ لگاتے ہوئے بولی۔

”وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں مگر چھٹی والے دن تم کہاں گئیں تھیں وجاہت کے ساتھ؟“ انہوں نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

”پرنسپل کے گھر گئی تھی وجاہت صاحب سے ریکورڈ کی تھی اس لئے وہ پک اینڈ ڈراپ دے گئے ہیں، وہ خاصے مہذب اور نفیس انسان ہیں۔“

ضرورت نہیں ہے۔“ سلوٹی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”شکر ہے تمہیں اس بات کا احساس تو ہے وجاہت ایک نفیس انسان ہیں ویسے یہ احساس تمہیں کیسے ہوا؟ تمہیں غلط راستے پر چلنے سے روکا ہوگا انہوں نے۔“ صائمہ بیگم لبوں لہجہ کاٹ دار تھا، سلوٹی کا دل چر کر رہ گیا۔

”غلط راستے پر چلنے سے روکنے والے بھی نعمت ہوتے ہیں۔“ سلوٹی نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تو صائمہ بیگم نے اس کے ہاتھ میں موجود اس کا سیل فون بھپٹ لیا۔

”ادھر دو یہ موبائل دیکھتی ہوں اب کس سے باتیں کرتی ہو؟“

”رکھ لیں۔“ سلوٹی نے تاسف زدہ مسکراہٹ لبوں پہ لا کر کہا اور کمرے میں بند ہو گئی، ادھر وجاہت سعید کو چھٹی کے دن بھی ضروری کام کی وجہ سے فیکٹری آفس آنا پڑا تھا مگر

اس کا دھیان سلوٹی کی طرف ہی تھا، وہ اس کی بھیگی، سوچی آنکھوں کو یاد کر کے بے قرار ہو رہا تھا، گھر پہنچنے پر اس کے ساتھ کیا ہوا؟ وہ ٹھیک ہے کہ نہیں یہ جاننے کے لئے انہوں نے اس کے نمبر پر ٹیکسٹ کیا تو کافی دیر تک جواب نہ آیا، پھر انہوں نے اسے کال کی تو اس کا سیل فون بند ملا، اب تو وہ سچ سچ پریشان ہو گئے تھے کہ کہیں سلوٹی کے ساتھ پھر سے رات والا سلوک نہ کریں اس کے ماں باپ، وجاہت نے اپنے والد کو کال کر لی۔

”ہاں بھی صاحبزادے، کام کیا چل رہا ہے؟“ سلام دعا کے بعد سعید رضا احمد نے ان سے پوچھا۔

”کام بوس چل رہا ہے دل نہیں لگ رہا کام



میں۔“ وہ ادا اس لہجے میں بولے۔

”کیوں بھی، کیا ہوا دل کو؟“

”دل بہت افسردہ ہے کسی کے لئے۔“

”کس کے لئے؟“

”سلوی نام ہے اس اچھی لڑکی کا۔“

”افتخار حسین کی چھوٹی بیٹی ہے نا سنا ہے

بہت قابل ہے۔“

”جی ہاں، وہ بہت اچھی بہت سمجھدار اور

انسان درست لڑکی ہے بہت باہمت اور کیرنگ

بھی ہے۔“ وجاہت سعید نے کرسی کی پشت سے

ٹیک لگا کر آنکھوں میں سلوی کا چہرہ دیکھتے ہوئے

دل سے کہا لہجہ محبت بھرا تھا۔

”تو بیٹا! اس قدر خوبیوں کی مالک لڑکی کو اپنا

یوں دیکھتے؟ ستادی رلو اس سے۔“ سعید

رضا احمد دوستانہ لہجے میں بولے۔

”آپ کروا دیں شادی میں تو تیار ہوں

سلوی سے شادی کرنے کے لئے۔“ وجاہت

سعید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”گریٹ، ایسا ہے تو ہم پہلی فلائٹ سے

لاہور پہنچ جاتے ہیں رشتے کی بات کرنے کے

لئے۔“ سعید رضا احمد خوشگوار لہجے میں بولے۔

”آپ کو میری پسند پر کوئی اعتراض تو نہیں

ہے نا پاپا؟“

”گریٹ نہیں، بلکہ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ

میں نے تمہیں پہلے کیوں نہیں بھیج دیا افتخار کے گھر

چلو دیر آید درست آید، میں تمہاری مٹی سے بات

کرتا ہوں پھر جو بھی پروگرام بنے گا میں تمہیں

افتخارم کروں گا تم اپنی مٹی کو بھی کال کر کے اپنی

پسند کے بارے میں بتا دو انہیں خوشی ہوگی۔“

انہوں نے خوشگوار موڈ میں کہا۔

”وہ انکار تو نہیں کریں گی؟“ وجاہت سعید

”مجھے نہیں لگتا کہ وہ انکار کریں گی وہ تو

تمہاری خوشی میں خوش ہوں گی اور مجھ سے زیادہ تو

تمہاری مٹی کو شوق ہے تمہیں دولہا بننے دیکھنے کا

اس لئے فکر مت کرو میں ہوں نا وہ نہیں مانیں گی

تو میں منالوں گا۔“ سعید رضا سنجیدگی سے یقین

دلاتے ہوئے بولے۔

”تھینک یو پاپا۔“

”اچھا یہ بتاؤ روزے کیسے گزر رہے ہیں؟“

”بہت اچھے اور بہت مصروف اللہ تعالیٰ

قبول فرمائیں۔“ وجاہت سعید نے ایمانیداری

سے جواب دیا ساتھ ہی دعا بھی کی۔

”آمین۔“ انہوں نے دل سے کہا اور چند

ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد رابطہ منقطع کر

دیا۔

☆☆☆

وجاہت سعید شام کو افتخار ولا جاتے ہوئے

کافی سارا فروٹ لے آیا۔

”آئی یہ کچھ پھل لایا ہوں میں کہاں رکھنے

ہیں؟“ وجاہت سعید صائمہ بیگم کو دیکھ کر بولا،

ملازم لڑکا شاہراہ اٹھائے ہوئے تھے۔

”بیٹا! اس کی کیا ضرورت تھی گھر میں سب

کچھ تو ہے تمہارے انکل روزانہ پھل لے کر آتے

ہیں۔“ صائمہ بیگم بولیں۔

”ایک دن میں لے آیا ہوں تو کیا ہوا پلیز

رکھ لیجئے۔“ وجاہت سعید نے شاہراہ کی طرف

بڑھاتے ہوئے کہا تو انہوں نے شاہراہ پکڑ لئے۔

”ابھی تو میں رکھ رہی ہوں دوبارہ نہیں لانا

اچھا۔“

”جی اچھا۔“ وہ ہنس دیا۔

”یہ آموں کی پٹنی چن میں رکھ دو۔“

صائمہ بیگم نے لڑکے سے کہا، وجاہت سعید اپنے

دیکھا ہلکے سبز لان کے سوٹ میں سبز آنچل سر پر

ایسے اوڑھا ہوا تھا جیسے وہ نماز ادا کر کے آرہی ہو،

وجاہت سعید کا دل بے ترتیب ہو کر دھڑکا تھا اس

اس دلکش سراپے کو دیکھ کر۔

”آپ کا موبائل کیوں آف ہے؟“

وجاہت سعید نے مدھم آواز میں اس سے پوچھا۔

”میرا موبائل امی کی تحویل میں ہے۔“ اس

نے آہستگی سے جواب دیا۔

”اوہ۔“ وجاہت سعید نے ہونٹ سکیڑ کر کہا

اور ساری بات سمجھتے ہوئے اپنے کمرے میں چلا

گیا۔

☆☆☆

یونیورسٹی کے پرنسپل واکس چائلر نے شیراز

چاند کے والدین کو آفس بلوا کر اس کی حرکتوں

سے آگاہ کیا اس کے کرتوتوں کے ثبوت لیپ

ٹاپ اور موبائل میں موجود تھے انہیں دکھائے تو

ان کے سر شرم سے جھک گئے، افراد مشا کو بھی

ان تینوں کے سامنے ڈانٹا گیا ان کی سرزنش کی گئی،

امجد اور زرقا کی بھی ٹھیک ٹھاک کلاس لی گئی، شیراز

چاند اور امجد کی یونیورسٹی سے فارغ کر دیا گیا۔

”سر پلیز، معاف کر دیجئے آئندہ ہم ایسی

حرکت نہیں کریں گے۔“ چاند نے ہلکی لہجے میں

کہا اس کے تو ہاتھوں کے طوطے اور چہرے کا

رنگ اڑ گیا تھا، وہ اور امجد دونوں حیرت زدہ اور

پریشان تھے کہ وہ کیسے پکڑے گئے، لیپ ٹاپ

اور موبائل کیسے تبدیل ہو گئے، ایسی کون سی خفیہ ٹیم

ہے جس نے اس قدر صفائی سے یہ کام کر دکھایا

کے انہیں تو کیا ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو

سکتی۔

”آئندہ آپ دونوں ایسی گھٹیا حرکت

کرنے کا سوچیں بھی نہیں اسی لئے آپ کو فارغ

کرا دیا۔“

سکتے ہیں لیکن آپ کے مستقبل اور بوڑھے

والدین کا خیال کرتے ہوئے ہم کوئی قانونی

کارروائی نہیں کر رہے صرف آپ دونوں کو

یونیورسٹی سے نکال رہے ہیں تاکہ باقی اسٹوڈنٹس

آپ کے نقش قدم پر چلنے کی بجائے آپ کے

انجام سے سبق سیکھتے ہوئے صرف اور صرف اپنی

پڑھائی پر توجہ دیں آپ دونوں جاسکتے ہیں اور

دوبارہ ہمیں یونیورسٹی کے آس پاس دکھائی نہ دیں

ورنہ ہم یہ ثبوت پولیس کو دے دیں گے پھر پولیس

جانے اور آپ جانیں۔“ حبیب اللہ قریشی نے

چاند اور امجد کو دیکھتے ہوئے سختی سے اپنا فیصلہ

سنایا۔

☆☆☆

یاسر کو امریکہ میں بہت اچھی کمپنی میں جاب

مل گئی تھی اور اس نے جوانی کرنے کا فیصلہ بھی کر

لیا تھا، انتظار حسین چوہدری نے بھی اس بار اسے

سیاست میں حصہ لینے کے لئے مجبور نہیں کیا تھا

کیونکہ وہ خود بری طرح پھنس چکے تھے چاروں

طرف سے تنقید ہو رہی تھی جب ہنسائی ہو رہی تھی،

وہ مقدمے لڑ رہے تھے، مگر انہیں احساس ہو گیا تھا

ان کی طرز سیاست وہ دلدل ہے جس میں ایک

بار پاؤں رکھا تو وہ سرتک اس دلدل میں دھنستا چلا

جاتا ہے اور وہ کم از کم اپنے ذہن اور قابل بیٹوں

کو اپنے والی سیاست کرنے پر تو مجبور نہیں کر سکتے

تھے لہذا انہوں نے یاسر کو امریکہ جانے اور جاب

کرنے کی اجازت دیدی۔

یاسر امریکہ جانے سے پہلے غنوی سے

شادی کرنا چاہتا تھا، ریحانہ بیگم اور انتظار حسین

چوہدری کو اس پر بھی اعتراض نہیں تھا، میڈیا

والوں کو بھی چند روز کے لئے ان کے حوالے سے

نئی خبر مل جائے گی، یاسر شادی بھی سادگی سے کرنا

چاہتا تھا۔



بیانات کو سپورٹ کرنے اور مستقبل میں اسی سیاسی حوالے سے بہت فائدہ دے سکتی تھی، یہ خواہش بھی پوری کرنے کا یقین دلا دیا گیا تھا پاسر کو، پاسر نے یہ سب سلوئی کو بتانے کے لئے نون کیا اس کا نمبر مسلسل آف جا رہا تھا، غنوی کا نمبر ملایا تو اس نے تیسری تیل پر کال اٹینڈ کر لی۔

”السلام علیکم“  
”وعلیکم السلام ڈیئر مگنیتر کیسی ہو؟“  
”ٹھیک ہوں۔“

”میرا حال نہیں پوچھو گی؟“

”آپ کا اور آپ کے والد کا حال ماضی اور مستقبل ہرئی وی چینل اور اخبار کی شہ سرخی بنا ہوا ہے اس لئے پوچھنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی مجھے۔“ غنوی نے بے مروتی سے جواب دیا۔

”بہت شکی اور بدگمان لڑکی ہو تم میں نے تمہیں گڈ نیوز سنانے کے لئے، کال کی تھی مگر افسوس تم جیسی لڑکیاں ہوتی ہیں جو اپنی تنگ ذہنیت اور بے اعتباری کی وجہ سے خود پر خوشیوں کے دروازے بند کر لیتی ہیں۔“ پاسر نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

”میں آپ کو تنگ ذہن شکی بدگمان ہی لگوں گی نا، آپ ٹھہرے آزاد خیال جس سے چاہیں فلرٹ کریں، دوستی یا محبت کریں۔“ غنوی نا چاہتے ہوئے بھی پھر سے ٹپک ہو گئی تھی۔

”اوکے، سلوئی سے میری بات کراؤ۔“ پاسر ضبط کرتے ہوئے بولا۔

”کیوں کیا کہنا ہے اسے؟“

”اسے بتا دو کہ میں پرسوں شام امی ابا کو لے کر آ رہا ہوں شادی کی تاریخ لینے کے لئے اور یہ بھی بتا دو کہ میں نے امریکہ والی جاب آفر قبول کر لی ہے شادی کے بعد میں اور میری دلہن

امریکہ چلے جائیں گے اور بائی دے دے سلوئی کا سیل فون کیوں آف ہے؟“ پاسر نے سنجیدگی اپنی بات مکمل کرتے ہوئے آخر میں پوچھا، وہ سر سے پاؤں تک شاک میں آگئی تھی اس کی شادی کی بات وہ سلوئی کے حوالے سے جان کر اسے اپنی ساعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، بدگمانی اس کی جڑوں میں بیٹھ گئی تھی۔

”اس کی مشکوک حرکتوں کی وجہ سے بند ہے۔“  
”واٹ؟“  
”جی۔“

”بات کراؤ میری سلوئی سے۔“  
”اگر نہ کراؤں تو؟“

”تو میں ابھی تمہارے گھر آ جاؤں گا اس سے ملنے کے لئے۔“

”تو آ جائیں آج ایس کھیل کا ڈراپ سین ہوئی جائے۔“ غنوی نے ٹپک سے کہا۔

”تم واقعی اپنے حواسوں میں نہیں ہو امی ابا کو لانے سے پہلے مجھے خود آنا پڑے گا تمہارے دل و دماغ پر لگے جالے صاف کرنے کے لئے اور میں آ رہا ہوں آج بات ہوگی اور صاف صاف بات ہوگی وہ بھی سب کے سامنے، ویٹ اینڈ واچ۔“ پاسر نے تیز لہجے میں کہا اور کال منقطع کر دی۔

”یا اللہ! خیر امی ابو کے سامنے بات ہوگی تو میں کیا جواب دوں گی پاسر کی باتوں کا؟“ غنوی اب فکر میں ہلکان ہونے لگی تھی۔

”امی! یہ سب کون لایا ہے؟ افطار پارٹی ہے کیا گھر میں؟“ سلوئی عصر کی نماز ادا کر کے کچن میں آئی تو میز پر رکھے ریسٹورینٹ کے ڈبوں اور شاپرڈ کو دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”وجاہت کے کچھ مہمان آ رہے ہیں، انا

لے آرڈر کر کے منگوایا ہے یہ سب میں نے کہا کی تھا کے مجھے بتاتے گھر میں سب بنا لیتے ہم مگر اس نے ہمیں زحمت نہ ہو اس لئے سب کچھ آرڈر کر دیا خیر میں نے پلاؤ اور چکن تورمرہ بنالیا ہے تم کہاں فرانی کر لینا اور فروٹ چاٹ اور سلاڈ بھی بناؤ، ملک شیک غنوی نے بنا کے فریج میں رکھ دیا تھا نماز سے پہلے۔“

”جی بہتر۔“ سلوئی نے شامی کباب فریج سے نکالتے ہوئے بولی اور چونکی کبابوں والا شاپرڈ کال کر مڑی غنوی کا زوردار پھپر سلوئی کے دائیں کال پر پڑا۔

”غنوی یہ کیا حرکت ہے؟“ صائمہ بیگم نے حیرانگی سے دیکھا پوچھا۔

”امی اس سے پوچھیں یہ کیا چاند چڑھانے والا ہے۔“

”ہوا کیا ہے؟“ سلوئی نے کبابوں کا شاپرڈ میز پر رکھا۔

”شرم نہیں آتی تمہیں اس مبارک مہینے میں ایسی کھٹیا کرکٹیں کرتے۔“

”یا اللہ! اب کیا کر دیا اس نے؟“ صائمہ بیگم اپنا سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گئیں۔

”پاسر کا فون آیا تھا وہ اپنے ماں باپ کو لا رہا ہے اس سے اپنے رشتے کی بات کرنے بھی میں شادی کرا کے امریکہ لے جائے گا اسے۔“

غنوی نے اپنی شکی ذہنیت اور سوچ کو زبان کیادی سلوئی کے پیروں تلے سے زمین ہی کھینچ لی تھی۔

”یہ کیا بکے جا رہی ہو تم اس کی مشکلی تو تمہارے ساتھ ہوئی تھی، وہ بھی پاسر کی اپنی مرضی اور چاہ سے۔“ صائمہ بیگم صدمے میں گھر کر بولیں۔

”یہ ہے نا آپ کی لاڈلی اس سے تو ہر کسی کو ہمارا ہو جاتا ہے ایک ساتھ کتنے لڑکوں کو الو بنالیا

اس نے اور کمال ہے بھی سب کے سب اس پر فدا ایسا کیا ہے تمہارے حسن میں کے ہر کوئی تم پر ہی مرا مٹا جاتا ہے بتاؤ۔“ غنوی نے اس کی شکل دیکھتے ہوئے غصے سے کہا۔

”تمہیں بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے غنوی، ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔“ سلوئی نے دھمی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں اپنی آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا جھٹھا نہیں سکتی۔“ غنوی اسے شعلہ بار نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہائے سلوئی تم پیدا ہوتے ہی کیوں نہیں مر گئیں؟ دفعہ ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے دوبارہ مجھے اپنی شکل مت دکھانا ورنہ گلابا دوں گی میں تمہارا۔“ صائمہ بیگم غصے سے چلائیں۔

”مائی گاڈ! چچی جان، آپ تو بہت خطرناک ہیں۔“ پاسر کی آواز پر وہ تینوں چونکیں اور آواز کی سمت دیکھا تھا، پاسر بلو جینر کی پینٹ اور سکاے بلو شرٹ میں ملبوس اپنی شاندار شخصیت لئے موجود تھا، سلوئی کو کچھ حوصلہ ہوا تھا اس کے آنے سے۔

”مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی پاسر۔“ صائمہ بیگم نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے بھی آپ سب سے یہ توقع نہیں تھی۔“ پاسر بولا۔

”ہونہ، اسے کہتے ہیں الٹا چور کو تو ال کو ڈانٹے۔“ غنوی نے طنز کیا۔

”میرا خیال ہے آپ سب لاؤنچ میں آ جائیں وہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ پاسر نے سنجیدگی سے کہا۔

”پاسر آج ہے۔“ افتخار حسین چوہدری اپنے کمرے سے نکلے تھے اسے دیکھ کر بولے تو پاسر ان کی طرف چلا آیا۔

”السلام علیکم چچا جان!“ پاسر نے ان سے



مصالحہ کیا۔

”وعلیکم السلام! اچھا کیا تم خود ہی آگئے مجھے تم سے ضروری بات کرنا تھی آؤ بیٹھو۔“ افتخار حسین چوہدری سنجیدگی سے کہتے ہوئے فی دی لاؤنج میں آ بیٹھے سوائے سلوٹی کے وہ کچن میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے دکھ کو بھی سلی دے رہی تھی۔

”جی چچا جان! پہلے آپ بات کیجئے۔“ یاسر نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”یاسر میاں تم نے ہمیں خاصا مایوس کیا ہے۔“

”سیم منیر۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم نے اپنی پسند سے غنوی کے ساتھ منگنی کی تھی اور اب تم سلوٹی کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہو۔“

”یہ کس سے کہا آپ نے؟“ یاسر کو شدید رنج ہوا یہ جان کر کے معاملہ اتنا بگڑ چکا ہے۔

”میں نے غنوی کی باتیں سنی تھیں ابھی تم نے اس سے کہا ہے کہ تم سلوٹی سے شادی کرنا چاہتے ہو۔“ افتخار حسین چوہدری کا لہجہ درشت تھا، یاسر بے گل ہو کر کھڑا ہو گیا۔

”یہ میں نے کب کہا تم نے؟“ یاسر نے غنوی کی طرف تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا وہ شپٹا گئی۔

”آپ کی کال آئی کچھ دیر پہلے تب۔“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم شکی بدگمان بے اعتبار ہونے کے ساتھ ساتھ جھوٹ بھی بولتی ہو اچھا ہوا کہ تمہارے یہ سب گورہ مجھ پر پہلے ہی آشکار ہو گئے ورنہ بعد میں بہت پریشانی ہوتی مجھے۔“ یاسر نے دکھ اور افسوس بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا وہ بوکھلا گئی۔

”تم مجھ سے بات کرو یاسر۔“ افتخار حسین

چوہدری بولے۔

”پہلے سلوٹی کو بلائیں۔“ وہ بولا۔

”اس کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔“ صائمہ بیگم بولیں۔

”کیوں ضرورت نہیں ہے؟ اس کے بارے میں غلط باتیں کی جا رہی ہیں اور اسی کو انور کر رہے ہیں آپ تینوں میں بلا کر لاتا ہوں سلوٹی کو۔“ یاسر نے سپاٹ لہجے میں کہا تیزی سے گیا اور کچن میں کام کرتی سلوٹی کا ہاتھ پکڑ کر لے آیا۔

”دیکھ لیں ابو، ابھی بھی سلوٹی کا ہاتھ پکڑا ہوا ہے یاسر نے۔“ غنوی کے بدن میں حسد کی آگ پھیل گئی تھی اس سے بولی۔

”یاسر! چھوڑو اس کا ہاتھ۔“ افتخار حسین چوہدری نے غصے سے کہا۔

”کیوں چھوڑو؟ اپنے جیسا سمجھ رکھا ہے مجھے؟ آپ سب نے تو اسے اپنے شک اور بدگمانی کے کنوئس میں دھکا دے کر گرا دیا ہے اسے بے اعتبار کر دیا ہے اب مجھ سے بھی یہ توقع رکھتے ہیں کہ میں اس کا ہاتھ چھوڑ دوں اسے اس مشکل سے نکالنے کی کوشش نہ کروں؟ بڑے افسوس کی بات ہے چچا جان، آپ کا یہ روپ میرے لئے بہت شاکنگ ہے تو ذرا سوچئے کے سلوٹی جو آپ کی بیٹی ہے اس کے لئے کس قدر تکلیف کا باعث ہوگا؟“ یاسر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”کتنی محبت ہے تمہیں سلوٹی سے؟“ افتخار حسین چوہدری نے پوچھا۔

”اپنی محبت کے میں اس کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“

”نھیک ہے مجھے جواب مل گیا ہے یہ سب تماشہ کر کے ہماری عزت کا جنازہ نکالنے کی

بجائے عزت سے سلوٹی کو بیاہ کر لے جاؤ۔“ افتخار حسین چوہدری نے اپنا فیصلہ سنایا۔

”یاسر بھائی!“ سلوٹی کی حالت مایہ بے آب کی سی ہو رہی تھی۔

”میں کیوں بیاہ کر لے جاؤں؟ میں تو بیاہ کر اسے رخصت کروں گا کیونکہ یہ گھر اب اس بیماری لڑکی کے رہنے کے قابل نہیں رہا۔“ یاسر نے ان تینوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”بڑی محبت ہے تمہیں اس سے۔“ غنوی نے طنز کیا۔

”ہاں ہے محبت، اتنی محبت جتنی دنیا کا کوئی بھی بھائی اپنی بہن سے کر سکتا ہے میں اپنی بہن کے لئے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں، میری کوئی بہن نہیں ہے لیکن سلوٹی نے بہن کی کمی پوری کر دی اور ایک بھائی بہن کو آپس میں بات کرتے دیکھ کر ہستے بولتے دیکھ کر مس غنوی افتخار نے نفی گھٹیا بات اپنی تنگ ذہنیت سے اخذ کی اور آپ دونوں کو بھی اس سے بدگمان اور متنفر کر دیا، آپ ماں باپ ہوتے ہوئے بھی اس کی باتوں میں آگئے بھول ہی گئے کے سلوٹی آپ کی گودوں میں کھیلی اور آپ کے سامنے پٹی بڑھی ہے، اسے اپنے سے بڑے رشتوں کی خوشی اور بہتری عزیز ہے، یہ آپ سے زیادہ میں جانتا ہوں، رشتوں کا بھرم رکھنا آتا ہے میری بہن کو مگر آپ تینوں نے جس طرح ہمارے رشتے کا خود سلوٹی کے ساتھ اپنے رشتے کا جو تقدس پامال کیا ہے، اس کے لئے آپ خود کو کبھی معاف نہیں کر پائیں گے۔“

یاسر کا حرف حرف ان تینوں کی سماعتوں پر ہم کی طرح پھنسا تھا، وہ کیا سمجھے تھے اور اصل بات نکلی کیا تھی؟ یہ سب جان کر وہ ایک دوسرے کو الزام دیتی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو یاسر؟“ افتخار حسین

چوہدری بولے۔

”وہی جو سچ ہے اور ہاں میں امی ابا کو اپنی اور غنوی کی شادی کی تاریخ طے کرنے کے لئے یہاں بھیجنا چاہ رہا تھا جس کا غلط مطلب لیا غنوی نے مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے غنوی کے ظاہر حسن کو دیکھ کر اس کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا تھا خیال تھا کہ وہ بھی آپ سب کی طرح بہت مہذب با اخلاق اور قابل بھروسہ ہوگی مگر سب الٹ ہو گیا ایک غنوی کی منفی سوچ نے آپ دونوں کی سوچ میں یکسر بدل کے رکھ دی اور ثابت کر دیا کہ غنوی افتخار رشتوں میں دراڑیں ڈال سکتی ہے نفرت پھیلا سکتی ہے، اعتبار توڑ سکتی ہے بناج جانے اپنی ہی بہن کے کردار پر انگلی اٹھانے والی غنوی یاسر حسین کی بیوی ہر گز نہیں سن سکتی، سوہی چچا جان مگر میں ایسی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا جو مجھ پر بھروسہ نہیں کرتی مجھے میرے باپ کی کرپشن کے طعنے دینے، مجھے بھی کرپٹ سمجھنے والی غنوی کو تو میں سمجھانے آیا تھا مگر یہ تو میرے اور اپنی سگی بہن کے کردار پر بھی شک کرتی ہے اس لئے میں غنوی سے شادی نہیں کر سکتا کیونکہ شادی تو ابھی محبت اور اعتماد اور اعتبار کا رشتہ ہے شک اور بدگمانی کی بنیادوں پر اسے تعمیر نہیں کیا جاسکتا۔“ یاسر نے نہایت سنجیدگی سے اپنا فیصلہ سن کر ان سب کو حیرت و ندامت میں ڈال دیا تھا، سلوٹی خاموشی سے کچن میں چلی آئی افطاری میں بہت کم وقت رہ گیا تھا اس نے وجاہت سعید کے مہمانوں کے لئے ڈرائنگ روم میں میز سیٹ کرنے کے بعد باقی سب کے لئے بھی ڈرائنگ ٹیبل پر کھانے کے لوازمات سجائے اور وضو کرنے چلی گئی۔

☆☆☆

”افتخار ولا“ کے ڈرائنگ روم سلوٹی کی



یونیورسٹی کے وائس چانسلر، پرنسپل اور افرام رمشا موجود تھے، سلوٹی کو ان کے آنے کا پتا چلا تو حیران پریشان ہو گئی۔

”یہ سب یہاں کیوں آئے ہیں؟“ سلوٹی نے پریشان ہو کر وجہت سعید کی طرف دیکھا۔

”تمہارے کارنامے بتانے آئے ہوں۔“ غنوی طنز کرنے سے باز نہ آئی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہوں تم، تمہارے کارنامے تو میں نے بتا دیئے ہیں، اب وہ سب جو ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں نا وہ سلوٹی کے کارنامے بتانے آئے ہیں یہاں۔“ یاسر نے معنی خیز جواب دیا۔

”اس لڑکی نے ہمیں شرمندہ کرانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔“ صائمہ بیگم غصے سے بڑبڑائیں۔

”آئی! آپ سب ڈرائنگ روم میں آ جائیں۔“ وجہت سعید نے ان سے کہا۔

”بیٹا! تمہارے ممان بھی تو آنے تھے۔“ صائمہ بیگم بولیں۔

”آئی بیٹیں میرے مہمان ہیں ان سب کو میں نے ہی یہاں بلایا ہے، کیوں بلایا ہے؟ یہ آپ کو ان سے بات کر کے معلوم ہو جائے گا پلیز ڈرائنگ روم میں آ جائیں سب۔“ وجہت سعید نے نرم لہجے میں جواب دیا تو سب ہی چلے گئے۔

”سلوٹی آپ بھی آئیں۔“ وجہت سعید نے اسے مخاطب کیا۔

”آپ نے ان سب کو یہاں کیوں بلایا ہے؟“

”کیونکہ میں آپ کو مزید ذلیل ہوتے اور دکھ جھیلنے ہونے نہیں دیکھ سکتا ہے آپ تو جو ہودیں کا چاند ہیں، اماؤس کی رات میں بدلتا کیسے دیکھ سکتا ہوں میں، آئیے آج سب کو سچ معلوم ہو جائے گا اور سب کچھ بدل جائے گا۔“ وجہت سعید نے نرم محبت بھرے لہجے میں کہا تو وہ سر پر

ٹھیک سے دوپٹہ اوڑھ کر ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

☆☆☆

افطار کے فوراً بعد وائس چانسلر حبیب اللہ قریشی نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا ساری بات بتائی، افرام اور رمشا نے بھی اصل حقیقت سے ان سب کو آگاہ کیا، وہ سب سلوٹی کی سمجھداری حساس طبیعت، ذہانت اور انسان دوستی کی تعریف کر رہے تھے، اس کا شکریہ ادا کر رہے تھے، اس کے والدین کو مبارکباد دے رہے تھے، افتخار حسین چوہدری، صائمہ بیگم، غنوی کی حالت دیدنی تھی، جو کام ان کے لئے باعث دلت تھا محض ان کی منفی سوچ کی وجہ سے وہی کام در حقیقت قابل عزت شہرہ تھا ان کی بیٹی کی عزت میں خود ان کی عزت میں اضافہ ہوا تھا سلوٹی کے یونیورسٹی کے پرنسپل، وائس چانسلر اور خود وہ کلاس فیلوز احسان منند، شکر گزار تھے ان سب کی عزت پر حرف نہیں آنے دیا تھا اس نے اور بہت ہوشیاری سے دو دھوکے باز، مکار اور کرپٹ اسٹوڈنٹس کو بے نقاب کرتے ہوئے یونیورسٹی سے نکلوا دیا تھا، خفیہ رہ کر سلوٹی نے بہت اہم کارنامہ سر انجام دیا تھا، افتخار حسین چوہدری، صائمہ بیگم، غنوی گہرے صدمے سے دو چار تھے، سلوٹی کو انہوں نے اپنے باتوں اور رویوں سے کتنا دکھ پہنچایا تھا، اس پر ہاتھ اٹھایا تھا، اس کا سیل فون بھی اس سے چھین لیا تھا، یہ مہینہ رحمت رمضان المبارک تو محبت احساس مہر برداشت کا درس دیتا ہے، ایسا دیکھتا ہے نفرت بدگمانی اور غصے سے روکنے کا پیغام دیتا ہے اس ماہ رحمت میں انہوں نے فراموش کر کے اس کے پیغام کے برعکس ہر کام کیا تھا۔

غصہ نفرت بدگمانی اپنی ہی پیاری سلوٹی کو

دے ڈالی تھی، وجہت سعید کے بلائے ہوئے یونیورسٹی کے مہمان تو چلے گئے تھے مگر اب ان تینوں میں سلوٹی کے پاس جانے نگاہ ملانے کی بات نہیں تھی، غنوی کو تو یاسر کے شادی سے انکار نے شدید توہین کے احساس میں مبتلا کر دیا تھا یہ سب اس کی اپنی غلط سوچ کا نتیجہ تھا، سب کے دلوں پر پہاڑ جیسا بوجھ آ پڑا تھا اور سلوٹی کے دل میں تو اپنوں کی بدگمانیوں کے زخم ہی اتنے گہرے تھے کہ اس نے درد سے چیخنے کی بجائے اپنے لبوں پر خاموشی کے تالے ڈال لئے تھے، وہ اپنے ماں باپ اور بہن کی نظروں میں بے گناہ ثابت ہو گئی تھی، سرخرو ہو گئی تھی۔

شکرانے کے نفل ادا کرتے ہوئے ہاتھ پھیلائے تو سوائے آنسوؤں کے ہاتھوں کے کشکول میں کچھ نہ گرا تھا، یاسر بھی چلا گیا تھا سلوٹی کو سب کے سامنے سرخرو دیکھ کر لیکن غنوی کی طرف سے دل بہت کھٹا ہو گیا تھا، کتنا چاہا تھا اس نے غنوی کو اور وہ کس قدر بے اعتبار لگتی تھی کہ اس کی محبت پر ایک بار بھی اعتبار نہ کر سکی، اس نے امریکہ جانے کا مکمل ارادہ کر لیا، لیکن جانے سے پہلے وہ سلوٹی کی شادی کرنا چاہتا تھا، کیونکہ اسے احساس تھا کہ سلوٹی تکلیف اور کرب سے گزر رہی ہے اپنوں کے رویوں کی وجہ سے، اس نے سلوٹی کے بھائیوں ابصار اور اسرار کو بھی فون کر کے سلوٹی کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا احوال بتا دیا تھا، بھائیوں کو اس سے پیار تھا اور اس کے ساتھ یہ سب ہونا انہیں بھی حیرت اور تکلیف میں مبتلا کر گیا۔

☆☆☆

”تم عورتوں کی عقل واقعی گھاس چرنے لگی ہوتی ہے رانی کا پہاڑ بنا دیا تم ماں بیٹی نے، میں اپنی بیٹی کی نظروں میں چھوٹا ہو گیا اور غنوی تم نے

اپنی بہن کے بارے میں جو کچھ سوچا کہا برا کیا ہمیں بھی بدگمان کیا، یہ سب کر کے تم نے اپنا رشتہ بھلی یاسر سے ختم کر لیا، اتنا قابل لڑکا ہے وہ تمہاری شکی طبیعت نے سب ختم کر دیا، یا اللہ ہمیں معاف کر دے ہم نے اپنی معصوم بیٹی پر بہت ظلم کیا، اس کو بہت دکھ دیا ہے۔“ افتخار حسین چوہدری نے صائمہ بیگم اور غنوی کو دیکھتے ہوئے دکھ افسوس اور غصے سے کہا، غنوی احساس جرم میں گھر کر روتی ہوئی وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

”انکل! آئی کل میرے پیرنس یہاں آ رہے ہیں میرے لئے آپ کی صاحبزادی سلوٹی کا رشتہ مانگنے کے لئے۔“ وجہت سعید نے صائمہ بیگم اور افتخار حسین چوہدری کو بتایا تو خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو گئے۔

”کیا واقعی؟“ صائمہ بیگم خوش ہوتے ہوئے بولیں۔

”جی آئی! آپ دونوں کو اعتراض ہے تو؟“

”نہیں بیٹا! ہمیں اعتراض نہیں ہے تم نے تو ہماری بیٹی پر اعتبار کیا اس کا ساتھ دیا جب ہمیں اس پر اعتبار کرنا چاہیے تھا اس کا ساتھ دینا چاہیے تھا، ہم نے اس بے اعتبار کر دیا، تم جیسا اچھا انسان ہی میری سلوٹی کا مقدر ہونا چاہیے۔“ افتخار حسین چوہدری نے اس کا ہاتھ تھام پریم لہجے میں کہا۔

”شکریہ انکل! یہ میری خوش نصیبی ہو گی کہ مس سلوٹی میری شریک حیات بنیں، ایک ریکونسیٹ ہے آپ سے۔“

”کہو بیٹا؟“

”میں چاہتا ہوں کہ آپ ہمارا نکاح چاند رات کو کرادیں۔“ وجہت سعید نے سنجیدگی سے کہا تو وہ دونوں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔



”افتخار ولا“ میں گھر کے تمام مکین آچکے تھے، افتخار حسین چوہدری کے بیٹے بہوئیں ان کے بیچ سب عید منانے آئے تھے اور سلوئی کی شادی کی خبر نے انہیں حیران کر دیا تھا، وجاہت سعید کے والدین افتخار ولا میں مقیم تھے، ان کا پرپوزل قبول کر لیا گیا تھا، وجاہت سعید اور ان کی مہمی نے سلوئی کے لئے ڈھیر دن شاپنگ کی تھی، سلوئی تھی کے گم صم ہو کر رہ گئی تھی، امی ابو غنوی نے اسے منانے کی بہت کوشش کی تھی، وہ تو خاموش ہو کر رہ گئی تھی بالکل خاموش۔

صائمہ بیگم نے سلوئی کا موبائل اسے واپس کر دیا تھا، اسے نے موبائل آن نہیں کیا اب تک، ارم نے غنوی کے موبائل پر کال کی اور سلوئی سے بات کرنے کے لئے کہا تو تب سلوئی نے اپنا سیل فون آن کیا اور ارم کو نیکسٹ کیا، غنوی نے ارم کا کال منقطع کر دی۔

”ہاں ارم کیسی ہو؟“ سلوئی بولی۔  
”بہت پریشان ہوں تمہارے لئے تمہارا سیل بھی آف تھا اس لئے زیادہ پریشانی ہو رہی تھی مجھے۔“ ارم نے خلوص دل سے کہا۔

”تم کیوں پریشان ہوئی ہو اب بچا ہی کیا جس کے لئے پریشان ہوا جائے؟“ سلوئی نے بے جان لہجے میں جواب دیا۔

”سلوئی! پلیز ایسی باتیں مت کرو سب کو سب سچ معلوم ہو گیا ہے نا، تو وہ شرمندہ ہوں پریشان ہوں تم کیوں دھکی ہو رہی ہو، تم تو میری سب سے سمجھدار ذہین اور بہادر دوست ہو، زندہ دل ہو۔“ ارم نے دوستانہ محبت سے پر لہجے میں کہا۔

”دادو میری اس بہادری اور زندہ دلی کی کہ ابھی تک زندہ ہوں مگر سچ کہوں میں مسجد

فرطیہ کی طرح قائم تو ہوں گھڑی تو ہوں مگر میرے اندر اذان نہیں ہوتی اب، ٹوٹی ہوئی چیزوں کو دوبارہ جوڑا تو جاسکتا ہے لیکن پہلے کی طرح بنایا نہیں جاسکتا، سب نے مل کر بڑے یقین سے توڑا ہے مجھے اب جوڑ کے کیا کریں گے؟ میں تو بدگمانی بے یقینی اور اذیت کے اس حصار سے باہر نکلنا چاہتی ہوں اور اللہ نے اس کا بندوस्त بھی کر دیا ہے۔“ سلوئی نے بہت سنجیدہ مدھم اور تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔  
”وہ کیسے؟“ ارم نے پوچھا۔

”وجاہت صاحب مجھ سے نکاح کر رہے ہیں ان کے پیئرس آئے ہوئے ہیں یہاں، پتا نہیں کیوں وہ مجھے مجھ سے پوچھے بغیر اپنا چلے ہیں شاید میری دلی کیفیت کو اس وقت وہی ٹھیک سے سمجھ پا رہے ہیں اسی لئے مجھے نکاح کرا کے لے جانا چاہتے ہیں اپنے ساتھ چاند رات کو نکاح ہے ہمارا۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”تم خوش ہو نا؟“  
”خوشی تو میرے دل کا رستہ بھول گئی ہے ان چند دنوں میں، میں تو بس اس ماحول سے اس گھر سے دور جانا چاہتی ہوں، جنہوں نے میرا اعتبار تار تار کر دیا، میرا یقین ختم کر دیا ان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی، ان کو دیکھنے کی تاب ہی نہیں ہے مجھ میں، سب کو معاف کر کے میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں وجاہت سے نکاح کر کے ہی سہی مجھے یہاں سے فرار چاہیے۔“ سلوئی نے زخمی اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں سمجھ سکتی ہوں تمہاری کیفیت کو لیکن پلیز دل سے وجاہت بھائی کو قبول کرنا وہ بہت ناخوش آدمی ہیں تمہارا ساتھ دیا تم پر اعتبار کیا اور انکل آئی، غنوی کی نظروں میں تمہیں پھر سے باعزت اور سرخرو ٹھہرایا اس کا مطلب ہے کہ وہ تم

سے پیار کرتے ہیں، تمہاری تکلیف کو محسوس کر سکتے ہیں مجھے خوشی ہے کہ تمہارا جیون ساتھی ایک لوگ، کیئرنگ شخص بنے جا رہا ہے۔“ ارم نے دل سے کہا۔

”دعا کرتی رہنا میرے لئے مجھے دعاؤں کی بہت ضرورت ہے کیونکہ میں سب کے سامنے ٹوٹ کر کھڑا نہیں چاہتی بس خاموشی سے اسی گھر سے رخصت ہو جانا چاہتی ہوں میں یہاں ایک پل کے لئے بھی نہیں رہنا چاہتی، کب ہے چاند رات۔“ سلوئی نے دلگیر لہجے میں کہا۔

”دودن بعد۔“  
”اوکے، اس بار ماہ رمضان میں عجب آزمائش رہی مگر شکر الحمد للہ کے میں اللہ کے فضل و کرم سے سرخرو ہوئی۔“ سلوئی نے مدھم آواز میں کہا تو ارم کہنے لگی۔

”ہاں الحمد للہ، اب تم آرام کرو میں انشاء اللہ تمہارا حیرانہ شکر کر کے لے آؤں گی، آ جاؤں ناں؟“

”ہاں آ جانا تمہاری موجودگی میرے لئے ضروری ہے۔“

”ٹھیک ہے میں آ جاؤں گی تم اپنا خیال رکھو اپنے گھر والوں کے لئے نہ سہی اپنے ہونے والے گھر والے کے لئے ہی سہی، اللہ حافظ۔“ ارم نے پر خلوص لہجے میں کہا اور کال کاٹ دی۔

☆☆☆  
29 ویں روزے کی افطاری سے پہلے سلوئی کا نکاح وجاہت سعید کے ساتھ ہو گیا، ماں باپ بہن کے علاوہ خوشی سب کے چہروں سے عیاں تھی، سلوئی پر دلہن بن کر بہت روپ آیا تھا، اس نے اپنے سسرال سے آیا ہوا عروسی جوڑا اور زیور پہنے تھے، ارم اس کی اور وجاہت سعید کی تصاویر اپنے اور سلوئی کے سیل فون میں بننا ہی تھی، سرخ

عروسی جوڑے میں ملبوس سلوئی وجاہت سعید کے دل میں خوشی اور طمانیت کا احساس بن کر اتر رہی تھی، سفید رنگ کے ڈیزائنز کرتا شلوار اور سیاہ پشاور پیچل میں بہت وجہ لگ رہے تھے، یاسر انتظار حسین چوہدری، ریحانہ بیگم اور ناصر تنجی نکاح کی اس سادہ مگر پر وقار تقریب میں شریک تھے، یاسر، ناصر، البصار، اسرار نے سلوئی کو بھائیوں جیسا پیار اور دعا دے کر عشاء کے بعد وجاہت سعید کے ہمراہ رخصت کر دیا۔

سلوئی امی ابو اور غنوی سے نہیں ملی تھی، انہوں نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا تھا اور روتے رہے تھے، مگر سلوئی بھی پھر ہو گئی تھی ماں باپ کے سامنے ایک آنسو نہیں بہایا تھا، بھائیوں سے ملنے ہوئے بھی خود کو بڑی مشکل سے بکھرنے سے بچایا تھا، جو آنسو ان کے سامنے اپنی بے گناہی اور پاکیزگی ثابت نہیں کر سکے تھے وہ آنسو ان کے سامنے برا کر نہیں بھر سکتے۔ وہ کہیں کہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆  
سلوئی کا بہت شاندار استقبال کیا گیا تھا ”وجاہت ولا“ میں لاہور میں اپنے نئے بنگلے میں نئی نویلی دلہن کو لے کر آیا تھا وجاہت سعید روایتی رسمیں ادا کی گئیں، جلد عروسی کی جج دھج ڈالی تھی، ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی شاہی محل کی ملکہ کے استقبال کی تیاری کی گئی ہو، سلوئی کو اس شاندار استقبال اور دلہن کی جج کو دیکھ کر وجاہت سعید کی محبت پر یقین آ رہا تھا۔

”ارم ٹھیک کہہ رہی تھی وجاہت سعید مجھ سے محبت کرتے ہیں ایسا خوبصورت اہتمام تو کوئی محبت کرنے والا ہی کر سکتا ہے۔“ سلوئی نے کمرے کی چھاؤں کو دیکھتے ہوئے دل میں سوچا۔ وجاہت سعید نے درد کی گھڑی میں اس



کے زخموں پر اپنی محبت کے سرخ گلاب رکھ کر ان زخموں کو ڈھانپ دیا تھا، جو اسے اپنے ماں باپ اور بہن کی بدگمانی اور بے اعتباری نے دیئے تھے، اپنے ہاتھوں پر اپنے بیا کے نام کی مہندی سجائے ایک نئی زندگی میں داخل ہو چکی تھی وہ، ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنی ج دج دیکھ رہی تھی، وہ اتنی حسین ہے اسے اس لمحے خوشگوار حیرت ہو رہی تھی، اپنے ساتھ وہ جہیز کے نام پر کچھ نہیں لائی تھی، ایک بیگ میں اپنی ڈگریاں اور ڈائریاں رکھ کر لائی تھی بس، اس کے لباس، زیور، جوتوں سے سمیت ہر چیز وجاہت سعید نے اپنی پسند سے خریدی تھی۔

”یقین کر لیجئے آپ واقعی اتنی حسین ہیں کہ کسی کے بھی دل کو زیر کر سکتی ہیں۔“ وجاہت سعید بہت خاموشی سے اس کے پیچھے آکھڑے ہوئے تھے اور آئینے میں اس کے سندر بچ چہرے کو دیکھتے ہوئے گویا ہوئے تھے، اس نے چونک کر آئینے میں ان کے وجہ روپ کو دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں، چہرے پر پھیلا حزن و ملال وجاہت سعید کو اس کی کیفیت سے آگاہ کر رہا تھا، انہیں اندازہ تھا کہ اپنوں کی بے اعتباری نے اسے اندر سے توڑ دیا ہے، دکھ سے بھر دیا ہے اس کا دل اور وہ اس کو جوڑنا چاہتے تھے پیار سے اعتبار سے۔

”سلوٹی وجاہت! آپ کو نئی زندگی اور نیا گھر اپنا یہ ہم سفر مبارک ہو اور ہاں چاند رات بھی بہت بہت مبارک ہو آپ کو۔“ وجاہت سعید نے اسے شانوں سے پکڑ اس کا رخ اپنی جانب پھیرتے ہوئے محبت سے کہا۔

”آپ کو بھی مبارک ہو۔“ وہ مدہم آواز میں بولی۔

”آمین۔“ وہ بولے۔

”تھینک یو، آپ نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔“ سلوٹی نے لرزتی ہلکیوں کو اٹھایا ان کے مسکراتے مسرور چہرے کو دیکھا اور بھرائی آواز میں کہا۔

”محبت کرنے والوں کو شکر یہ نہیں کہا جاتا اور میں نے تو وعدہ کیا تھا نا آپ سے کہ میں مرتے دم تک آپ کا ساتھ دوں گا تو کیسے اکیلا چھوڑ سکتا تھا ان حالات میں آپ کو؟“ وہ محبت سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولے تو وہ انہیں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

”وہ میرے اپنے تھے جنہوں نے میری کوئی بات نہیں مانی میرا یقین نہیں کیا اور آپ نے خاموش رہ کر بنا کچھ کہے، بنا جتائے میرا کہا مان لیا، میرا ساتھ بھی دیا، میری سچائی بھی ان کے روبرو پیش کر دی کیوں؟“

”جو آپ کو اچھا لگے نا اس کے بارے میں ہمیشہ اچھا گمان رکھنا چاہیے، اس کو مان دینا چاہیے اس کی مان لینا چاہیے جو نہیں مانتے وہ ہی نقصان اٹھاتے ہیں اور ماننے والوں کو تو من و سلوٹی تک ملتا ہے جیسے مجھے مل گیا، آئی مین مل گئیں ”سلوٹی“ میں بہت خوش ہوں آپ کو پا کر اور انشاء اللہ تعالیٰ آپ کو بہت محبت اور عزت سے رکھوں گا ہمیشہ ہر خوشی دینے کی کوشش کروں گا۔“ وجاہت سعید نے ہیرے کا برسلٹ اس کی نازک کلائی میں پہناتے ہوئے مسکراتے محبت و مسرت سے پر لہجے میں جواب دیا۔

”بدل تو نہیں جائیں گے آپ؟“ دل کے خدشے کو زبان دی۔

”بھی نہیں۔“ وہ اس کی کیفیت اور حالات کو سمجھ سکتے تھے، جانتے تھے کہ وہ یہ سوال کیوں کر رہی ہے؟

”تھینک یو۔“ سلوٹی کی آنکھوں سے خود

بخود آنسو بہہ نکلے۔

”ارے خوشی کے موقع پر روتے تھوڑی ہیں۔“ انہوں نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر پیار سے اس کا سندر چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں تو دکھ ملنے پر بھی نہیں رو سکی کیونکہ جو دکھ دیتے ہیں نا ان کے سامنے رونا نہیں چاہیے۔“ وہ ہنسی کی آواز میں بولی۔

”ہوں، ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ لیکن جو خوشی دینا چاہتے ہیں ان کے ساتھ اپنے دکھ، اپنے غم بھی شیئر کر لینے چاہئیں۔“

”جو خوشی دے، محبت اور عزت دے اس سے غم کی بات کرنا اچھا تو نہیں ہوتا نا؟“ وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

”اچھا! تو پیار کی بات کر لیں وہ تو اچھا ہوتا ہے نا؟“ وجاہت سعید نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے کس سے دھکا دیا اس کے اشکوں کی کی ان کے ہاتھوں میں جذب ہو گئی۔

”میں فی الحال آپ کو آئی لو تو نہیں کہہ سکتی، ہاں یہ ضرور کہہ سکتی ہوں کہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی، آپ بہت اچھے ہیں اور میں دل سے آپ کی عزت کرتی ہوں آپ کی خوشی کا خیال رکھنے کی پوری کوشش کروں گی انشاء اللہ۔“ سلوٹی نے انہیں دیکھا پھر نگاہیں جھکا کر دل سے کہا تو وہ خوشی سے نہال ہو گئے۔

”اور پیار کرنا کسے کہتے ہیں کہہ تو دیا آپ نے، آئی لو۔“ وجاہت سعید نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ شرمناک رہنے پڑی، وجاہت سعید اس کی ہنسی پر نثار ہو گئے۔

☆☆☆

My silence is just another word for my pain.

عید کی صبح تھی، وجاہت سعید کے محبت و

اپنائیت بھرے ساتھ نے اسے آنسوؤں سے دور رہنے پر آمادہ کر لیا تھا، آج بھی وہ دلہن کی طرح تیار ہوئی تھی، مون لائٹ اور بلوکر کے عمدہ کا مدار اسٹائلش لباس میں ڈائمنڈ کا جیولری سیٹ پہنے خوبصورت میک، مگر جوں کی مہک میں رچی بسی سلوٹی وجاہت کسی حور سے کم نہیں دکھ رہی تھی، وجاہت سعید سفید شلوار قمیض اور اسٹائلش چنل پہنے عید کی نماز ادا کر کے سعید رضا احمد کے ساتھ گھر آئے تھے۔

سلوٹی کے موبائل پر گھر سے کئی بار کال اور ٹیکسٹ میسج آچکے تھے مگر اس نے اپنا موبائل سائلٹ پر کر دیا تھا تا کہ نہ اسے ان کی کالز آنے کا علم ہو نہ ہی وہ وجاہت کے سامنے کال اٹینڈ کرنے پر مجبور ہو، ان دونوں کا ولیدہ عید کے چوتھے روز کرچی میں ہونا تھا۔

”السلام علیکم مزر سلوٹی وجاہت! عید مبارک۔“ وجاہت سعید اپنے بیڈروم میں چلے آئے اور اپنی محبت نئی ٹوبلی ڈھن سلوٹی کو دیکھتے ہوئے خوشگوار موز میں بولے۔

”ولیکم السلام! آپ کو بھی عید مبارک۔“ سلوٹی نے انہیں دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے جوابا کہا۔

”کیسی ہیں جان؟“ وجاہت نے اس کے قریب آتے ہوئے، پیار سے پوچھا تو وہ الٹا انہیں سے پوچھنے لگی۔

”آپ کو کیسی لگ رہی ہوں؟“

”مجھے میری اس جنت کی حور لگ رہی ہیں ویسے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ یوں سولہ سنگھار کر کے اور بھی حسین لگنے لگیں گی۔“ وجاہت سعید نے اس کے ہاتھ تھام کر دل سے کہا۔

”مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ آپ اس قدر



”اس میں بھی آپ کا کمال ہے ورنہ ہم خود بھی اپنی اس خوبی سے لاعلم ہی تھے اب تک۔“ وہ ہنس کر بولے۔

”اچھا! وہ مسکرائی۔

”ہاں سچ کہہ رہا ہوں اور یقین رکھیے آپ کو ہتھیلی کا چاند بنا کر رکھوں گا۔“ وجاہت سعید نے پیار سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہتھیلی کا چاند لوگ تو ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھنے کی مثال دیا کرتے ہیں۔“ سلوئی نے حیرانگی سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے اس کے حنائی ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولے۔

”ہاتھ کا چھالا تو تکلیف دیتا ہے نا، تو میں آپ کو تکلیف کیوں؟ کیوں؟ کیوں بناؤں؟ آپ تو میرے ہاتھوں کو لکیروں میں پھیلی روشنی ہیں، میری ہتھیلی کا چاند ہیں وہ چاند جو اندھروں میں چمکتا ہے اور راہ دکھاتا ہے محبت کی راہ، آپ نے تو میرے دل کو دھڑکنے کا نیا انداز بخشا ہے، مجھے جینے کی ایک نئی راہ دکھائی ہے آپ تو سراپا محبت ہیں انعام ہیں۔“

”اب میں ایسی بھی قابل تعریف نہیں ہوں آپ کو مسکے لگانے کا شوق تو نہیں ہے؟“ وہ شرماتے مسکراتے ہوئے بولی تو وہ ہنس پڑے۔

”اچھا ہمارا پیار اور ستائش، تعریف آپ کو مسکے لگتی ہے۔“

”ہوں۔“ وہ شرارت سے مسکرائی۔

”یو نو سلوئی! یو آر ویری ناٹی۔“ وجاہت سعید نے اس کی ستواں ناک پکڑ کر شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

”ماشاء اللہ آپ ہنستی بھی ہیں، اب یہ ہنسی چھپا کر مت رکھیے گا ہمیں وقتاً فوقتاً دیدار کرنی رہے گا۔“

”جی بہتر اب چلے می ویٹ کر رہی ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”جو حکم بیگم صاحبہ! آئیے شیر خورہ کھانے کے بعد ہم آپ کے گھر جائیں گے۔“ وجاہت سعید مسکراتے ہوئے بولے۔

”میرا تو گھر یہ ہے نا۔“ وہ جان بوجھ کر انجان بننے ہوئے بولی۔

”یہ گھر تو اب ہے ہی آپ کا، میں آپ کے میکے کی بات کر رہا تھا۔“

”میں وہاں نہیں جاؤں گی۔“

”کیوں؟ کیا معاف نہیں کیا انہیں؟“

”معاف تو اسی دن کر دیا تھا۔“ وہ بولی۔

”معاف کر دیا ہے مگر ملنا نہیں چاہتیں، وہ کہتے نا کے زبان سے معاف کرنے میں وقت نہیں لگتا مگر دل سے معاف کرنے میں عریں بیت جاتی ہیں ایسا ہی ہے نا سلوئی؟“ وجاہت سعید نے دھیمے پن سے کہا۔

”شاید ان کی پرسوں کی محبتوں کا حق تھا مجھ پر کے ان کی ایک غلطی بدگمانی معاف کر دی جائے ماں باپ بھی تو ہماری اپنی اولاد کی بہت سی غلطیاں معاف کرتے ہیں، نظر انداز کرتے ہیں ناں پھر میں کون ہوتی ہوں انہیں معاف نہ کرنے والی یا ناراضگی بالنے والی؟“ سلوئی نے بید کے کنارے پر بیٹھ کر سنجیدگی سے کہا۔

”مجھے آپ سے اسی دریا دل کی اعلیٰ ظرفی کی توقع تھی پھر وہاں جانے میں کیا عذر ہے؟“ وہ محبت اور فخر سے بولے۔

”ابھی زخم تازہ ہے او میں اتنی بہادر نہیں ہوں کہ اپنے زخموں پر نمک چھڑکنے خود ہی چل پڑوں۔“

زخم ہر اے درد بڑا ہے

ایسے میں ہنسنا بھی مشکل یوں سمجھو کہ وقت کڑا ہے سلوئی نے سنجیدہ مگر نرم لہجے میں جواب دیا۔

”میں سمجھ رہا ہوں آپ کی تکلیف، لیکن اتنا ضرور بتانا چاہوں گا کہ آپ کے پیرئس کئی بار مجھے کال کر چکے ہیں میں نے انہیں کہا تھا کہ ہم ان کی طرف آرہے ہیں بٹ اب منع کرنا پڑے گا۔“ وجاہت سعید نے سنجیدگی سے کہا۔

”جی منع کر دیجئے، آئی ایم سوری آپ کو میری وجہ سے۔“

”پلیز سلوئی!“ وجاہت سعید نے اس کے لبوں پر اپنی شہادت کی انگلی رکھ دی۔

”چھوڑیں سب باتیں می پاپا ویٹ کر رہے ہوں گے مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے کچھ کھالیں پہلے۔“

”جی ضرور۔“ وہ سنبھل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

صائمہ بیگم، افتخار حسین چوہدری اور غنوی کی عید روتے ہوئے افسردہ اور اداس گزری تھی، سب سے زیادہ فصور غنوی کا تھا اور سب سے زیادہ گلٹ میں بھی اسی کو محسوس ہو رہا تھا، وجاہت سعید اور سلوئی کا ولیمہ بہت شاندار ہوا تھا، سلوئی کے گھر سے اس کے بھائیوں اور ان کی بیوی بچوں نے ویسے میں شرکت کی تھی، ویسے کے بعد وجاہت سعید سلوئی کو لے کر ہنی مون پر نیپال اور تھائی لینڈ چلے گئے۔

☆☆☆

سلوئی کو وجاہت سعید کی رفاقت نے پہلے سے زیادہ خوبصورت اور دلکش بنا دیا تھا، وہ دونوں ایک دوسرے کی سنگت میں بہت خوش تھے، سلوئی کے دل میں امی ابو اور غنوی کی بے اعتباری اور

سعید کے ساتھ میں جہاں اس پر زندگی کے نئے رنگ، نئے زاویے منکشف ہوئے تھے وہیں وجاہت سعید پر بھی سلوئی کی بہت سی خوبیاں عیاں ہوئیں تھیں، وہ بہت زیادہ لوگ تھی، کثیر رنگ تھی، کپڑے باز کر کے والی تھی، رشتوں کو جوڑے رکھنے کی خود بھی اس میں۔

”بس اپنے والدین اور بہن سے دور رہ کر انہیں بھی یہ احساس دلانا چاہتی تھی کہ بنا سوچے سمجھے کچھ بھی کہہ دینا، بنا تحقیق کے الزام لگانا، آنکھوں دیکھا جھوٹ، سچ مان لینا، دوسرے شخص کو صفائی کا موقع دینے بنا اسے مجرم قرار دے کر اپنا فیصلہ سنا دینا سراسر غلط ہے۔“ اور وجاہت سعید اس کی اس سوچ میں اس کے ہم خیال تھے، وقت کا گزرتا اور سلوئی کا اپنے میکے سے دور رہنا ان سے رابطہ نہ رکھنا ان تینوں کو شدت سے اپنی غلطی کا احساس دلانا رہتا تھا، وہ سیکھ گئے تھے، سمجھ گئے تھے کہ بہت سے سبق ہم دوسروں کو پڑھاتے ہیں مگر خود بھول جاتے ہیں عملاً ایسا وقت ہماری زندگی میں آجائے تو ہمارا رویہ زیر و ہوتا ہے، افتخار حسین چوہدری کو بہت زیادہ شرمندگی تھی اپنے رویے پر سلوئی نے اپنا سبیل نمبر تبدیل کر لیا تھا صرف ارم کے پاس اس کا نیا نمبر تھا اور اس نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا کہ اس کا نیا نمبر وہ کسی کو نہیں دے گی، شیراز چاند یونیورسٹی سے نکالے جانے کے بعد دوپٹی چلا گیا تھا اپنے باپ کے حکم پر اس کے کارنامے سب کے سامنے آچکے تھے لہذا وہ انہیں انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں سو اسے دوپٹی جانا پڑا اور اپنے چچا کے جنرل اسٹور پر کام بھی کرنا پڑ رہا تھا۔

یاسر امریکہ واپس چلا گیا تھا، غنوی کی منفی سوچ اور رویے کا دکھ اسے ساتھ لے گیا تھا،



کے ذریعے سلوئی کے ماں باپ سلوئی کی خیریت معلوم کرتے رہتے تھے اور ان سے ملوانے کی ریکویسٹ بھی ہمیشہ کرتے تھے، غنوی نے بھی کئی بار وجاہت سے کہا کہ وہ سلوئی کا سیل نمبر اسے دے دیں یا اس کی بات کرا دیں مگر سلوئی کی خاموشی نے ایسا ممکن نہیں ہونے دیا تھا، آج پھر غنوی کی کال آئی تھی اس نے روتے ہوئے وجاہت سعید سے التجا کی تھی کہ سلوئی سے اس کی بات کرا دیں انہوں نے اس سے وعدہ کر لیا، سلوئی کوئی ٹیکسٹ لے یہ وہ نہیں چاہتے تھے کیونکہ اللہ کے فضل و کرم سے سلوئی ماں بننے والی تھی، اتنی بڑی خوشی بھی وہ اب تک اپنے میکے والوں سے چھپائے ہوئے تھے اور وجاہت نے تو اسے سچ سچ چھپیلی کا چاند بنا کر رکھا ہوا تھا، اسی لئے وہ اس کی توقع کے خلاف کچھ بھی کرنے سے ڈر رہے تھے کہ کہیں وہ اس کی اثر لے کر اپنی طبیعت نہ خراب کر لے مگر آج بہت مجبور ہو کر انہیں غنوی کو سلوئی کا سیل نمبر دینا پڑ رہا تھا، تا کہ سلوئی بھی اس اذیت سے نجات پالے۔

”سلوئی جانی! ایک بات تو بتائیں، اگر مجھ سے کبھی کوئی غلطی ہوگی تو کیا آپ مجھے معاف کر دیں گی؟“

شام کی چائے پیتے ہوئے وجاہت نے سلوئی کو محبت سے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

”جن سے محبت ہو ان کے لئے تو معافی ہو معافی ہوتی ہے۔“

”یعنی آپ مجھے معاف کر دیں گی؟“

”بالکل۔“

”اوہ، تھینک یو، بچت ہو گئی شکریہ۔“ وہ ریلیکس ہو کر بولے۔

”اب ذرا اپنی غلطی بھی بتا دیں؟“ وہ چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے بولی تو انہوں نے

نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھو نیلی میں نے انہیں آپ کا سیل نمبر سینڈ کر دیا ہے کچھ دیر پہلے۔“

”اچھا!“ وہ ان کے چہرے پر نگاہ ڈال کر بولی۔

”سلوئی! آئی تھینک غنوی نے بہت سزا جھیل لی ہے آپ ان سے بات کر کے ان کی سزا ختم کر دیں میری بات کا مان رکھ لیں پلیز۔“

”آپ کو پلیز کہنے کی ضرورت نہیں ہے اچھا۔“ سلوئی نے غلطی سے اسے دیکھا تھا، جواب میں وہ اپنے کان پکڑ کر بولے۔

”اچھا بابا! سوری آئی لو یو۔“

”آپ بھی نا۔“ وہ شرما کر ہنس پڑی۔

”لیجئے کال آگئی، آپ کی ہمشیرہ کی آپ بات کیجئے میں چیچ کر کے آتا ہوں۔“ وجاہت سعید نے سلوئی کے موبائل پر آنے والی کال چیک کرتے ہوئے اس کا سیل ٹون اٹھا کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

”ہیننس۔“ سلوئی نے مسکراتے ہوئے موبائل لے لیا۔

”السلام علیکم!“ سلوئی نے وجاہت کے کمرے میں جاتے ہی کال رسیو کی۔

”وعلیکم السلام! کیسی ہو سلوئی؟“ دوسری جانب حسب توقع غنوی بول رہی تھی۔

”الحمد للہ! بہت اچھی ہوں۔“ سلوئی سنجیدگی سے بولی۔

”ہاں اچھی تو تم ہو مگر بہت اچھی نہیں ہو۔“ غنوی نے کہا چند لمحے اس کے جواب کا انتظار کرتی رہی جب سلوئی کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو گویا ہوئی۔

”پوچھو گی نہیں کہ میں نے تم سے یہ کیوں کہا؟“

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”میرے لئے اب یہ چیزیں، یہ باتیں معنی نہیں رکھتیں کون مجھے اچھا یا برا سمجھتا ہے، سچ یا غلط کہتا مانتا ہے یہ سب میں بہت پیچھے چھوڑ آئی ہوں، ہر رشتہ بدل سکتا ہے، ہر رشتے کا رویہ اور لہجہ سے کی ایک جنبش سے تبدیل ہو سکتا ہے اس کا اندازہ ہو چکا ہے مجھے تو بتاؤ فون کس لئے کیا ہے؟“ سلوئی نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا تو وہ غی سے گویا ہوئی۔

”تم بہت اچھی نہیں ہو سلوئی کیونکہ تم نے ہمیں اپنے گھر والوں کو اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے غیروں کی عزتیں بچانے کے لئے خود کو برا بنا کر تم نے تو تنہی سمیٹ لئے امی ابو کی طرف سے مگر مجھے ایک غلطی کی سزا اب تک بھگتنا پڑ رہی ہے جب سے حقیقت کھلی ہے امی ابو مجھ سے ٹھیک سے بات تک نہیں کرتے امی اٹھتے بیٹھتے تجھے طعنے دیتیں ہیں کہ میری وجہ سے انہوں نے تم پر شک کیا تمہیں ابو کی نظروں میں بھی گرا دیا، تم تو سرخرو ہو کر دہن بن کر چلی گئیں اور میں امی ابو کی خاموش اور دبے دبے لفظوں میں جتنا کئی ناراضگی بھگت رہی ہوں اور تو اور میں نے یا سر کو بھی کھو دیا۔“

”یا سر بھائی کو تم نے اپنی شکی طبیعت کی وجہ سے سویا ہے اس نے مجھے اذیت دو، تم نے میری ہر بات کو رد کر دیا، غلط سمجھا تھا تو اب مجھ سے گلہ کیوں کر رہی ہو، میں نے تو تم سب کو معاف کر دیا تھا بہت پہلے۔“ سلوئی اس کے لہجے کی سختی سے کٹ کر بولی۔

”معاف کر دیا تھا ملنا بات کرنا بھی تو بند کر دیا نا، خاموش انتقام لے رہی ہو تم ہم سب سے جب تک تم گھر نہیں آؤ گی تب تک امی ابو بھی

مجھے دل سے معاف نہیں کریں گے وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے تم میری وجہ سے ان سے دور ہوئی ہو۔“ غنوی سلکتے تیز لہجے میں بولی۔

”تو اس میں غلط کیا ہے؟ انہیں تمہاری منگنی ٹوٹنے کا دکھ بھی ہے غنوی تم بھول رہی ہو کہ تمہاری منگی سوچ اور رویے نہ یہ حالات پیدا کیے تھے۔“ سلوئی نے یاد دلایا۔

”ہاں تو تم مثبت رویے سے یہ حالات بہتر کر دونا، تم تو بڑی مدرثریسا، امن و محبت کی فاختہ ہو کر دو سب ٹھیک، یا سر سے کراد میری شادی۔“ غنوی نے طنزیہ اور خود غرضانہ لہجے میں کہا تو سلوئی کے بدن میں درد کی لہریں دوڑنے لگیں، وہ کیسی تلخ، خود غرض اور بے مطلبی ہو رہی تھی، اپنی غلطی ماننے کے باوجود پھر سے پرانے سوڑ میں آ چکی تھی۔

”یا سر بھائی کے ساتھ بد تمیزی، بد کلامی ہمیشہ تم نے کی، ان پر شک تم نے کیا پھر ان سے شادی کی خواہش کس لئے کر رہی ہو یاد ہے نا انہوں نے یہ منگنی کیوں توڑی تھی؟ سچ کہوں تم یا سر بھائی کو ڈیز روئی نہیں کرتیں تھیں، انہوں نے تمہیں سر آنکھوں پر بٹھانا چاہا مگر تم نے ان کی محبت اور خلوص کو اپنے شک کے جوتے تلے روند دیا، اب تمہیں کوئی حق نہیں ہے ان کا نام لینے کا۔“ سلوئی نے صاف لائمرزم لہجے میں جواب دیا۔

”دس بار معافی مانگی ہے میں نے مگر وہ تو گونگے کا گڑ کھا کے بیٹھے ہیں جواب تک نہیں دیتے میرے میسر کے۔“

”چلو تم نے معافی مانگ لی، اچھا کیا، معاف کرنا نہ کرنا ان کا مسئلہ ہے تم نے اپنا فرض ادا کر دیا نا تو بے کلی کس بات کی ہے؟“ سلوئی



نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”شاید اس لئے ہے کہ پیار ہو گیا ہے مجھے یاسر سے۔“

”پیار کرنے والے اتنے سخت، تلخ اور شکنی تو نہیں ہوا کرتے جتنی تم ہو۔“ سلوئی بولی۔

”ای ابو مجھ سے خفا خفا ہیں، یاسر مجھ سے دور ہیں صرف تمہاری وجہ سے۔“ وہ غصے سے بولی۔

”ذرا سوچو، جب تمہاری وجہ سے امی ابو مجھ پر غصے ہوئے تھے ہاتھ اٹھایا تھا مجھ پر، سب میرے دل پر کیا گزری ہوگی؟ اگر تمہیں احساس نہیں ہے اس اذیت اور تکلیف کا تو مجھ سے گلہ کرنے کا حق بھی نہیں رکھتیں تم، اپنوں کو اپنائیت سے، نفرت کی محبت سے غصے کو گل سے ہینڈل کیا جاتا ہے مانی ڈیر سسڑ اور جس دل میں شک ہوتا ہے وہاں محبت کا بصر انہیں ہوتا۔“ سلوئی نے نرمی سے اسے سمجھانا چاہا۔

”تم میرے لئے کچھ کر سکتی کہ نہیں؟“ غنوی نے اس کی باتوں کو سنائی کرتے ہوئے پوچھا۔

”میں تمہارے لئے صرف دعا کر سکتی ہوں اللہ تعالیٰ تمہیں سچی توبہ معافی اور اپنی غلطیوں کو ماننے اور سدھارنے کی توفیق دیں، اللہ حافظ۔“ سلوئی نے سنجیدگی سے جواب دیا اور کال منقطع کر دی۔

☆☆☆

”یاسر بھائی! وہ آپ سے بہت پیار کرتی ہے بس اپنی انا کی وجہ سے مان نہیں رہی، آپ ہی بان جایئے۔“ سلوئی نے غنوی کی باتوں کی ٹینشن دور کرنے کی غرض سے یاسر کو کال ملا کر کہا۔

”میری پیاری بہنا، تم جانتی ہو نا کہ انا

رشتوں کو کھاتا جاتی ہے اور پیار محبت میں کیسی انا؟ اسے سمجھنا ہو گا کہ رشتے اور محبتیں بہت اصول ہوتی ہیں ایسے ہی نہیں مل جاپا کرتی، بن مانگے مل رہی تھی نا اسے میری محبت جیسی اسے قدر تھی نہ احساس، اب اگر احساس ہو ہی گیا ہے تو اس کا زبان سے کہنا ضروری ہے اگر تو وہ خود مجھ سے اظہار محبت کرتی ہے تو اس کا مطلب ہو گا کہ وہ اپنی انا کو پس پشت ڈال کر میری طرف بڑھی ہے اور محبت واقعی اس کے لئے بھی اصول ہے ورنہ.....“ یاسر نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر بھی پوری کر دی تھی۔

”سچ کہا آپ نے۔“ سلوئی بولی۔

”تم یہ بتاؤ مجھے ماموں بننے کی خوشخبری کب سنارہی ہو؟“

”انشاء اللہ بہت جلد۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”انشاء اللہ، اپنا بہت خیال رکھو غنوی کی ٹینشن مت لو اسے میں ٹھیک کر لوں گا، میں کیا تم نے ٹھیک کر ہی دیا ہے بس فاسٹ ٹچ میں دیدوں گا۔“ یاسر نے دوستانہ لہجہ میں کہا۔

”اوکے بھائی! آپ بھی اپنا خیال رکھیے گا پھر بات ہوگی، اللہ حافظ۔“

”اللہ حافظ، ٹیک کیئر۔“ یاسر نے جوابا کہا اور فون بند ہو گیا۔

☆☆☆

غنوی کی باتیں سوئیوں کی طرح سلوئی کے بدن چھ رہی تھیں، وہ بہن ہو کر اتنی بے حس کیسے ہو سکتی تھی کہ اتنے عرصے بعد بھی اس نے بات کی تو اپنی غرض کے لئے کی، اسے اپنے سوا کسی کے جذبات احساسات اور حالات کی فکر ہی نہیں تھی، اسے رتی برابر پروا نہیں تھی کہ اس کی بہن سلوئی اپنے میکے سے دور کیا سوچتی ہوگی، بظاہر وہ جتنی بھی بے پروا تھی امی ابو اور غنوی کی طرف سے

لیکن اس کی ہر دعا میں وہ تینوں سب گھر والے شامل رہتے تھے ہمیشہ، سلوئی نے ذہن میں وہ سارا واقعہ ابو اور غنوی کا خود پر ہاتھ اٹھانا، غنوی امی ابو کی وہ الزام دیتی باتیں، غصے سے اوٹشک میں ڈوبی نظریں سب فلم کی طرح ذہن وہ نگاہ کے پردوں پر چل پڑا تھا، آنسو خود بخود آنکھوں کے کناروں سے بہہ نکلے تھے، اس کی طبیعت خراب ہو رہی تھی، وہ اٹھ کر بیٹھی سائیڈ ٹیبل پر رہے کلاس لوانٹھایا ہی تھا کہ کلاس چسل کے نیچے فرش پر جا گرا اور چپکنا چور ہو گیا، گلاس ٹوٹنے کی آواز سے وجاہت بھی جاگ گئے، سلوئی کی حالت دیکھ کر گھبرا کر اٹھے۔

”سلوئی، کیا ہوا؟“

”مجھے ہوسپٹل لے جائیں وجہہ۔“ اس نے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔

”وہ پیار سے آئیں وجہہ کہا کرتی تھی۔“

”اوکے ہنی ڈونٹ وری ہم ابھی ہوسپٹل جاتے ہیں۔“ وجاہت نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے ہالے میں لے کر پیارے کہا اور مچی آواز دی اور آنا فانا سلوئی کو لے کر ہوسپٹل پہنچ گئے۔

☆☆☆

”ضرور غنوی نے سلوئی سے کوئی ایسی بات کہی ہوگی جس کی انہوں نے ٹینشن لی ہے اور طبیعت بگڑ گئی ہے ابھی تو پندرہ سولہ دن باقی تھے ڈیوری میں، میری غلطی ہے کہ میں نے غنوی کو سلوئی کا سیل نمبر دے دیا کچھ دن مزید ناتواں رہتا تو یہ سب نہیں ہوتا۔“ وجاہت سعید نے سوچا وہ ایک پرائیویٹ ہوسپٹل میں لائے تھے سلوئی کو جہاں اس کا چیک باقاعدگی سے چیک اپ ہو رہا تھا، ڈاکٹر خالدہ بہت اچھی اور ماہر گائنا لوجسٹ تھیں۔

بعد اس کا آپریشن کرنے کے لئے کہا تھا کیونکہ سلوئی کا لی بی بائی ہو رہا تھا اور انہوں نے می پاپا کے کہنے پر ڈاکٹر کو آپریشن کی اجازت دیدی۔

”یا اللہ! میری بیوی اور بچے کو اپنی امان میں رکھنا انہیں کچھ نہ ہو سب بہتر ہو آپریشن خیریت سے ہو جائے۔“ وجاہت سعید نے قریبی مسجد میں جا کر نماز حاجت ادا کر کے سلوئی اور اپنے ہونے والے بچے کی صحت سلامتی کی ذمہ داریوں دعا میں مانگیں اور ان کی دعا میں رنگ لے آئیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک خوب صورت اور صحت مند بیٹے سے نوازا تھا، وہ بہت خوش تھے، خبر ملتے ہی عمدہ شکر بجالائے۔

”آپ نے تو میری جان ہی نکال دی تھی کیا ضرورت تھی ٹینشن لینے کی؟ مجھ سے شیئر نہیں کر سکتیں تھیں؟“ سلوئی کے ہوش میں آنے پر وجاہت سعید نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے پیار بھرا شکوہ کیا۔

”کیا ہوا ہے؟“ وہ مدھم آواز میں بولی۔

”کچھ نہیں۔“ وہ اسے مزید سڑسڑیں نہیں دینا چاہتے تھے لہذا بات گول کر گئے۔

”الحمد للہ! ہمارا بیٹا ہوا آپ کو بہت بہت مبارک ہو، کیا آپ خوش نہیں ہیں وجاہت؟“ سلوئی نے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا، بچہ اس وقت نرسری میں تھا اور می وہیں گئیں تھیں اپنے پوتے کو دیکھنے کے لئے۔

”میں بہت زیادہ خوش ہوں سلوئی، مگر دل بہت ڈرا ہوا ہے ابھی تک، آپ کی طبیعت جو اچانک خراب ہو گئی تھی۔“ وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

”اتنا پیار کرتے ہیں آپ مجھ سے۔“

”یقین دلائے کی ضرورت ہے کیا؟“

”نہیں۔“ وہ اسے مزید سڑسڑیں نہیں دینا چاہتے تھے۔



ہوئے بولی۔

”ہوں۔“

”جی۔“ وہ بولی۔

مانگے جو کوئی مجھ سے تیرے نام کا صدقہ میں خود کو پھینک دوں تیرے سر سے وار کر وجاہت سعید نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے بڑے دل سے یہ شعر پڑھا تو سلوی نے تڑپ کر ان کے لبوں پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”ایسے نہیں کہتے، آپ ہیں تو میں ہوں اتنا پیار دے کر جان وارنے کی باتیں مت کریں۔“ وہ محبت بھرے لہجے میں بولی۔

”اچھا جناب! نہیں کہتے یہ بتائیں اکل آنٹی کو کال کر کے بتائیں کہ وہ نانانی بن چکے ہیں ہم نے ابھی تک ان سے یہ خبر چھپا رکھی تھی؟“

”چند روز اور سہی۔“ سلوی بولی۔

”یعنی۔“

”یعنی ہم خود وہاں جائیں گے اپنے بیٹے کو لے کر انہیں سر پرانز دیں گے۔“

”آپ نے تو مجھے بھی سر پرانز کر دیا یہ بات کہہ کر۔“ وجاہت سعید مسکراتے ہوئے مطمئن لہجے میں بولے۔

”اس بار چاند رات ہم امی ابو کے گھر منائیں گے اور عید کا دن بھی ٹھیک ہے ناوجیہہ؟“ سلوی انہیں دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”ایکدم ٹھیک ہے جان من، مجھے آپ کے اس فیصلے سے بہت خوشی ہوئی ہے، پورا گریٹ۔“ وجاہت سعید نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے کہا اور اس کے ہاتھوں کو محبت سے چوم لیا۔

☆☆☆

سلوی کی وجاہت کے ساتھ شادی کے بعد سہ ماہی ان کے گھر میں رہنے لگی۔

اپنے میکے سے گئی تھی اور آج وہ ہنسی، خوشی اور مطمئن دل کے ساتھ واپس آئی تھی، سب گھر والے سلوی کی وجاہت اور ان کی گود میں ننھے منے دو ماہ کے دہانچہ کو دیکھ کر خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو گئے تھے۔

”امی ابو میں آگئی ہوں اور دیکھیں اکیلی نہیں آئی آپ کے نواسے کو ساتھ لے کر آئی ہوں۔“ سلوی نے امی ابو کو دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ فرط مسرت سے روتے ہوئے اسے اپنے سینے سے لگا کر رو پڑے، دونوں بھائی بھابھیاں ان کے بچے وہاں کو دیکھ کر بہت خوش تھے، باری باری سب وہانچہ کو گود میں لے کر پیار کر رہے تھے، غنوی بھی شرمندہ سی سلوی سے گلے ملی تھی۔

”چاند رات کو بھی تمہارے منہ پر بارہ بج رہے ہیں بھی ہنس بھی لیا کرو۔“ سلوی نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں نے اپنے بننے کے دن خود ہی آنسوؤں میں بدلے تھے اب کیسے ہنس سکتی ہوں؟“ غنوی افسردگی سے بولی۔

”پاگل ہو تم، کہا بھی تھا کہ اللہ سے معافی مانگ لو سچے دل سے اپنی غلطی مان لو، اپنی اتانا کو پس پشت ڈال دو۔“

”کر چکی ہوں یہ سب اور اس بار اعتکاف میں بیٹھی تھی ابھی تمہارے آنے سے چند منٹ پہلے ہی سب نے مجھے ہارچول پہنا کر اعتکاف سے اٹھایا ہے۔“ غنوی نے پر غم لہجے میں کہا۔

”ماشاء اللہ اس کے باوجود چہرے پہ یہ یہ ادا سی چھائی ہوئی ہے تمہیں نہیں لگتا کہ تمہاری معافی، تو یہ اور دعا قبول ہوگئی ہے؟ میں یہاں آئی ہوں پورے ایک سال بعد اور۔۔۔“

سال بعد ٹوٹی ہوئی مکتبی جوڑنے بلکہ شادی کی تاریخ طے کرنے نہیں، نکاح کرنے کے لئے میں غنوی افتخار کہیے آپ کو میرا ساتھ قبول ہے؟“ سلوی کی ادھوری بات اس کے عقب سے اندر آتے ہوئے یاسر نے مکمل کرتے ہوئے نہ صرف سنو تو بندہ ان سب کو بیان کر دیا تھا، امی ابو تو حیرت و مسرت سے روئے جارہے تھے۔

”بولو نا قبول ہے میرا ساتھ؟“ یاسر نے غنوی کے پاس آکر دوبارہ پوچھا۔

”ہاں قبول ہے۔“ غنوی نے اس کی صورت کو دیکھتے ہوئے انگٹا لہجے میں آہستگی سے کہا آنسو اس کے رخساروں پر پھسل رہے تھے۔

”دل سے قبول ہے؟“

”ہاں۔“

”محبت سے قبول ہے؟“ یاسر بھی اسے ستانے پہ تلا ہوا تھا، غنوی سب کی موجودگی میں شرم، جھجک سے نگاہ جھکا گئی۔

”یاسر بھائی! اب زیادہ تنگ مت کریں غنوی کو قاضی صاحب آئے ہیں ناں ساتھ نکاح پڑھو الیں فوراً۔“ سلوی نے ہنس کر یاسر سے کہا تو وہ آہستگی سے بولا۔

”اس نے جو تنگ کیا ہے مجھے اس کا کیا تمہاری وجہ سے سب بھلا یا ہے میں نے اس کا کیا بھروسہ پھر سے شک کرنے لگے؟“

”یاسر بھائی!“ سلوی نے اسے گھورا وہ ہنس پڑا، جبکہ غنوی اپنے آنسو اور ندامت چھپاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

”سلوی میری بیٹی، تمہارا بہت شکریہ ہماری خوشیاں لوٹانے کے لئے اپنی بہن کی خوشیاں لوٹانے کے لئے، جیتی رہو، سدا سہاگن رہو، اپنی اولاد کی خوشیاں دیکھنا نصیب ہوں تمہیں، تم واقعی

ہماری قابل فخر بیٹی ہو۔“ افتخار حسین چوہدری نے سلوی کو اپنے سینے سے لگایا اور بھینکتی آواز میں کہا۔

”شکریہ ابو۔“ وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

”انکل آئی آپ دونوں کو چاند رات اور چاند سا نواسا مبارک ہو۔“ وجاہت سعید نے وہانچہ کو صائمہ بیگم کی گود میں دیتے ہوئے کہا، انہوں نے اسے خوب پیار کیا۔

یاسر کے گھر والے افتخار حسین چوہدری

## اچھی کتابیں

### بچہ کی عادت ڈالیں

#### ابن انشاء

- ☆ اور کی آخری کتاب
- ☆ غار گیم
- ☆ دنیا کول ہے
- ☆ آوارہ گرد کی ڈائری
- ☆ ابن بطوطہ کے تعاقب میں
- ☆ چلے پڑھو چین کو چلیے
- ☆ عمری گری پھراسافر
- ☆ خدا انشاء کی
- ☆ اس ہستی کے اک کوپے میں
- ☆ ہانگر
- ☆ دل جی
- ☆ آپ سے کیا پڑا

## لاہور اکیڈمی

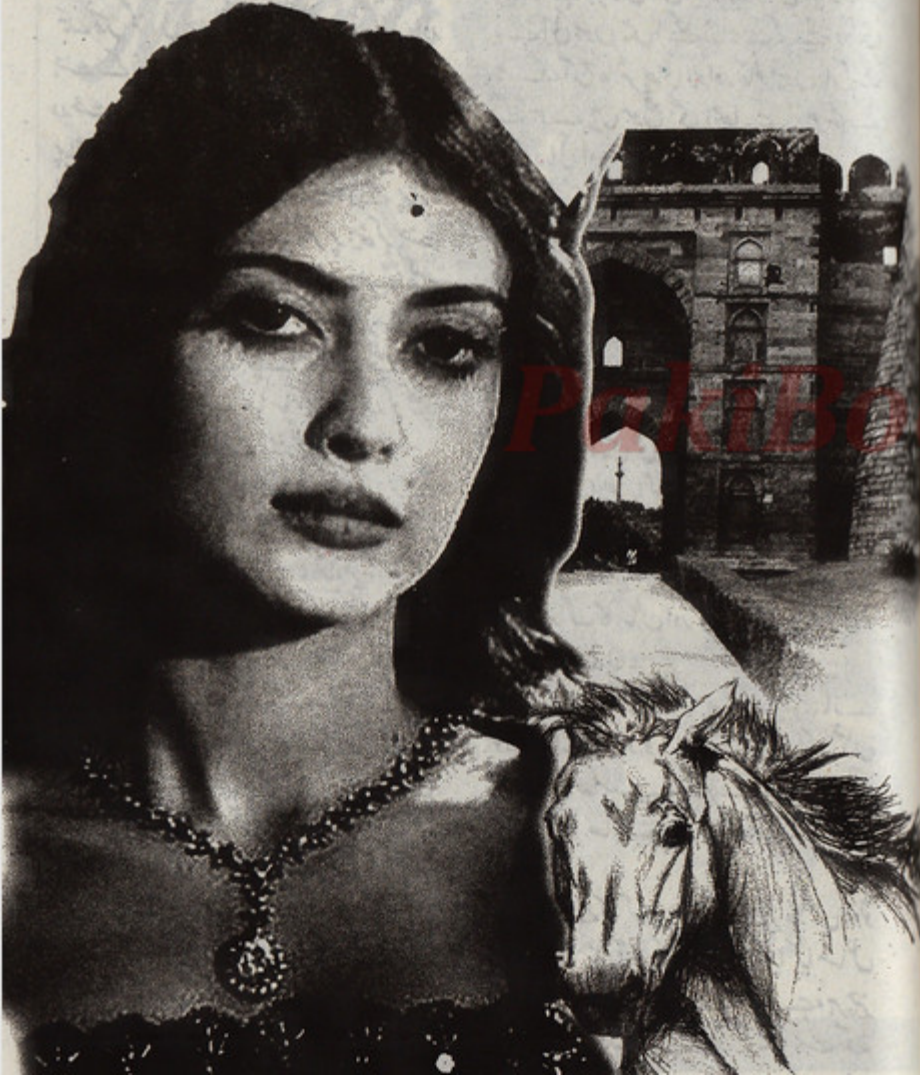
چوک اور دو بازار لاہور

فون: 042-37321690, 3710797



# گہرا راز

وجہہ بخاری



قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔  
 ”چاند کو گھیر کر کیا دعا مانگی آپ نے؟“  
 سلوٹی چھت پر وجاہت سعید کو ڈھونڈتی ہوئی آئی تھی اور انہیں دعا مانگتے دیکھ کر پوچھا۔  
 ”یہی کہ اللہ پاک میری زندگی کا میری ہتھیلی کا چاند ہمیشہ روشن اور جگمگاتا رکھنا۔“  
 وجاہت سعید نے محبت بھری نظروں سے اپنی حسین و جمیل شریک حیات کو دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔  
 ”اور میرے وجاہت کو بھی ہمیشہ سلامت رکھنا، صحت، عزت اور محبت کے ساتھ آمین۔“  
 سلوٹی نے ان کا ہاتھ تھام کر بہت محبت اور تشکر آمیز نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے دل سے دعا مانگی۔  
 ”چاند رات مبارک ہو۔“ دونوں نے ایک ساتھ ایک دوسرے کو مبارکباد دی اور بے اختیار خوشدلی سے ہنس پڑے، وجاہت سعید نے سلوٹی کا ہاتھ گھول کر دیکھا اس کی ہتھیلی پر مہندی سے چاند بنایا گیا تھا چاند کے ہالے میں وجاہت لکھا ہوا تھا، انہوں نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
 ”یہ کیا ہے؟“

”یہ ہے میری ہتھیلی کا چاند۔“  
 سلوٹی نے محبت سے مسکراتے ہوئے کہا اور ان کا بازو تھام کر ان کے شانے پر اپنا سر رکھ دیا، انہوں نے محبت سے اس کی چاندی پیشانی کو چوم لیا، دورانق پر صبح عید کی سپیدی نمودار ہونے والی تھی، خوشیوں اور محبتوں بھری چاند رات کے بعد ہنسی مسکراتی، شہنشاہی عید الفطر کی سپیدی۔

☆☆☆

ریحانہ بیگم، ناصر اور ان کے بیوی بچے بھی کچھ دیر میں وہاں پہنچ گئے تھے، قاضی صاحب بھی آگئے اور کچھ ہی منٹ بعد یاسر اور غنوی کا نکاح ہو گیا، غنوی خوشی اور تشکر سے روئے جا رہی تھی، یاسر اور اس کے والدین کو منانے، سمجھانے اور چاند رات کو یہاں آنے غنوی سے نکاح کرانے تک سلوٹی اور وجاہت سعید کی مخلصانہ کوششوں کا عمل دخل تھا، یہ بات جب سب کو معلوم ہوئی تو غنوی سمیت سبھی کے دل میں ان کی قدر و منزلت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا، غنوی کی رحمتی ایک جفتے بعد ہونا تھی۔

سبھی بہت خوش تھے، سلوٹی، وجاہت اور وجاہت تو سب کی آنکھوں کا تار بے ہوئے تھے اور سب انہیں دی آئی پی پروٹوکول دے رہے تھے، سلوٹی اپنے پیاروں کے چہروں پر خوشی دیکھ کر دل سے خوش تھی، رب کی شکر گزار تھی جس نے یہ دن دکھایا تھا۔

☆☆☆

”نکاح مبارک ہو غنوی یاسر۔“ یاسر موقع ملتے ہی غنوی کے پاس چلا آیا اور مسکراتے ہوئے اس کی دلش سراپے گود بکھتے ہوئے بولا۔  
 ”آپ کو بھی مبارک ہو۔“ اس نے شرمیلی سلاہٹ لیوں پر سجا کر کہا۔  
 ”تم نے اس وقت جواب نہیں دیا تھا۔“ وہ بولا۔

”کیسا جواب؟“ غنوی نے نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔  
 ”محبت سے قبول ہے؟“ یاسر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنا سوال دہرایا تھا۔  
 ”ہاں قبول ہے محبت سے۔“ غنوی نے شرمیلی مسکراہٹ لیوں پر سجائے اقرار کیا اور ہنسی ہوئی بچوں کی طرف چلی گئی، یاسر خوشدلی سے



**Medora**  
Perfumed Talc

خوشبو جو دل کو پہنائے  
تازگی جو ہر کوئی چاہے



خوشبو کی دنیا کے 8 شگفتہ احساس

MEDORA OF LONDON

دکھائی۔

”لڑکی خدا کا خوف کرو وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں تم جانتی ہو وہاں باڈر قریب ہے اور کبھی بھی فائرنگ شروع کر دیتے ہیں بھارتی فوجی۔“ انصی نے اس کو گھر کی طرف کھینچنا چاہا۔

”تم بہت ڈر لوک ہو کچھ نہیں ہوتا مجھے دریا پر جانا ہے ہر حال میں، یاد دیکھو بس ایک ہفتہ رہنے آئی ہوں میں، مجھے نظارے کر لینے دو جی بھر کے، آج عاشر بھائی ابو اور خالوتیوں مارکیٹ گئے ہوئے ہیں موقع بھی اچھا ہے۔“ مریم نے آنکھ دبا کر اور اسی راستے پر چل دی، ہاتھ میں گھاس کے تنکے پکڑے ہوئے تھے، آج کل کیونکہ بہار کا موسم تھا ہر طرف بڑی بڑی گھاس اگی ہوئی تھی جو کہ پہاڑوں کو مزید خوبصورت بناتی تھی، مجبوراً انصی بھی اس کے پیچھے چل دی۔

☆☆☆

”ہائے خالی، یہ مکئی کی روٹی، یہ ساگ کا سالن وہ بھی دیسی مکئی کے تڑکے والا، یہ مکھن ملائی دہی، یہ سب ادھر پاکستان جا کر بہت یاد آتا ہے، ہم لوگ تو ترس جاتے ہیں ایسی خالص چیزوں اور خوراک کو۔“ صفیہ بیگم نے جب عاشر کے سامنے ساگ کا سالن اور مکئی کی روٹی لا کر رکھی تو وہ آہیں بھرنے لگا۔

”کیوں بھئی بھائی صاحب کیا ہمارے ہونے والے داماد کو وہاں خالص خوراک نہیں ملتی۔“ انور صاحب نے عاشر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اصغر صاحب سے استفسار کیا اور مسکرا دیئے۔

”ارے کیا کروں وہاں کوئی چیز خالص ہوتو پھرنا، کیا بتائیں آپ کو ہمیں وہاں کیا کیا مسائل ہیں، وہاں رہنا ہی سب سے بڑا مسئلہ ہے، ہر چیز میں جھوٹ، دھوکہ، فراڈ، میں تو بچ میں بہت تنگ

”مریم تمہیں ان سنگین حالات میں نہیں آنا چاہیے تھا یہاں، تمہیں پتہ ہے نا آج کل حالات کس قدر برے ہیں اور تم بلاوجہ ضد کر کے خالو اور عاشر کو لے آئی ہو۔“ انصی نے ہاتھ میں پکڑی تلی کو کھلی فضا میں آزاد کرتے ہوئے کہا، جو اس نے پھول پر سے پکڑی تھی۔

”محترمہ تمہیں پتہ تو ہے میری گرمیاں تب تک نہیں گزرتی جب تک میں کشمیر نہ آ جاؤں اور جنت کے نظارے نہ کر لوں، دیکھو تو یار یہ پہاڑ یہ درخت، یہ پرندوں کا چچھانا یہ ٹھنڈی ہوا، پہاڑوں پر بادل، بادلوں میں چھپا بارش کا پانی بارش کے بعد صاف ستھرے دھلے ہوئے پہاڑ، ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے، یہ پتھر پر بیٹھ کر جنت نظیر وادی کے نظارے کرنا، یار میں یہ سب کسے نظر انداز کر سکتی ہوں، مجھے تو آتا ہی تھا ہر سال کی طرح اس بار بھی اب چاہے حالات جیسے بھی ہوں۔“ مریم نے ایک لمبا سانس اندر کو کھینچا اور کھڑی ہو کر گول گول کھونٹے لگی۔

مریم اور انصی اس وقت چہل قدمی کرنے اونچے نیچے راستوں پر نکلی ہوئیں تھیں، کشمیر آ کر مریم اور انصی کا یہ ہی معمول ہوتا تھا، مریم، انصی کو کاج سے زبردستی چھٹی کر دیا کرتی تھی اور پھر پورا پورا دن اس کو لے کر گھر سے باہر نکل جاتی وادی کشمیر کے نظارے کرنے کے لئے۔

مریم کو کشمیر سے عشق تھا اور اسی عشق کے ہاتھوں وہ مجبور ہو کر ہر سال گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے یہاں چلی آتی تھی، انصی مریم کی ہونے والی بھابی بھی تھی اور دونوں کیونکہ ہم عمر تھیں اس لئے دونوں کی بہت گہری دوستی بھی تھی۔

”یار چلو اب یہاں سے دریا زیادہ دور نہیں ہے وہاں چلتے ہیں ہم۔“ مریم نے انصی کو ہاتھ



ہوں۔“ اصغر صاحب نے جلد دل کے پھپھو لے پھوڑے۔

”بھائی صاحب یہ سراسر ناشکری ہے، مسائل ہر جگہ ہوتے ہیں، آپ لوگوں کے پاس اگر کچھ بھی نہیں ناتو آزادی جیسی عظیم نعمت موجود ہے۔“ صفیہ بیگم نے لکڑی کے چوبے میں لکڑیاں ٹھیک سے رکھتے ہوئے کہا اور روٹی تو بے پروا ڈالی، اس وقت وہ چاروں بچن میں ہی موجود تھے اور دو پھر کا کھانا کھانے میں مصروف تھے۔

(کشیمیر میں اکثر گھروں میں ایسا ہی سٹم ہے بچن بہت بڑا بنایا جاتا ہے وہ ایک قسم کا کمرہ ہی ہوتا ہے اور اس کے ایک کونے میں بچن سیٹ کیا جاتا ہے چار پائی بھی رکھی جاتی ہے اور نیچے بیٹھنے کا بھی انتظام ہوتا ہے، کشمیری دیہاتوں میں زیادہ تر ایسا ہی ہوتا ہے)۔

”ارے اتنے مسائل ہیں کہ یہ آزادی والی بات تو کہیں بہت پیچھے رہ گئی ہے۔“ اصغر صاحب نے ناگواری سے کہا۔

”بات کہاں سے کہاں نکل گئی، یہ بتاؤ اقصیٰ اور مریم کہاں ہیں دونوں۔“ انور صاحب نے صفیہ بیگم سے پوچھا۔

”وہ دونوں یہ کہہ کر نکلی تھیں کہ ہم ذرا چہل قدمی کر آئیں، آپ کو تو پتہ ہے مریم جب یہاں آئے وہ گھر میں کہاں رہتی ہے اسے بس نظارے کرنے کا اور تصویریں بنانے کا شوق ہے، کیمبرہ بھی ساتھ لے کر گئی ہے۔“ صفیہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔

”عاشق بیٹے کھانا کھا کر دیکھ کر تو آؤ وہ دونوں ہیں کہاں۔“ انور صاحب کو پریشانی ہوئی کیونکہ آج کل حالات بہت نازک تھے، کسی بھی وقت فائرنگ شروع ہو جاتی تھی۔

”آپ پریشان نہ ہوں وہ یہی قریب ہی

کہیں ہوں گی دونوں۔“ عاشق نے لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا، انور صاحب محض سر ہلا کر رہ گئے اور دوبارہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

☆☆☆

”اف میرے اللہ، بار میں ہر بار کشمیر آ کر یہ ہی سوچتی ہوں کہ اللہ نے جنت کتنی خوبصورت بنائی ہوگی، یہ تو بس جنت نظیر ہے۔“ مریم کا بس نہیں چل رہا تھا وہ ان حسین نظاروں میں کہیں کھو جائے، جیسے ہی دریا سامنے نظر آیا بھاگ کر پانی میں گھس گئی، جس کے ٹھنڈے پانی کی وجہ سے تھوڑی ہی دیر بعد ٹانگیں سن ہو گئیں لیکن وہ اندر ہی رہی۔

”یار مریم پانی بہت ٹھنڈا ہے باہر آ جاؤ۔“ اقصیٰ کو دریا کے شور کی وجہ سے چنچنا پڑ رہا تھا کیونکہ دریا کی آواز بہت اونچی تھی۔

”آ جاتی ہوں، میری ہونے والی بھر جاتی تم ایک کام کرو یہ کیمبرہ پکڑو اور میری تصویر لو، یار یہ پانی یہ نظارے اف میں کہیں پاگل ہی نہ ہو جاؤں۔“ مریم کے اس پاگل پن پر اقصیٰ محض مسکرا کر رہ گئی اور اس کے ساتھ سے کیمبرہ لے کر تصویریں بنانے لگی۔

”گلدائے ابو پپلی وار کشمیر آئی اے (گلتا ہے یہ پہلی بار کشمیر آئی ہے)۔“ تھوڑے سے فاصلے پر موجود عورت نے مسکرا کر اقصیٰ سے پوچھا، وہاں چند عورتیں کپڑے بھی دھو رہی تھیں۔

”نئی ماسی ہر سال آندی اے بس اینوی کشمیر نال وچ پیارے (نہیں ماسی یہ ہر سال آتی ہے بس اس کو کشمیر سے بہت پیار ہے)۔“ اقصیٰ نے بھی مسکرا کر اپنی زبان میں جواب دیا۔

”چلو مریم بس اب باہر آؤ کافی تصویریں

ہونے والے ہو گئے تھے۔

”چلو اقصیٰ اس چٹان پر بیٹھتے ہیں تھوڑی دیر۔“ مریم نے تھوڑی سی دور بڑی سی چٹان کی طرف اشارہ کیا اور وہاں چل دی، اقصیٰ بھی سر پٹ کر اس کے پیچھے ہوئی۔

مریم پہلے چٹان پر رینگتے رینگتے چڑھ کر بیٹھ گئی اقصیٰ کیونکہ یہاں کی باسی تھی اس کے لئے ایسی چٹانوں پر چڑھنا کوئی مشکل کام نہ تھا، مریم کتنی دیر خاموشی کے ساتھ سامنے موجود عظیم و الشان پہاڑوں کو دیکھتی رہی جو کہ سبزے سے بھرپور تھے اور جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر موجود گھر ایسے نظر آ رہے تھے جیسے کوئی کیڑے مکوڑے رینگ رہے ہو۔

”یار مریم پلیز اٹھو اب چلو وہ دیکھو بادل نیچے آ رہے ہیں اس کا مطلب اب بارش شروع ہونے والی ہے۔“ اقصیٰ نے سامنے پہاڑ کی طرف اشارہ کیا کہ جس پر روٹی کے گالوں کی طرح بادل قافلوں کی صورت میں آ رہے تھے اور بلاشبہ یہ منظر دل موہ لینے والا تھا، مریم نے فوراً یہ منظر کیمبرے کی آنکھ میں محفوظ کیا۔

”یار اقصیٰ تم لوگ بہت لگی ہو، اس جگہ کے باسی ہو، کاش میں بھی اس جنت کا حصہ ہوتی۔“

مریم نے تاسف سے سر ہلایا۔

”مریم تم بھول جاتی ہو بلاشبہ یہ جنت ہے لیکن یہ ایک مقید جنت ہے جہاں ہم لوگ قید ہیں، ہم اپنی آزادی سے کچھ نہیں کر سکتے حتیٰ کہ ہم عیدیں بھی نہیں منا سکتے، کوئی بھی تہوار یہاں کر فیو نافذ کر دیا جاتا ہے، آئے روز مظاہرے، آئے روز معصوم شہریوں اور خاص طور پر مسلمانوں کا قتل عام۔“ اقصیٰ کے لہجے سے اداسی جھلک رہی تھی۔

”ہمارے وہاں کیا ہے؟ جھوٹ، فراڈ،

دھوکہ، چوری، بددیانتی، کرپشن، ٹارگٹ کلنگ، مہنگائی کا رونا، میں تو بہت تنگ ہوں، یہاں وقت رک سا جاتا ہے سکون ہے، قدرت کے نظارے ہیں معصوم لوگ ہیں۔“ مریم تو جیسے اس کو سن ہی نہیں رہی تھی اپنی ہی باتیں کر رہی تھی۔

”مریم تم ناشکری کر رہی ہو، میرے نزدیک آزادی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا، مسئلے مسائل ہر جگہ ہوتے ہیں ہمیں کم از کم آزادی کی بہت زیادہ قدر ہے کیونکہ ہم شروع سے ایک غلامی کی زندگی گزار رہے ہیں، ہمیں بھی حق حاصل ہے کہ ہمیں آزاد کیا جائے، ہمیں اپنی زندگیاں اپنی مرضی سے گزارنے دی جائیں، کیا تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ عید کی نماز تک نہیں پڑھ سکتے ہم ایک اجتماع کی صورت میں، ہم چاند رات کی خوشیاں نہیں منا سکتے، ہم بس دن رات ایک ہی کوشش ایک ہی مقابلے میں رہتے، کیا بھی تم اس ماں کا تکلیف کا اندازہ لگایا ہے کہ جو صبح اپنے بچوں کو سکول بھیجے لیکن واپسی پر اس کا بچہ کسی اندھی کوئی کا نشانہ بن جائے، کیا ان ماؤں کے دکھ کا اندازہ لگا سکتی ہو کہ جن کے گھر و جوان بیٹے بھارتی فوجیوں کے سامنے جا کر لڑتے ہیں لیکن اس ماں کو اس بات کا ایک فیصد بھی یقین نہیں ہوتا کہ اس کا بیٹا گھر واپس آئے گا، کیا تم اس ماں کے دکھ کا اندازہ لگا سکتی ہو کہ جس کی بیٹی کا جہیز اور شادی تیار ہے کہ آدھی رات کو بھارتی لیٹرے اس کا سب کچھ لوٹ کر لے جائیں، ارے کبھی سوچا ہے کہ تم گھر سے باہر نکلو اور سامنے چند فوجی ہاتھوں میں ڈنڈے لئے کھڑے تمہارا ہی انتظار کر رہے ہوں کہ کب تم آؤ اور تم پر ڈنڈے برسائے جائیں، کبھی تم نے ان بیٹوں کے بارے میں سوچا ہے کہ جن کی خواب دیکھنے کی، تیلیوں اور جگنوؤں سے کھیلنے کی عمر ہوتی ہے وہ

ہونے والے ہو گئے تھے۔

”یار اقصیٰ تم لوگ بہت لگی ہو، اس جگہ کے باسی ہو، کاش میں بھی اس جنت کا حصہ ہوتی۔“

مریم نے تاسف سے سر ہلایا۔



اس عمر میں بھارتی فوجیوں کے سامنے پتھر لے کر کھڑی ہیں اور اپنی عزت و آبرو کی خود ہی محافظ بننے کی ناکام کوشش کر رہی ہیں اور جب ایسی قوم میں کوئی برہان وانی اٹھتا ہے اور قوم کے لئے امید بننے کی کوشش کرتا ہے تو اس کو بڑی طرح عبرت کا نشان بنا دیا جاتا ہے تاکہ کوئی اگلی بار اٹھنے کی جرأت نہ کر سکے اور کیا بھی سوچا کہ ہر خوشی کے تہوار پر کسی گھر میں صف ماتم بچھ جائے تو وہ کیا عالم ہوتا ہوگا، نہیں مریم تم ان تمام تکالیف کا اندازہ نہیں لگا سکتی، کیونکہ تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ آزادی کتنی بڑی نعمت ہے، کاش میرے پاس یہ حسین نظارے نہ ہوں بس ہمارے پاس آزادی ہو بس آزادی۔“ بات کے آخر میں اقصیٰ نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا مریم کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے۔

”مریم خدارا آزادی کی قدر کرنا، یہ بہت بڑی نعمت ہے، ایک پرندے کو اگر بنجرے میں قید کر دیا جائے اور بنجرہ بھی سونے کا ہو اور چاہے اس کو سونے کا لقمہ دیا جائے وہ پھر بھی اڑنے کے لئے ہر دم بے تاب رہے گا اور یہاں تو صیاد نے ہمیں قید بھی رکھا ہے اور ظلم کے پہاڑ بھی توڑے جا رہے ہیں، کاش میرا اللہ شہید کو آزادی جیسی نعمت عطا کر دے۔“ اقصیٰ نے اپنے ہاتھوں سے آنسوؤں سے بھرا چہرہ صاف کیا، مریم کو سخت شرمندگی نے آن گھیرا۔

”مریم آزادی ہمارا بھی حق ہے اور ہمیں پتہ نہیں کتنا عرصہ اس حق سے محروم رہتا ہے۔“ اقصیٰ یہ کہہ کر چٹان سے نیچے اترتی اور دریا کے پانی سے منہ پر چھینے مارے اور کھڑی ہو گئی۔

”کچھ عقل سے تم دونوں کو یہاں کیا کر رہی ہو، پتہ بھی ہے یہ ایریا حساس ہے منہ اٹھا کر یہاں کیا کرنے آئی ہو تم لوگ۔“ عاشر نے جانے

انہیں کہاں کہاں ڈھونڈتا ڈھونڈتا دریا کی طرف آ نکالا تھا اور وہ دونوں یہاں موجود تھیں۔

”وہ بھائی میں نے اقصیٰ کو کہا تھا یہاں آنے کا اس نے تو منع بھی کیا تھا۔“ مریم فوراً میدان میں کودی اس سے پہلے کہ اقصیٰ کو ڈانٹ پڑتی، اقصیٰ محض سر جھکا کر کھڑی تھی، عاشر کے سامنے تو اس کے لئے نظریں اٹھانا ویسے بھی مشکل ہو جاتا تھا۔

”تم تو ہو ہی سدا کی بے مقصد، چلو اب گھر خالو پریشان ہو رہے تھے تم دونوں کے لئے۔“ عاشر نے دونوں کو ڈنڈا اور واپسی کی راہ لی، وہ دونوں بھی چپ چاپ اس کے پیچھے ہو دیں اور اسی وقت تیز بارش شروع ہو گئی اور وہ تینوں خوب بھیگ کر گھر پہنچے۔

☆☆☆

”یہ تم ہر وقت اتنی چپ کیوں رہتی ہو اقصیٰ، اداس بھی لگ رہی ہو کوئی بات ہے کیا؟“ عاشر اس وقت اقصیٰ کو کالج چھوڑنے آیا تھا کیونکہ اس کو اصغر صاحب نے تاکیدی بھی آدھارا ستہ وہ دونوں خاموش چلتے رہے، اقصیٰ کے گھر سے کالج کا راستہ آدھے گھنٹے کا تھا اور وہ پیدل جایا کرتی تھی، عاشر نے ایک دم اپنی چپ توڑی۔

”نہیں ایسا تو نہیں ہے۔“ اقصیٰ جو کہ اپنی فائل سینے سے لگائے نیچے دیکھ کر چل رہی تھی، اس نے ایک دم نظر اٹھا کر دیکھا لیکن اگلے ہی پل نظریں جھکا لیں۔

”ایسا ہی ہے ہاں لیکن تم بتانا نہ چاہو وہ الگ بات ہے۔“ عاشر چلتے چلتے ایک دم رک گیا، اس کی اس بات پر اقصیٰ کے دل کو کچھ ہوا وہ اس کی زندگی کا ساتھی بننے جا رہا تھا اور وہ اس سے کیسے چھپاتی، اقصیٰ کی آنکھوں سے ایک دم آنسو جاری ہو گئے، وہ وہی سڑک کے کنارے

پڑے پتھر پر بیٹھ گئی، قدم جسے ساتھ چھوڑ گئے تھے، عاشر ایک دم پریشان ہو کر اس کے سامنے آیا اور سنبھل کر بیٹھ گیا کیونکہ نیچے بہت گہری کھائی تھی اور دریا بھی صاف نظر آ رہا تھا اور دریا کا شور بھی صاف سنائی دے رہا تھا، سڑک پر گاڑے یہ گاڑے کوئی نہ کوئی گاڑی نظر آتی تھی اس وقت سب کے اپنے کاموں پر جانے کا وقت تھا، اقصیٰ آج مریم کو بنا بتائے کالج آئی تھی، کیونکہ اس کو ضروری اسائنمنٹ جمع کروانی تھی پچھلے دو دنوں سے وہ گھر رہی تھی، لہذا وہ آج کالج آ گئی۔

”اقصیٰ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے۔“ عاشر نے پریشانی سے پوچھا۔

”عاشر میری بچپن کی دوست کو کل کچھ بھارتی فوجی گھر سے اغواء کر کے لے گئے ہیں، عاشر میں کیا کروں میں بہت بے بس ہوں مجھے اس کی بہت فکر ہے پتہ نہیں وہ کیا سلوک کریں گے اس کے ساتھ۔“ اقصیٰ زار و قطار رو رہی تھی، عاشر کے پاس اس کو تسلی دینے کے لئے ایک لفظ نہیں تھا۔

”ابھی دو دن پہلے ہی وہ میرے ساتھ آتی جاتی تھی، میں یہ دو دن مریم کی وجہ سے نہیں گئی کالج، کل اس کی بہن کا فون آیا تھا مجھے اس نے بتایا، ہمارا اپنی زندگیوں پر کوئی اختیار نہیں، کتنا ظالم ہے، یہ کیسی بے بسی ہے، ہمارے ساتھ ایسا سلوک کیوں ہوتا ہے، یہ کیسی آزمائش ہے۔“ اقصیٰ کے رونے میں مزید شدت آ گئی۔

”اقصیٰ پلیرز چپ کرو، مجھے تمہارے آنسو تکلیف دے رہے ہیں، اللہ سے دعا کرو وہ جہاں بھی ہو ٹھیک ہو، خدا یہ آزمائش کم کرے، ہم بس دعا ہی کر سکتے ہیں۔“ عاشر بھی اچھا خاصا پریشان ہو چکا تھا۔

”کوئی کچھ کیوں نہیں کرتا، سب کے ضمیر

کیوں سوئے ہوئے ہیں، آخر ہمیں اس سب سے کب نجات ملے گی۔“ اقصیٰ کا دل جیسے پھٹنے کو تھا اور عاشر کے سارے الفاظ گم تھے۔

☆☆☆

”خالہ! خالہ! یہ زیادتی ہے دیکھیں اقصیٰ نے مجھے بتایا بھی نہیں اور میرے منع کرنے کے باوجود وہ آج کالج چلی گئی ہے۔“ مریم ابھی سو کر اٹھی تو دیکھا صبح کے گیارہ بج رہے تھے اور اقصیٰ بھی گھر نہیں تھی وہ فوراً منہ ہاتھ دھو کر کچن میں آئی جہاں صفیہ بیگم تو قح کے عین مطابق دوپہر کا کھانا بنانے کی تیاری کر رہی تھیں (کیونکہ وہاں زیادہ تر لوگ صبح جلدی ناشتہ کر لیتے ہیں اور پھر دوپہر بارہ بجے تک ان کا کھانا تیار ہوتا ہے)۔

”بیٹا اب تو وہ آنے والی ہوگی اس کو بارہ بجے چھٹی ہو جاتی ہے بس تھوڑا سا صبر کر لو، ویسے آج اتنی دیر تک تم سوئی رہی ہو خیر تھی نا۔“ صفیہ بیگم نے مسکرا کر پوچھا۔

”جی خالہ کل دراصل بہت گھومتے تھے ہم لوگ، اور آپ کو تو پتہ ہے ہم شہری لوگ جڑھیاں چڑھنے کے عادی نہیں اس لئے کل کافی ٹھکن ہو گئی تھی، لیکن خالہ صبح میں مجھے کل بہت مزہ آیا، یہاں جتنا سکون ہے نا وہ نہیں نہیں، اقصیٰ واپس آ جائے تو ہم آج پھر دریا پر جا لیں گے۔“ آخری جملہ بولتے ہی مریم نے دانتوں تلے زبان داب لی۔

”کیا کیا کیا، تم دونوں کل دریا تک گئی تھی۔“ صفیہ بیگم جو سبز ساگ چن رہی تھی ایک دم نظر اٹھا کر اس کو دیکھا۔

”بیٹا وہ ایریا کافی حساس ہے، وہاں ایسے ہی نہیں چلے جاتے اب آپ دونوں وہاں نہیں جاؤ گی، ٹھیک ہے نا۔“ صفیہ بیگم نے آخر میں وارن کیا۔



”جی سوری خالہ اب نہیں جاتے۔“ مریم بیگم بلی بن گئی۔

”چلو بیٹھو اب ناشتہ دوں میں آپ کو۔“ صفیہ بیگم کو اس کی معصوم شکل دیکھ کر اس پر پیار آیا۔

”خالہ، ابو، عاشر بھائی اور خالو کہاں ہیں؟“ مریم نے آہستگی سے پوچھا کہ کہیں اگر اصغر صاحب نے سن لیا کہ وہ اب جاگی ہے تو وہ بہت ڈانٹے گئے۔

”وہ عاشر کہہ رہا تھا کہ اس کے دوستوں نے اسے سختی سے تاکید کی ہے کہ تم کشمیر جا رہے ہو کوئی نہ کوئی وہاں کی چیز ہم سب کے لئے لے کر آئے اور بھائی صاحب بھی اسی کے ساتھ گئے ہیں جبکہ تمہارے خالو دفتر گئے ہوئے ہیں۔“ صفیہ بیگم نے تفصیل سے بتایا۔

”اچھا تم ناشتہ کرو اور فارغ ہو کر ٹی وی دیکھ لینا میں ذرا چشمے پر جا رہی ہوں وہاں مجھے کچھ کپڑے بھی دھونے ہیں اور گاگر میں بانی بھی بھر کر لانا ہے پینے کے لئے، پھر واپس آکر میں کھانا بھی بناؤں گی تب تک سب آچکے ہوں گے۔“ صفیہ بیگم نے مریم کو کہا اور اٹھ کھڑی ہوئیں سبزی کو ایک سائڈ پر ڈھانپ کر رکھ دیا۔

”ارے ارے اسے کیسے میں بھی چشمے پر آپ کے ساتھ جاؤں گی مجھے وہاں جا کر ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پینا ہے چشمے کا اور تصویریں بھی لیتی ہیں، پلیز خالہ میرا انتظار کر لیں میں ناشتہ کر لوں۔“ مریم کا لہجہ پر جوش تھا، اس کو پھر گھومنے کا موقع مل گیا تھا۔

”اچھا میری جان تم ناشتہ کرو میں کپڑے نکالتی ہوں جو دھونے ہیں۔“ صفیہ بیگم مسکرا کر کچن سے باہر چلی گئیں۔

وہ ابھی کالج کے گیٹ پر کھڑی باقی سب کا انتظار کر رہی تھی، تھوڑی ہی دیر بعد حنا، عاشر اور ذوفناں بھی باہر آگئیں اور اب ان سب نے ایک ساتھ گھروں کو جانا تھا ان کے علاوہ بھی بہت سی لڑکیاں کچھ پیدل اور کچھ سواریوں پر گھر جا رہی تھیں، جب سے حالات کشیدہ ہوئے تھے ان سب کی کوشش ہوتی تھی کہ ایک ساتھ گروپ کی صورت میں گھروں کو جائیں، واپسی پر سب ہی چپ تھیں کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا، زل کے اغواء کا سب کو انداکہ تھا کہ ان سب کے دل جیسے پھٹنے کو تھے، اس کو غائب ہوئے ایک پورا دن ہونے والا تھا پتہ نہیں وہ کس حال میں ہوں، آدھے گھنٹے کے سفر میں آدھا راستہ پکی سڑک کا تھا اور پھر اس کے بعد ان کو کچھ بکے راستوں سے ہو کر جانا تھا۔

ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ تھوڑی دور سے فوجی چیپوں کی آواز آنا شروع ہو گئی اور ان چاروں کے ساتھ ساتھ راہ چلتے باقی لوگ بھی الٹ ہو گئے، کل کر فوجی کھلا تھا اس لئے آج سڑکوں پر رش تھا۔

”جلدی جلدی قدم اٹھاؤ، یہاں سے نکل جائیں آگے کچے کچے راستوں پر کوئی خوف نہیں۔“ اقصیٰ نے سب کو آہستگی سے کہا اور ان سب نے تیزی سے چلنا شروع کر دیا، یہاں خطرہ ہر وقت منڈلاتا تھا، جیسے ہی پہلی جیپ ان کے سامنے سے گزری اندر سے بائچ جھ بھارتی فوجی کوڈر باہر آئے اور آکر راہ چلتے لڑکوں کو پکڑ کر ڈنڈے پر سانا شروع کر دیے، وہاں ایک دم صورت حال کمبیر ہو گئی، ایک نوجوان کو زخموں سے چور کر کے وہ دوسرے کی طرف بڑھ جاتے، اقصیٰ اور اس کی دوستوں سے یہ منظر دیکھا نہ گیا

کے لئے ہاتھوں میں پتھر اٹھائے اور ان کی طرف برسنا شروع کر دیے، دیکھتے ہی دیکھتے وہاں اچھا خاصا شور مچ گیا، کچھ نوجوان اس صورت حال میں بھی پاکستان کا پرچم لہرا رہے تھے اور کچھ سروں پر باندھے ہوئے تھے، سب مردوں اور عورتوں نے ہم آواز ہو کر ”حق ہمارا آزادی“ ”کشمیر بنے گا پاکستان“ کے نعرے لگانا شروع کر دیے اور فوجیوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنی پستولوں کا رخ وہاں موجود مظاہرین کی طرف کر دیا، آنسو گیس کی شیلنگ کی گئی، لیکن مظاہرین ڈٹے رہے اور دیکھتے ہی دیکھتے فوجیوں کی تعداد بھی بڑھ گئی اس صورت حال میں کئی مسلمانوں نے اپنے سینوں پر گولیاں کھالیں لیکن وہ وہاں سے ہلے نہیں، بلکہ تعداد بڑھتی رہی اسی اثناء میں ایک اندھی گولی سیدھا آکر حنا کے سر پر لگی، اقصیٰ سب کچھ چھوڑ کر اس کے پاس بھاگی لیکن اس کے مڑنے کی دیر تھی کہ ایک اور گولی نے آکر اس کا سینہ چیرا اور چیر کرنا جانے کہاں غائب ہو گئی، اقصیٰ اور حنا دونوں ہی ایک جگہ ڈھیر ہو گئیں، عاشر اور ذوفناں دیوانہ وار دونوں کے پاس بھاگیں لیکن ان کے آنے تک ان دونوں کی روچیں فقس غصری کو چھوڑ کر پرواز کر چکی تھیں، عاشر اور ذوفناں دونوں سر تھامے وہاں ہی بیٹھ گئیں، ابھی زل کا دکھ کیا کم تھا جواب ان دونوں کا اس طرح چلے جانا، زندہ لاشیں کسے کہتے ہیں اس وقت اگر کوئی عاشر اور ذوفناں کو دیکھتا تو سمجھ جاتا، بہت سے کشمیریوں کی طرح آزادی کے نعرے لگاتے لگاتے، اپنے حق کے لئے لڑتے لڑتے، اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کرتے کرتے حنا اور اقصیٰ بھی اگلے جہاں کا سفر شروع کر چکی تھیں، نہ جانے مزید کتنے کشمیریوں کو اپنی جانوں کی قربانی دینی تھی، نہ جانے یہ آزادی کی جنگ

ان کو کب تک لڑنی تھی، نہ جانے یہ آزمائش کب ختم ہونی تھی، نہ جانے کب عالم اسلام کا ضمیر جاگنا تھا کہ وہ سب مل کر ان کے حق کے لئے کچھ کرتے، ہر باریک طرح اس بار بھی بھارتی فوجی تباہی و بربادی مچا کر اسے راستے پر روانہ ہو چکے تھے اور پیچھے لاشیں تھیں محض لاشیں اور چند زندہ لاشیں اور کچھ آنسو بہاتے معصوم و مظلوم لوگ، ذوفناں اور عاشر کو کس طرح حنا اور اقصیٰ کے گھر میں ان کی شہادت کی اطلاع دینی تھی، یہ ایک الگ کہانی ہے۔

اس قید کا الٹی دکھڑا کے سناؤں ڈر ہے کہیں فقس میں میں غم سے نہ مر جاؤں

☆☆☆

## اچھی کتابیں

پڑھنے کی عادت ڈالیں

ابن انشاء

- ☆..... اور دو آخری کتاب
- ☆..... غار کدھم
- ☆..... دنیا گول ہے
- ☆..... آوارہ گرد کی ڈائری
- ☆..... ابن بطوطہ کے قہاق میں
- ☆..... پلٹے ہوئے چین کو چلیے
- ☆..... مگر میری پھر اسافر
- ☆..... خدا انشاء ہی کے
- ☆..... اس ہستی کے اک کہے میں

لاہور اکیڈمی

چوک اور دو بازار لاہور

فون: 042-37321690, 3710797





PakiBooks.Site

## ناولٹ

قریب بلایا تھا، نویلہ نے مڑ کر دیکھا، جیسے یقین کرنا اہتی ہو کہ کیا واقعی وہ اسے بلارہی ہے یا کسی اور کو۔

”اب آپ سب جائیں، مجھے اپنی اس بہن سے بات کرنی ہے۔“ وہ لڑکی نرمی سے بولی اور فوراً سب لڑکیاں وہاں سے باہر نکل گئیں، اب وہاں صرف وہ دونوں تھیں۔

”آؤ۔“ اس نے نویلہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے

اندر کے کرب کو سمیٹ رہی ہو، اس کی روح پر لگے زخموں پر مرہم رکھ رہی ہو، وہ وہیں کھڑی رہی، یہاں تک کہ اندر سے آواز آنا پسند ہو گئی، رفتہ رفتہ لڑکیاں کمرے سے باہر نکلنے لگیں، وہ

چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کمرے میں داخل ہو گئی، سامنے وہی لڑکی اب لڑکیوں کے گھیرے میں کھڑی تھی، اچانک اس کی نظر نویلہ پر پڑی تھی، اس نے ہاتھ کے اشارے سے نویلہ کو



میری رخصتی  
بشری سیال

ہونے لگا تھا، مزید کسی کلاس میں جانے کا موڈ نہ بنا تو اس نے فارقلیط حسن کو کال کر دی کہ اسے لینے کے لئے آجائے اور اس کا انتظار کرنے لگی۔

☆☆☆

نویلہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی تھی، اسے اس لڑکی کی باتیں سنتے ہوئے اپنے اندر کا اضطراب اور بے چینی بڑھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی آواز اس کے

عروہ غضنفر حیرت زدہ سی اسے دیکھ رہی تھی اور کبھی اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو، وہ تو اسے جانتی تک نہ تھی، مگر وہ کس بے تکلفی سے اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔

وہ اچانک اٹھی اور تیز تیز قدم اٹھاتی اس سے دور جانے لگی، وہ اسے جاتے دیکھتا رہا، پھر سر جھٹک آگے بڑھ گیا، عروہ کا دل خوف کے مارے، زور سے کانپ رہا تھا، اس کا دل اچاٹ



زین ندیم خالی ہاتھ ہو گیا تھا، اس کے ساتھ وہ ہو گیا تھا جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا، ہر وقت بننے اور دوسروں کو ہنسانے والا زین، نا جانے کب محبت کا روگ پال بیٹھا، اسے خبر ہی نہ ہو سکی تھی اور محبت خبر ہونے کب دیتی ہے، یہ تو کسی کھاگ شکاری کی طرح گھات لگائے بیٹھی ہوتی ہے، معصوم اور کمزور دل لوگوں کو پھنسانے۔

وہ ان کے گھر سے باہر نکل آیا تھا، شکستہ قدموں اور ٹوٹے دل کے ساتھ، گھر کے باہر کھڑا وہ حسرت زدہ نظروں سے بند دروازے کو دیکھ رہا تھا، لمحوں میں اس کی محبت اس سے چھن گئی تھی، اسے تہی داماں کر گئی تھی۔

اگلے دو دن وہ آفس نہیں گیا تھا، امی نے بہت پوچھا مگر وہ ناٹا رہا۔

”بیٹے! آخر کوئی توجہ ہوگی چھٹی کرنے کی، طبیعت تو ٹھیک ہے نہ؟“ وہ بیٹے کے مزاج کے ہر موسم سے آشنا تھیں، مگر یہ کون سا موسم تھا، جس سے وہ آج سے پہلے ناواقف تھیں، اس حال میں تو اس کو کبھی نہ دیکھا تھا۔

”ماں میں نے جاب چھوڑ دی ہے۔“ اس نے سر جھکا کر آہستہ آواز میں کہا تو وہ چونکتے ہوئے اس کی جانب دیکھنے لگیں۔

”ٹھیک ہے بیٹا، اگر آپ کو سوٹ نہیں کر رہی تو اس اوکے لیکن کوئی وجہ بھی تو ہوگی نہ۔“ انہوں نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”ماما! میں سی ایس ایس کرنا چاہتا ہوں۔“

اس اطلاع پر وہ بہت خوش ہوئی تھیں۔

”ارے! یہ تو بہت خوشی کی بات ہے بیٹے۔“ انہوں نے ہمیشہ کی طرح اس کی حوصلہ افزائی کی تھی، زین کو انہیں جاب چھوڑنے کا

بتاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا، وہ اس کے مستقبل کے حوالے سے فکر مند رہا کرتی تھیں، جب سے اس کی جاب ہوئی تھی، وہ خاصی مطمئن ہو گئی تھیں۔

”لیکن بیٹا یہ اچانک سی ایس ایس کا خیال کیسے آگیا؟“ انہوں نے سرسری انداز میں سوال کیا تھا، زین ندیم نے ان کی طرف دیکھا۔

”امی یہ کوئی خاص جاب نہیں ہے، میں کیا ساری زندگی اسی طرح گزار دوں گا، پھر آپ نے میرے لئے پڑھی لکھی لڑکی لانے کا پلان بنا رکھا ہے، تو میں نے سوچا کہ مجھے بھی مزید پڑھنا چاہیے۔“ وہ پھپکی سی ہنسی ہنستے ہوئے بولا تھا، وہ بس اسے دیکھ گئیں، ان کا دل کہہ رہا تھا کہ اصل بات کچھ اور ہے اور ان کے لئے یہ زیادہ فکر کی بات تھی کہ زندگی میں پہلی بار ان کے سعادت مند اور شریف بیٹے نے ان سے بات چھپائی تھی، ان سے غلط بیانی کی تھی، مگر انی الحال وہ خاموش ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

عینی احمد شہید صدمے سے دو چار تھا، اس کے والدین کا حادثے میں چل بے تھے، وہ بے یقین، شکاک سا کھڑا ہوا تھا، ابھی چند منٹ پہلے تو ماما اس سے بات کر رہی تھیں، پھر یوں اچانک، وہ نیچے بیٹھتا چلا گیا، اس کا دل اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہ تھا، اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری تھا۔

”ماما! پاپا!.....!“ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تھا۔

”میں بہت اکیلا ہو جاؤں گا، ایسا نہ کرنا میرے ساتھ۔“ وہ اونچا لمبا لڑکا پھوٹ پھوٹ کر رورہا تھا، بہت دیر رو گئے سے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا، اس نے حقیقت پر غور کیا۔

ایک پیڑ پر بٹھایا اور خوبھی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

”کہو؟“ نوبیلہ اس کی جانب دیکھ رہی تھی، لب سے، بنا پلکیں جھپکائے۔

”کیا کہوں؟“ اس کا دل بھرانے لگا تھا، سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کیا کرے اور کیا کہے۔

”وہ درد، جو تمہارے دل کو کاٹ رہا ہے، آنکھوں سے ٹپک رہا ہے، جس نے تمہارے لبوں سے ہنسی چھین لی ہے، یہ جو پیاس ہے تمہاری آنکھوں میں، کس چیز کی ہے؟“ نوبیلہ نے چونکتے ہوئے اس کی جانب دیکھا تھا، وہ سخت حیران تھی، بھلا وہ کیسے جان سکی کہ اس کے اندر کوئی درد ہے اس کے دل میں کوئی پیاس ہے، وہ فیصلہ نہ کر پا رہی تھی کہ اسے کچھ بتائے یا نہ، وہ تو اسے جانتی تھیں، اس کا نام بھی معلوم نہ تھا، مگر اس کا نرم اور ہمدرد لہجہ اسے سب بتانے پر مجبور کرنے لگا، وہ درد جو وہ انہوں سے چھپائے، خود کو کمپوز کرتے کرتے ٹھنکے لگی تھی، اس سے بیان کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔“ اس نے نگاہیں جھکا لیں، اتنا کہہ کر ہی اسے لگا جیسے مزید کچھ بھی کہنے کو نہیں بچا، وہ سسک اٹھی۔

”میں نے اس سے بھیک مانگی، محبت کی بھیک، رحم کی بھیک، مگر اس نے مجھے دھتکار دیا، ٹھکرا دیا، میری محبت جتنی بوھتی گئی، وہ اتنی ہی مجھ سے نفرت کرتا گیا، میں نے بہت کوشش کی اس کے دل میں جگہ بنانے کی، مگر نا کام رہی۔“ اس کی آنکھوں کے گوشے بھگنے لگے تھے۔

”میرا دل اسے بھلا نہیں پارہا، لاکھ کوشش کروں، وہ ذہن سے نہیں نکلتا، ایک لمحے کے لئے بھی نہیں بھولتا، میں کیا کروں، بہت تکلیف میں ہوں۔“ آنسو پلکوں کی باڑھ توڑ کر اس کے

رخساروں پر بہنے لگے تھے، اس کا بدن ہولے ہولے کانپنے لگا تھا، اس لڑکی نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا، نوبیلہ کے رونے میں روانی آ گئی تھی۔

”محبت ایک بہت قیمتی خزانہ ہے، یہ کبھی بھی بھیک میں نہیں ملتی، اسے کبھی بھی مانگنا نہیں چاہیے، جب آپ اس دنیا میں کسی انسان کو اتنا زیادہ چاہو اور وہ آپ کو نہ ملے، آپ سے دور بھاگے اور آپ کی محبت سچی ہو، تو جان لو اللہ آپ کو اس سے زیادہ سے نوازنا چاہتا ہے، وہ آپ کو اپنی محبت دینا چاہتا ہے اور جسے اللہ کی محبت مل جائے اسے پھر بھلا دنیا والوں کی محبت سے کیا غرض۔“ نوبیلہ نے اچانک سراو پر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا تھا۔

”کیا میں اس قابل ہوں؟“ اس نے کپکپاتے لبوں سے اس سے سوال کیا تھا۔

”کوئی بھی اس کی محبت کے قابل نہیں ہوتا، بس وہ جس پر نظر ڈالتا ہے، اس کی نظر میں تم بھی ہو۔“ نوبیلہ کے آنسو ٹھنک گئے تھے، وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی، جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو، بھلا وہ اتنی خوش بخت کہاں تھی، وہ چند ثانیے اس لڑکی کی جانب دیکھتی رہی۔

”میں بہت بری ہوں، اسے سب بتا ہے میرا۔“ وہ آگے بڑھ کر اس کے گلے لگ گئی تھی۔

”میں بہت بری ہوں، میں بہت گناہگار ہوں، میں اس کی نظر کے قابل نہیں ہوں، میری اوقات اتنی نہیں ہے۔“ وہ زور زور سے رورہی تھی، وہ لڑکی اس کی پشت سہلا رہی تھی، اس کے رونے میں روانی آتی جا رہی تھی، آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہ لے رہے تھے، اس نے نوبیلہ کو رونے دیا اور چپ نہیں کروایا۔

☆☆☆



”نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔“ دل پھر بھرانے لگا تھا، آنسو پھر سے بہنے لگے تھے، اس کی زندگی کا محور، اس کا کل سرمایہ اس کے والدین تھے، ان کے سوا اس کا کوئی نہ تھا اور اب وہ انہیں بھی کھو چکا تھا۔

”کاش میں پاکستان نہ جاتا، تو ہم یوں تباہ نہ ہوتے، سب کچھ ختم نہ ہوتا۔“ اسے وہ وقت یاد آیا جب ماما نے اسے پاکستان جانے کا کہا تھا، جس کے بعد ان کی فیملی کی بربادی شروع ہوئی تھی، وہ کتنی پرسکون اور خوشگوار زندگی گزار رہے تھے کہ رفتہ رفتہ سب کچھ ختم ہو گیا، ان کی زندگیوں میں ایسا بھونچال آیا کہ سب کچھ بھر گیا اور وہ لوگ سمیٹ بھی نہ سکے۔

☆☆☆

فارقلیط حسن اسے لینے کے لئے فوراً آ گیا تھا، وہ فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گئی، اس نے گاڑی آگے بڑھا لی، فارقلیط حسن نے بغور اس کی جانب دیکھا۔

”How was your day?“ چند ثانیے وہ اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا، مگر جب وہ مسلسل خاموش رہی تو اسے پوچھنا ہی پڑا۔

”Very bad“ نا چاہتے ہوئے بھی وہ کہہ گئی، ساتھ ہی اسے وہ لڑکا اور اس کی حرکت یاد آ گئی، خوف کے مارے اس نے جھرجھری لی، فارقلیط حسن نے گردن گھما کر اس کی جانب دیکھا تھا، وہ بہت تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔

”اوہ! bad! کیوں؟“ وہ پوچھے بناء نہ رہ سکا۔

”میں بہت بور ہوئی۔“ عروہ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تو خود کو سنبھال کر احتیاط سے بولی، وہ حقیقتاً اس لڑکے کی وجہ سے پریشان ہو گئی تھی،

اسے ہر بات، ہر پریشانی فارقلیط حسن سے شیئر کرنے کی عادت ہو چکی تھی اور اسے بتا کر وہ ریلیکس بھی ہو جایا کرتی تھی، مگر یہ بات وہ اس سے چھپا گئی، بتانے کا حوصلہ ہی نہ ہوا۔

”اوہ۔“ فارقلیط حسن بولے سے ہنس دیا۔

”ابھی تو پہلا دن تھا نہ، آہستہ آہستہ دل لگ جائے گا۔“ اس نے عروہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”تمہاری کوئی فرینڈ نہیں بنی؟“ وہ استفسار کرنے لگا، جواب میں عروہ نے سرفنی میں ہلا دیا۔

”تو یا ر کوئی فرینڈ ہو، ساتھ باتیں کرنے، گھومنے پھرنے کے لئے، پھر یہی انجوائے کیا جا سکتا ہے، اب اکیلا بندہ تو بور ہی ہوتا ہے نہ۔“ اس کی بات پر وہ خاموش ہی رہی، اسے کوئی جواب نہ سوجھا، صبح یونیورسٹی جاتے ہوئے وہ جتنی خوش اور ایکساٹنڈ تھی، اب موڈ اتنا ہی سنجیدہ اور دل بھجا بھجا سا تھا۔

رات کے کھانے پر ڈیڈی ان لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، عروہ خاموشی سے کھانا کھا رہی تھی، جبکہ وہ دونوں باپ بیٹا برس سے متعلق باتیں کر رہے تھے۔

”عروہ بیٹا! یونیورسٹی میں فرسٹ ڈے کیسا رہا؟“ اچانک ڈیڈی نے اس سے پوچھا تھا۔

”تھیک رہا ڈیڈی۔“ اس نے آہستگی سے جواب دیا، فارقلیط حسن اس کو دیکھنے لگا تھا۔

”کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتانا۔“ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا، کھانا کھا کر وہ اپنے روم میں آ گئی تھی، فارقلیط حسن جب کمرے میں آیا تو وہ نماز پڑھ رہی تھی، وہ ایک فائل لے کر بیٹھ گیا اور اس کا انتظار کرنے لگا، وہ بار بار فائل سے نظریں ہٹا کر عروہ کی جانب دیکھتا تھا۔

”سوئے لگی ہو؟“ نماز پڑھ کر جب وہ لیٹنے لگی تو فارقلیط حسن نے اس سے سوال کیا۔

”جی!، مختصر جواب آیا۔“ اگر تم کسی بات سے پریشان ہو تو مجھ سے شیئر کر سکتی ہو، مے بی میرے پاس تمہاری پریشانی کا solution ہو۔“ اس نے فراخ دلی سے پیشکش کی تھی، عروہ غصہ چنڈاٹے بغور اس کے مہربان چہرے کو دیکھتی رہی اور پھر لیٹ گئی۔

”میں کیوں پریشان ہونے لگی، بس تھک گئی ہوں۔“ اس نے آنکھیں موند لیں، فارقلیط حسن کو اس کی بات پر یقین نہ آیا تھا، مگر فی الوقت وہ خاموش ہو گیا تھا، اسے عروہ کی آنکھوں میں ایک انجانا خوف نظر آتا تھا، جو شادی کے ابتدائی دنوں میں نظر آتا تھا، صبح یونیورسٹی جاتے ہوئے جو خوشی و شرات اور اعتماد اس کی آنکھوں میں تھا، وہ اس وقت مفقود تھا، فارقلیط حسن فائل رکھ کر لیٹ گیا۔

☆☆☆

موسیٰ علی کو جب زین ندیم کا ریزائن پیپر ملا تو وہ ورطہ حیرت میں ڈوب گیا، پہلے تو اسے یقین ہی نہ آیا کہ واقعی یہ سچ ہے، اس نے سمجھا شاید زین نے مذاق کیا ہے، اس نے فوراً مان اٹھا کہ زین کو کال کی۔

”السلام علیکم سرا!“ اس کی سماعتوں سے زین ندیم کی سنجیدہ مودبانہ آواز نکل گئی۔

”زین یہ کیسا مذاق ہے؟“ موسیٰ علی نے فوراً پوچھا۔

”کیا سرا؟“ اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا، ورنہ سمجھ تو وہ گیا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، مگر فوری جواب نہ دے سکا۔

”آپ نے ریزائن کر دیا ہے؟“ موسیٰ علی نے سوال کیا تھا، چند ثانیے خاموشی چھائی رہی۔

”جی سرا!“ اس نے بالآخر کہہ ہی دیا۔

”مگر کیوں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”سر میں Study کرنا چاہتا ہوں اس لئے۔“ اس نے جواب دیا۔

”کل پرسوں تک تو آپ کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا، پھر یوں اچانک۔“ موسیٰ علی کو اس کی بات پر یقین نہ آ رہا تھا۔

”سر آپ جانتے ہیں، میں کبھی بھی، کسی بھی ٹائم ارادہ بدلیتا ہوں، بس مجھے ایسا لگنے لگا ہے کہ میرا فیوچر اس جاب سے کچھ خاص برائٹ نہیں ہے، مجھے study کرنی چاہیے، اس لئے میں نے یہ Decision لیا، میری امی بھی میرے اس فیصلے سے خوش ہیں۔“ موسیٰ علی کے دل میں اس کے لئے ایک خاص مقام تھا، بہت کم وقت میں وہ ایک خاص اہمیت اختیار کر گیا تھا، اس کا یوں اچانک آفس چھوڑ جانا، اسے اداس کر گیا تھا۔

”یہ تو اچھی بات ہے، لیکن کبھی بھی آپ آفس آنا چاہیں یا Rejoin کرنا چاہیں تو You are most wellcome۔“ موسیٰ علی نے فراخ دلی سے پیشکش کی تھی، اس کی بات سے اس کے لبوں پر ہر خندا بھرا تھا۔

”تھیک ہو سرا!“ اس نے کہا، کچھ ہی دیر میں اس نے فون بند کر دیا، امی کا بج گئی ہوئی تھیں، وہ اس وقت اکیلا تھا، صوفے کی پشت سے ٹپک لگا کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

”آپ بہت جھوٹے ہیں سر موسیٰ اور مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔“ وہ دل ہی دل میں سوچ کر رہ گیا، اسے ان سے اتنے بڑے دھوکے اور غلط بیانی کی توقع نہ تھی، اگر وہ شروع میں ہی بتا دیتے کہ فردا ان کی بیوی ہے تو شاید وہ اتنا آگے نہ بڑھتا، اپنے قدموں کو وہیں روک لیتا،



لیکن ان کے جھوٹ نے اس کا بہت نقصان کیا تھا، اسے محلوں میں تہی داماں کر دیا تھا۔

☆☆☆

غصنفز علی آفس نہیں گئے تھے، صوفیہ انتظار کرتی رہیں اور بالآخر ان کے پاس آگئیں، وہ بیڈ پر بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔

”غصنفز!“ وہ ان کے قریب آئیں اور بولے سے آواز دی۔

”غصنفز آپ ٹھیک تو ہیں؟“ انہوں نے دوبارہ پوچھا، مگر جواب نہ ارد۔

”غصنفز!“ صوفیہ نے گھبرا کر انہیں جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ انہوں نے آنکھیں کھولتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

”آپ ٹھیک ہیں؟“ وہ خوفزدہ دکھائی دے رہی تھیں۔

”میں زندہ ہوں صوفیہ!“ وہ شکست خوردہ لہجے میں بولے تھے۔

”اتنی آسانی سے نہیں مروں گا۔“

”خدا نہ کرے۔“ بے اختیار ان کے منہ سے نکلا تھا۔

”صبح کیا فضول باتیں کر رہے ہیں۔“

وہ ان کی بات سن کر دہل گئی تھیں، انہوں نے غصنفز علی کو بہت چاہا تھا، انہیں حاصل کرنے کے لئے

جانے کتنے دل توڑے تھے، کتنے خواب اجاڑے تھے، کتنی زندگیاں برباد کی تھیں اور اس سب کے لئے وہ خود کو حق بجانب سمجھتی تھیں، ان کا خیال تھا

اپنی محبت کو پانے کے لئے انسان جو بھی کرتا ہے وہ جائز ہوتا ہے، انہوں نے جو غصنفز علی اور گل افروز کے ساتھ کیا تھا، اس پر انہیں کوئی شر زندگی

نہ تھی اور اب جو عروہ کے ساتھ کیا اس پر بھی وہ ذرا بھی اشرمندہ نہ تھیں۔

”تمہارے لئے یہ فضول باتیں ہیں، مگر میری زندگی کی حقیقت یہی ہے، جب انسان کسی

معصوم پر ظلم ڈھاتا ہے اور ظلم سہنے والا خاموشی سے اس کو برداشت کر لیتا ہے تو خدا اس کو لکھ رکھتا

ہے، وہ تو ایک ایک لمحے کا حساب رکھتا ہے اور پھر ایک دن ظلم کرنے والے کے سامنے اس کے

سب گناہ آجاتے ہیں، اس کے ضمیر پر ہتھوڑے برسائے، اس کی روح پر تازیانے برسائے،

صوفیہ تم فکر نہ کرو، میں جلدی نہیں مروں گا۔“ وہ خاموش ہو گئے تھے، صوفیہ ان کے زرد چہرے کو

فکر مندی سے دیکھ رہی تھیں، وہ نہ تو ٹھیک سے کچھ کھاتے تھے، نہ سوتے تھے، وہ سخت تکلیف

میں تھے، مگر صوفیہ کچھ نہ کر رہی تھیں۔

”آپ بے قصور ہیں غصنفز!“ وہ انہیں ضمیر کے بوجھ تلے سے آزاد کرنا چاہتی تھیں۔

”تمہارے کہنے سے میرا دل نہیں مانے گا۔“ انہوں نے ایک گہری سانس سینے سے

خارج کی تھی۔

”آپ فریش ہو جائیں، میں ناشتہ بناتی ہوں آپ گئے لئے۔“ انہوں نے بات کو سینٹے

ہوئے موضوع بدلا، غصنفز علی اٹھ کر خاموشی سے واش روم کی جانب بڑھ گئے تھے، وہ انہیں جاتا

دیکھتی رہیں، فون کی بیل بجی، وہ باہر کی جانب لپکیں۔

☆☆☆

عیسیٰ احمد کیسے پاکستان آیا، کس طرح جنازے میں شریک ہوا، سب کچھ وہ غائب دماغی

کیفیت سے کر رہا تھا، اسے بالکل یقین نہ آ رہا تھا، جو ہو گیا تھا، صوفیہ نے اسے دیکھا تو دل کی

حالت غیر ہونے لگی، ایک طرف وہ ان کی مرضی بہن کا بیٹا تھا، تو دوسری طرف وہ ان کی بیٹی کی

خوشیوں کا قاتل بھی تھا، اس نے کس سفاکی سے

ان کی بیٹی سے ان کے کیے کا بدلا لیا تھا، ان کہ نویلہ کو بدل کر رکھ دیا تھا، وہ پہلے والی نویلہ لگتی ہی نہ تھی۔

”ممائی نے تمہیں بلوایا ہے۔“ وہ سر جھکائے بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا، جب علیشہ روم میں

آئی، سرد اور سپاٹ انداز میں کہہ کر وہ پلٹنے لگی تھی۔

”آ کر کھانا کھا لو۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس کی طرف دیکھے بغیر اس نے جواب دیا تھا، علیشہ طیش کے

عالم میں پلٹی تھی۔

”یہاں تمہارے ناز، غرے دیکھنے کے لئے کوئی نہیں بیٹھا ہوا، مجھے ممائی نے بھیجا تو میں آ

گئی، ورنہ میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔“ وہ دانت پیستے ہوئے نفرت سے گویا

ہوئی۔

”شکریہ!“ عیسیٰ احمد نے سنجیدگی سے کہا تو علیشہ کا غصہ مزید بڑھ گیا۔

”کیا سمجھتے ہو تم خود کو؟“ وہ پلٹ کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

”میں آپ سے بات نہیں کرنا چاہتا، بہتر ہوگا آپ یہاں سے چلی جائیں۔“ وہ خود پر ضبط

کرتے ہوئے بولا، اس نے اپنے ماں باپ کو ایک ساتھ کھو دیا تھا، محلوں میں وہ تنہا ہو گیا تھا،

اسے یہ دکھ مزید بے چین کر رہا تھا کہ ماما نے آخری بار اس سے بات کرتے ہوئے ناراض ہو

کر فون بند کیا تھا، اسے ان سے وہ آخری بات، وہ گفتگو بار بار یاد آتی تھی، بابا کا چہرہ، نظروں کے سامنے گھوم جاتا تھا۔

”تم سے بات کرنے کے لئے مرکون رہا ہے۔“ وہ حقارت سے گویا ہوئی۔

”تم نے جو میری بہن کے ساتھ کیا، ساری

زندگی سکون نہ پاؤ گے۔“ وہ پھنکاری، عیسیٰ احمد خاموش رہا، وہ شدید ذہنی توڑ چھوڑ اور بے چینی کا شکار تھا، جب وہ کچھ نہ بولا تو وہ واپس مڑ گئی، دو

منٹ بعد ممائی جان اس کے سامنے تھیں۔

”بیٹا! کھانا کھا لو۔“ وہ اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔

”جانے والوں کے ساتھ ہم جا تو نہیں سکتے۔“ انہوں نے نرمی سے اپنا ہاتھ بھرے لہجے

میں کہا، عیسیٰ احمد کا ٹوٹا پھوٹا انداز انہیں افسردہ کر رہا تھا۔

”ابھی بھوک نہیں ہے، آپ فکر نہ کریں ممائی، جب بھوک لگی کھالوں گا۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا

تھا۔

”دودن سے تم نے کچھ نہیں کھایا بچے، بیمار پڑ جاؤ گے۔“ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”ماما اور بابا کے جانے کے بعد بھی میں زندہ ہوں، تو یقین رکھیں میں زندہ ہی رہوں گا،

بھوک سے نہیں مروں گا۔“ اس نے سائیڈ ٹیبل سے اپنا موبائل اور والٹ اٹھایا تھا۔

”میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔“ وہ باہر کی جانب بڑھا، انہوں نے اسے روکا نہیں

تھا، وہ چلا گیا۔

☆☆☆

اگلے روز یونیورسٹی جاتے ہوئے عروہ بھیجی بھیجی سی تھی، فارقلیط حسن نے فی الحال اسے کچھ

بھی کہنا مناسب نہ سمجھا، اسے ڈراپ کر کے وہ آفس چلا گیا، وہ سارا دن بہت محتاط رہی، کہیں

وہی لڑکا پھر اس کا راستہ نہ روک لے، مگر آج وہ نظر نہ آیا تھا، عروہ نے شکر ادا کیا۔

واپسی پر اسے فارقلیط حسن نہیں، بلکہ ڈرائیور لینے آیا تھا، اس بات پر اس کا موڈ خاصا آف ہوا تھا۔



”فارقلیط صاحب کیوں نہیں آئے؟“ اس نے بیٹھتے ہی ڈرائیور سے پوچھا۔  
”سر میٹنگ میں تھے۔“ ڈرائیور نے مودب ہو کر جواب دیا تھا، گھر آکر وہ فریش ہو کر سو گئی تھی، دن ڈھلنے لگا، شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے، دن بھر کا تھکا ہارا سورج اب سونے کو بے تاب تھا، پرندے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔

فارقلیط حسن گھر آیا تو غیر معمولی خاموشی کا احساس ہوا، وہ سیدھا اپنے بیڈروم میں آیا، عروہ کو سوتا دیکھ کر وہ فریش ہونے چلا گیا، واپس آیا تو اسے اسی طرح سوتا پا کر اسے تشویش ہوئی۔  
”عروہ!“ اس کے پاس کھڑا، وہ اسے آوازیں دے رہا تھا، وہ ڈرا سا کسماسی، فارقلیط حسن نے اس کا گال تھپتھپایا، اس نے آنکھیں کھول دیں۔

”اٹھ جاؤ یار، شام ہو گئی۔“ اس نے مندی مندی آنکھوں سے فارقلیط حسن کو دیکھا اور اٹھ گئی، فریش ہو کر وہ دونوں لان میں چلے گئے تھے۔

”لنچ کیا تھا تم نے؟“ فارقلیط حسن نے اس سے پوچھا تھا، وہ ایسے ہی اس کی فکر کیا کرتا تھا، چھوٹی سی بات کے لئے اسے لے کر پریشان ہو جاتا تھا۔

”جی!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔  
”میں سے سینڈوچ کھایا تھا۔“  
”آج کا دن کیسا رہا؟“ بلگران کے لئے چائے لے آیا تھا اور چائے کے ساتھ اچھے خاصے لوازمات تھے، وہ ان دونوں کو چائے سرو کر کے چلا گیا تھا۔

”کل سے اچھا۔“ اس نے چائے کا کپ لبوں سے لگا لیا، فارقلیط حسن نے گہری نظروں

سے اسے دیکھا، وہ واقعی کل کی نسبت فریش لگ رہی تھی۔

”کوئی فرینڈ بنی؟“ وہ سرسری سا پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔“ عروہ نے سر نفی میں ہلایا۔  
”میرے فرینڈ تو آپ ہیں۔“ اس کی بات پر وہ بے ساختہ ہنس دیا تھا۔

”میں تو تمہارا بوائے فرینڈ ہوں نہ۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے مذاق کیا تھا، عروہ نے اسے آنکھیں نکالیں، مگر وہ نظر انداز کر گیا تھا۔  
”کسی لڑکی کو دوست نہیں بنایا؟“ وہ

استفہامیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔  
”آپ نے شادی سے پہلے مجھ سے فرینڈ شپ کرنے کی کوشش کی تھی، پھر کامیابی ہوئی؟“ وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے لطیف سا طنز کر رہی تھی، فارقلیط حسن بھی اس کی بات پر ہنس دیا تھا۔

”تم شکل سے جتنی معصوم لگی تھی، اتنی ہی چالاک نکلی تھی، جب میں نے تمہارا دیا ہوا نمبر ڈائل کیا تو تمہاری چالاکी سمجھ میں آ گئی تھی، دے دے تم نے نام تو اچھا بتایا تھا، ماہ جیبن۔“ اس نام کو یاد کر کے عروہ کے لبوں کو بھی مسکراہٹ چھو گئی تھی۔

”تم پر یہ نام بھی سوٹ کرتا ہے، ماہ جیبن۔“ عروہ خاموش رہی تھی۔  
”تمہیں پتا ہے میں نے تمہیں کتنا تلاش کیا، مگر تم مجھے نہیں مل رہی تھی، مجبوراً میں نے شاہ زیب سے بات کی۔“ اسے بتا رہا تھا اور عروہ دلچسپی سے سن رہی تھی۔  
”مائی گاڈ! آپ نے شاہ زیب بھائی کو بتا دیا۔“ اس نے کچھ پریشان ہو کر فارقلیط حسن کی جانب دیکھا۔

”ہاں۔“ فارقلیط حسن نے بتایا۔

”میں نے تمہارا حلیہ بتا کر اور نام بتا کر پوچھا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا، اس دن پھر تمہاری بہن کی سالگرہ والے دن میں اچانک وہاں آ گیا اور تم مجھے نظر آ گئی۔“ اس نے پوری تفصیل بتائی۔  
”شکر ہے آپ وہاں آ گئے۔“ عروہ نے اس وقت کو یاد کیا تو شدید اذیت کا احساس اسے

رگ دے میں بھرتا ہوا محسوس ہوا تھا۔  
”مجھے وہاں آنا ہی تھا، کیونکہ تمہیں میرے پاس آنا تھا عروہ، اللہ نے تمہیں خاص میرے لئے بنایا ہے۔“ اس کے ان الفاظ سے عروہ کا دل تشکر کے احساس سے بھرنے لگا تھا۔

”شاپنگ کا موڈ ہے؟“ اسے اداس ہوتے دیکھ کر اس نے موضوع بدل ڈالا تھا۔  
”بالکل بھی نہیں۔“ اس نے فوراً منع کیا۔  
”یونیورسٹی جانے کے لئے کچھ نئی شاپنگ کرلو۔“ اس کی آفر ہنوز برقرار تھی۔

”فارقلیط حسن میرے پاس آل ریڈی سب کچھ ضرورت سے بہت زیادہ ہے، میری وارڈ رُوب بھری پڑی ہے۔“ اس نے منع کیا تو پھر فارقلیط حسن نے بھی دوبارہ نہ کہا، وہ اس پر کسی معاملے میں سختی یا زور، زبردستی نہ کرتا تھا۔

☆☆☆

زین ندیم کو دکھانے اور ٹھکرانے کے بعد فردا بہت بے چینی محسوس کرنے لگی تھی، اسے عیسیٰ احمد سے اپنی محبت اور پھر اس کا ہمیشہ کے لئے خود سے دور چلے جانا یاد آیا تھا، اس شام موسیٰ علی گھر آیا تو کافی سنجیدہ سا تھا۔

”کیا بات ہے، آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟“ وہ استفسار کرنے لگی۔

”ہاں۔“ اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا، وہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھا لٹینوں کو دوبارہ ہاتھ، فردا اس کے لئے پانی لے آئی تھی اور پھر چائے بنانے

لگا۔

”ہاں۔“ اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا، وہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھا لٹینوں کو دوبارہ ہاتھ، فردا اس کے لئے پانی لے آئی تھی اور پھر چائے بنانے

لگی۔

”میرا ایک بہت اچھا ورکر زین ندیم اچانک آفس چھوڑ گیا۔“ اس نے چائے پیتے ہوئے یونہی باتوں باتوں میں تذکرہ کیا بتایا، فردا نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

”کیوں چھوڑ گیا؟“ اس نے یونہی برسبیل تذکرہ پوچھ لیا۔

”کہتا ہے Study کرنے لگا ہوں، مگر مجھے لگتا ہے، اصل بات یہ نہیں ہے۔“ وہ موسیٰ علی کی چالاکي اور زمانہ شناسی پر دل ہی دل میں حیران ہوئی تھی۔

”چلیں آپ ٹینشن نہ لیں، اس طرح تو آفس میں لوگ آتے جاتے رہتے ہوں گے۔“ اس نے موسیٰ علی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ اس نے ہنکارا بھرا۔  
”مگر یہ لڑکا بہت اچھا تھا، بے ریا، خالص، بہت شریف، ہر ایک کی عزت کرنے والا۔“ فردا جانتی تھی کہ وہ یوں ہی کسی کی تعریف نہیں کرتا، یقیناً وہ لڑکا بہت اچھا ہوگا اور یہ اس نے دیکھا تھا کہ دنیا میں جو جتنا زیادہ اچھا ہے، اتنے زیادہ دکھ اٹھاتا ہے۔

”پاپا! آئسکریم۔“ معصوب روم سے باہر نکلا تھا، موسیٰ علی کا دھیان اس کی طرف ہو گیا۔  
”میرے بیٹے کو آئسکریم کھانی ہے؟“ موسیٰ علی نے اسے گود میں اٹھالیا۔  
”جی!“ اس نے سر ہلایا۔

”فردا ایسا کرو ریڈی ہو جاؤ، تم دونوں کو آؤٹینگ پر لے کر جاتا ہوں۔“ فردا اٹھ کر اندر چلی گئی تھی اور مجھے مجھے دل کے ساتھ تیار ہونے لگی۔

☆☆☆

عیسیٰ احمد کافی دیر سے غنغفر ہاؤس کے گیٹ

2018



کے سامنے کھڑا تھا، وہ خود میں ہمت مجتمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ بات کہنے کے لئے جس کے لئے وہ یہاں آیا تھا، بالآخر اس نے قدم اندر کی جانب بڑھادیئے تھے، لاؤنج میں اسے صوفیہ آنٹی نظر آگئی تھیں۔

”السلام علیکم!“ اس نے سلام کیا تھا، صوفیہ نے سر اٹھا کر دیکھا، اپنے سامنے کھڑے عیسیٰ احمد کو دیکھ کر ان کے چہرے پر شدید ناگواری کے تاثرات پھیل گئے تھے۔

”تم میری مرحومہ بہن کے بیٹے ہو، اس لئے بہت آرام سے کہہ رہی ہوں یہاں سے واپس مڑ جاؤ۔“ وہ غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولیں۔

”مجھے نویلہ سے ملنا ہے۔“ اس نے ان کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”کیا؟“ وہ تو گویا اچھل کر کھڑی ہوئی تھیں اور حیران نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھیں۔

”میری بات کان کھول کر سن لو عیسیٰ احمد میری بیٹی کو مزید دکھ دینے کی اجازت میں تمہیں ہرگز نہیں دوں گی۔“ انہوں نے دو ٹوک انداز میں اسے سمجھایا۔

”میں اسے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔“ اس نے مصالحت آمیز انداز میں کہا۔

”ہرگز نہیں، تم سے اس کا ہر رشتہ ختم ہو چکا ہے، وہ پڑھ رہی ہے، اپنا فوج بنائے گی اور پھر اسے تم سے بھی اچھا لڑکا مل جائے گا۔“

”میں اسے دیکھنے لگی۔“ صوفیہ زور سے چلائیں۔

”نویلہ مجھے تم سے بات کرنی ہے، مگر تمہاری ماما مجھے روک رہی ہیں، سمجھاؤ انہیں۔“ اس نے نویلہ کی جانب بددطلب نظروں سے دیکھا۔

”السلام علیکم!“ نویلہ نے سلام کیا، وہ جائے نماز اٹھا کر رکھنے لگی۔

”ماما! مجھے ان کی بات سننے دیں۔“ وہ پر سکون لہجے میں بولی۔

”نویلہ یہ وہی شخص ہے جو۔۔۔۔۔“

”ماما! اگر ایک شخص کہیں سے چل کر مجھ سے بات کرنے آئے تو وہ چاہے عیسیٰ احمد ہوں یا کوئی اور میں بات ضرور سنوں گی۔“ اس نے انہیں کوئی بھی سخت بات کہنے، ماضی کی تکلیف دہ باتوں کو پھیلنے سے منع کیا۔

”یہ بہت جھوٹا اور فریبی ہے، اس کی باتوں میں مت آنا۔“ وہ واپس مڑ گئیں۔

”بیٹھیں۔“ نویلہ نے صوفیہ کی طرف اشارہ کیا اور خود اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

”مجھے آپ کے پیرنس کا بہت افسوس ہے۔“ وہ ایک نظر اس پر ڈال کر اب میز پر رکھے گلدان میں موجود پھولوں کو دیکھنے لگی تھی۔

”نویلہ میں تمہیں لینے کے لئے آیا ہوں، چند دنوں میں تمہارے کاغذات بن جائیں گے، تم میرے ساتھ فرانس جاؤ گی۔“ عیسیٰ احمد کی بات پر اس نے اپنا جھکا ہوا سر تیزی سے اوپر اٹھایا تھا۔

”سوری عیسیٰ! میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔“ اس نے انکار کیا۔

”میں جانتا ہوں تم بہت ناراض ہو مجھ سے۔“

”میں نے تمہیں ہرٹ کیا ہے، پلیز مجھے صاف کر دو۔“ وہ منت بھرے لہجے میں بولا۔

”پہلی بات یہ کہ میں ناراض نہیں ہوں آپ سے، دوسری بات یہ کہ آپ نے مجھے ہرٹ نہیں کیا ہے، تو پھر معافی کا کوئی جواز نہیں۔“ وہ اب عیسیٰ احمد کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی تھی۔

”تو وہ محبت ختم ہو گئی جو تمہیں مجھ سے تھی۔“ اس نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

”محبت کبھی ختم نہیں ہوتی عیسیٰ!“ اس نے پل بھر کا توقف کیا۔

”یہ تو الوئی روشنی کی مانند ہوتی ہے، بڑھتی جاتی ہے، محبت کے پھٹنے سے جدائی کی تپش اور آگ جو آپ کے اندر چلے اس سے دوسروں کو جلاتے مت پھریں، بلکہ اس آگ سے دیا جلائیں اور اندھیری راتوں میں بھٹکنے والوں کے لئے رہبر بن جائیں اور میں نے بھی یہی کرنے کا فیصلہ کیا ہے عیسیٰ۔“ دھیرے دھیرے متانت اور گہری سنجیدگی سے، پر اثر انداز میں بولتی ہوئی وہ اس نویلہ سے بہت مختلف لگ رہی تھی جسے وہ جانتا تھا، کیا یہ اس کی جدائی کا اثر تھا، یا اس کے باپ کی بیماری، وہ سمجھ نہ پایا، وہ خاموشی سے اسے دیکھ گیا۔

”تو تم محبت کر کے پچھتا رہی ہو؟“ اس نے ہولے سے مسکراتے ہوئے طنز کیا تھا۔

”نہیں عیسیٰ!“ اس نے اپنا سر فنی میں ہلایا تھا۔

”محبت کو پالنے میں وہ مزہ ہرگز نہیں ہے جو اسے کھو دینے میں ہے، جب انسان ان چیزوں کو پانے کی کوشش کرتا ہے جو اس کی قسمت میں نہیں ہوتیں، اللہ کی رضا کے بغیر اپنی مرضی پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے بہت بڑی ٹھوکر لگتی ہے۔“ عیسیٰ احمد ناچنے کے عالم میں اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

”محبت میں ناکامی پر جو چوٹ لگتی ہے، اس میں بھی ایک انوکھا مزہ ہے، یہ چوٹ سب سے بھی ایک انوکھا سکون ہے، محبت پا کر انسان کچھ نہیں سیکھتا عیسیٰ! مگر محبت کو کھو کر بہت کچھ ایسا نظر آنے لگتا ہے جو پہلے دکھائی نہ دیتا تھا، آپ کو کھو کر میں نے وہ پایا ہے، جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا، مجھے اب آپ سے اور اللہ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔“ اس نے تفصیلاً کہا، عیسیٰ احمد چند ثانیے اسے دیکھتا رہا۔

”صوفیہ آنٹی کی بیٹی کے منہ سے ایسی باتیں، بہت حیران کن ہیں I can't believe this۔“ وہ حیرت زدہ تھا۔

”ماما آپ سے بڑی ہیں، جیسی بھی ہوں، ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”میں نے تمہیں ہرٹ کیا ہے، پلیز مجھے صاف کر دو۔“ وہ منت بھرے لہجے میں بولا۔

”پہلی بات یہ کہ میں ناراض نہیں ہوں آپ سے، دوسری بات یہ کہ آپ نے مجھے ہرٹ نہیں کیا ہے، تو پھر معافی کا کوئی جواز نہیں۔“ وہ اب عیسیٰ احمد کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی تھی۔

”تو وہ محبت ختم ہو گئی جو تمہیں مجھ سے تھی۔“ اس نے طنز کرتے ہوئے کہا۔



”میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ اس نے سختی سے کہا۔

”جو محبت آپ کے اندر عاجزی اور نرم مزاجی پیدا نہ کرے وہ محبت نہیں ہوتی عیسیٰ احمد!“ اس نے پل بھر کا توقف کیا۔

”وہ خود پسندی ہوئی ہے، خواہش کی غلامی ہوتی ہے۔“ نویلہ نے سائیڈ ٹیبل کو کھول کر اس میں سے طلاق نامہ نکالا تھا۔

”مجھے اب سمجھ آگئی ہے کہ دل کا اور روح کا رشتہ زبردستی نہیں جوڑا جاسکتا، میں نے بتا بھی میں کوشش کی اور آپ سے یہ کاغذی، کمزور رشتہ جوڑ بیٹھی، میں آج آپ کے سامنے اس پر سائن کر کے آپ کو ہر طرح کے بوجھ سے آزاد کر رہی ہوں۔“ اس نے پین پکڑا، عیسیٰ احمد ساکت ہو گیا، وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا۔

”اور میں نے آپ کو معاف کیا، سچے دل سے معاف کیا، دل پر کوئی بوجھ لے کر مت بیٹے گا۔“ وہ شکستہ قدموں سے چلتا ہوا دروازے کی جانب بڑھا، اس نے پلٹ کر نویلہ کے پرسکون چہرے کو دیکھا، اس کی ساری بے چینی و بے سکونی عیسیٰ احمد کے اندر بھر گئی تھی، وہ باہر نکل گیا، نویلہ بیڈ پر اوندھے منہ گری تھی، دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

☆☆☆

عروبہ لائبریری میں سے نکل رہی تھی جب اچانک وہی لڑکا اس کے سامنے آ گیا تھا۔

”ہائے کیسی ہو؟“ وہ اس کی سائیڈ سے ہو کر نکل گئی تھی۔

”بات تو سنو عروبہ!“ اس نے بے تکلفی سے اس کا نام لے کر پکارا تھا، عروبہ رک گئی۔

”مجھے تم سے دوستی کرنی ہے۔“ عروبہ اس کی اس جرات پر شاکہ کڈ رہی تھی۔

”آؤ کہیں بیٹھ کر آرام سے بات کرتے ہیں۔“ اس کا یہ بے تکلف، دوستانہ انداز عروبہ غصے کو آگ لگا لیا۔

”دیکھو مسٹر اور اسرارٹ بننے کی ضرورت نہیں ہے میں میرڈ ہوں اور میرے ہر بیٹڈ بہت.....“

”تم میرڈ ہو؟“ اس نے ہونٹ سکڑے۔

”گلتی تو نہیں، آئی مین بہت چھوٹی سی دھتی ہو۔“ اس نے کہا۔

”بہتر ہو گا آپ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔“ عروبہ جانے لگی، اس نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی تھام لی۔

”تمہارا پیچھا تو اب میں سائے کی طرح کروں گا۔“ اس کی حرکت نے عروبہ کو طیش دلادیا تھا، اس نے مڑ کر ایک زوردار ٹھپڑ اس کے منہ پر مارا۔

”آئندہ میرے پیچھے آنے سے پہلے اس ٹھپڑ کو یاد کر لیتا۔“ کہہ کر وہ رکی نہیں تیز قدم اٹھائی گیٹ کی طرف جانے لگی، وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا، عروبہ نے کسی روکی اور گھر آگئی۔

”کیا کروں؟ کیا فارقلیط حسن کو اس کے متعلق بتاؤں؟“ وہ سخت پریشان تھی، اسے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی۔

”یا اللہ! مجھے مزید کسی آزمائش میں مت ڈالنا، میں بہت مشکل سے سراٹھا کر چلنے کے قابل ہوئی ہوں، مزید کوئی ذلت نہیں سہہ سکتی، کسی غم کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔“ اس کا دل بھرانے لگا تھا، وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی، اسے یہ سارے آنسو فارقلیط حسن کے آنے سے پہلے بہانے تھے۔

☆☆☆

فروا ایکسپریٹ کر رہی تھی، اس خبر نے موسیٰ علی کو پریشان کر دیا تھا، وہ یس بن کر باکل چپ ہو گیا تھا، بالآخر اس نے فروا سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”فروا!“ وہ معصوب کو سلا رہی تھی، موسیٰ علی کی آواز سن کر اس نے خاموشی سے اس کی جانب دیکھا۔

”مجھے بچہ نہیں چاہیے۔“ اس کی بات نے فروا کو حیران کر دیا تھا۔

”میرا خیال ہے ہمارے لئے معصوب ٹھیک ہے، بس اسی کو.....“

”آپ کو نہیں چاہیے ہو گا، مگر مجھے تو چاہیے۔“ فروا نے بغیر کسی لحاظ کے کہہ دیا۔

”میں معصوب کو بہت چاہتی ہوں، اس کے لئے کبھی میرا پیار کم نہیں ہو گا۔“ اس نے بہت آرام سے ادب سے بات کی تھی۔

”فروا میں کہہ رہا ہوں نہ کہ ابھی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے سمجھلاتے ہوئے کہا۔

”موسیٰ کیا آپ دو بچے انورڈ نہیں کر سکتے؟“ فروا نے کچھ غلطی سے کہا۔

”فضول باتیں مت کرو، وہ گھڑا۔“

”میری اجازت کے بغیر تم اکیلی یہ فیصلہ نہیں کر سکتی۔“ اس نے اپنے اختیارات کا اسے احساس دلانا چاہا۔

”اور آپ بھی میری مرضی کے بغیر تنہا یہ فیصلہ نہیں کر سکتے۔“ اس میں ایک دم سے وہی پرانی والی فروا زندہ ہو گئی تھی، جو اپنے حق کے لئے لڑنا، آواز اٹھانا جانتی تھی۔

”خند مت کرو، اس کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔“ اس نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”آپ کو میری بات ماننا ہوگی۔“ وہ اٹل

تک دونوں کی بات چیت بند رہی تھی۔

”معصوب تنگ نہیں کرو، کھانا کھا لو۔“ فروا اس کے پیچھے پھر پھر کر تھک گئی تھی، مگر وہ مان کر نہ دے رہا تھا۔

”نہیں کھاؤں گا۔“ وہ نفی میں سر ہلاتا کبھی ادھر بھاگ جاتا کبھی ادھر۔

”کیا مصیبت ہے، مجھ سے مار کھا لو گے تم۔“ اس نے معصوب کا ہاتھ پکڑ کر غصے سے کہتے ہوئے اسے اپنی طرف کھینچ کر بھجوا دیا۔

”فروا!“ موسیٰ کی گرجدار آواز نے اس کا دل دہلا دیا۔

”تم ابھی سے میرے بیٹے کے ساتھ یہ سلوک کر رہی ہو، میری ایک بات کان کھول کر سن لو۔“ اس نے آگے بڑھ کر معصوب کو اس کی گرفت میں سے کھینچا تھا اور انگلی اٹھا کر اسے وارن کرنے کے انداز میں بولا۔

”ہاتھ توڑ دوں گا تمہارے، اگر میرے بیٹے کے ساتھ دوبارہ ایسا کیا تو۔“

”موسیٰ!“ غصے غلی کی زوردار آواز پر وہ دونوں ہی چونکے تھے۔

”لاوارث نہیں ہے میری بیٹی کہ آپ اس طرح اس سے بات کرو۔“ وہ ان کے قریب آن کرے اور موسیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

”دیکھیں انکل میں نے.....“ موسیٰ علی نے بولنا چاہا۔

”مجھے آپ کی ہمدردیوں کی ضرورت نہیں ہے، جس شخص کی وجہ سے میری ماں نے اتنے دکھ اٹھائے، تنہا زندگی گزاری، جس کے ہوتے ہوئے میں بھی یتیموں کی طرح پئی، ایک لمحے کے لئے مجھے اس کا سایہ نہیں چاہیے، یہ شخص مجھے ڈانٹے، مارے، گالیاں دے یا گھر سے نکال دے، مجھے کچھ بھی بھگنا ہے، میں نہیں ہلاؤں۔“ اتنا



## شگفتہ شگفتہ رواں دواں



### ابن انشا کے شعری مجموعے



آج ہی اپنے قریبی بکسال یا براہ راست ہم سے طلب فرمائیں

## لاہور اکیڈمی

جہلی منزل محمد علی امین میڈین مارکیٹ 207 سرکھروڈا اردو بازار لاہور  
فون: 042-37310797, 042-37321690

وہ پانی لے آیا۔

”یہ پیو۔“ اس نے گلاس عروبہ کو تھمایا۔  
”میں اسے نہیں جانتی فارقلیط۔“ وہ گلاس کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

”پانی پیو۔“ فارقلیط حسن نے گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا، پانی پیتے ہوئے وہ مسلسل اسے دیکھ رہی تھی، فارقلیط حسن نے خالی گلاس میز پر رکھا۔

”کیا تمہیں ابھی بھی مجھ پر اعتبار نہیں ہے، میری کس بات سے تمہیں ایسا لگا کہ میں تم پر شک کروں گا، یا تمہیں سپورٹ نہیں کروں گا؟“ وہ خفگی سے بھرپور لہجے میں بولا۔

”میں اتنا کمزور نہیں ہوں کہ ایک شخص بھرے مجمع میں میری بیوی کو ڈراتا پھرے اور میں کچھ کر نہ سکوں، کیوں چھپائی تم نے مجھ سے یہ بات؟“ وہ خفا تھا۔

”میں ڈر گئی تھی فارقلیط۔“  
”اے پیو یہ بلا وجہ کے ڈر ختم کرو، ورنہ کھا جائیں گے یہ تمہیں۔“

”میں اب یونیورسٹی نہیں جاؤں گی۔“ اس نے حتمی انداز میں کہا۔

”اس دن بھی تم ٹیکسی سے گھر آ گئیں، مجھے کال کر کے بلا لیتی، ایک تو میں اس لڑکے کا دماغ درست کرتا۔“ اس نے باد آنے پر کہا۔

”تم یونیورسٹی جاؤ گی، وہ لڑکا اب تمہیں نظر نہیں آئے گا وہاں۔“ فارقلیط حسن نے اسے ریلیکس کرنا چاہا، وہ منموں نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی، اس کی محبت، احساس، نرمی اور کیرکھی بھی عروبہ کو ڈراتی تھی، وہ کچھ نہ بول پائی بس اپنا سر اس کے شانے سے نکا دیا۔

یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ اس کو ان سب باتوں کا کیسے پتا چلا۔

نظر اس پر ڈال کر دوبارہ کام میں مصروف ہو گیا۔  
”مجھے صبح آپ سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔“ اسے فارقلیط حسن کی خاموشی اور سنجیدگی بہت محسوس ہو رہی تھی۔

”اس اوکے۔“ وہ ابھی بھی اس کی جانب متوجہ نہ تھا، پھر عروبہ نے بھی کوئی بات نہ کی تھی، تمام رات وہ جاگتی رہی تھی، فارقلیط حسن سو گیا تھا، وہ بیڈروم سے باہر نکل آئی اس کا رخ لان کی طرف تھا، باہر قدم رکھتے ہی تیز ہوا کے جھونکے نے اس کا استقبال کیا تھا، وہ لان میں ٹہلنے لگی تھی، یکا یک بارش ہونے لگی تھی۔

”میں کیا کروں، فارقلیط کو بتاؤں یا نہیں۔“ وہ بیچ پر بیٹھ گئی تھی، اسے وہاں بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی، کہ فارقلیط حسن وہاں آ گیا۔

”عروبہ!“ اس نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا تو وہ ڈر گئی۔

”اس وقت یہاں کیوں بیٹھی ہو۔“ وہ کھڑی ہو گئی تھی، اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرا رہے تھے۔

”ریحان کی باتوں سے پریشان ہو یا اس تھپڑ سے جو تم نے اسے مارا تھا؟“ فارقلیط حسن کی بات نے اس کے جسم سے جان نکل دی تھی۔

”بتاؤ۔“ فارقلیط حسن نے اس کا گال تھپتھپایا تھا، بجلی زور سے چمکی اور لمحہ بھر کے لئے لان روشنی سے بھر گیا۔

”میں اسے نہیں جانتی، مجھے نہیں پتا وہ مجھے کیوں پریشان کر رہا ہے، میرا یقین کریں فارقلیط!“ اس کا دم ٹٹکنے لگا تھا، ہونٹ خشک ہو رہے تھے، فارقلیط حسن نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اندر کی جانب بڑھا، وہ کسی بے جان لاش کی مانند اس کے ساتھ کھینچی چلی جا رہی تھی، اسے بیٹھا کر

کہہ کر وہ وہاں کی نہیں، تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکل گئی اور انیسکی کی جانب بڑھ گئی۔

دروازہ کھولتے ہی دل بری طرح بھرانے لگا تھا، یادوں نے چاروں اطراف سے اس پر ایسی یلغار کی تھی اس کے لئے بچ نکلنا بہت مشکل تھا۔

”امی! میں بہت اکیلی ہو گئی ہوں۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

☆☆☆

عروبہ بے حد خوفزدہ ہو گئی تھی، اسے ٹیر پچر ہو گیا تھا اور اگلے دو روز وہ یونیورسٹی بھی نہ جا سکی، اسے ایک مسلسل چپ لگی ہوئی تھی، فارقلیط حسن اور حسن بہنرا نے اسے بہلانے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی مگر بے سود۔

”عروبہ یونیورسٹی نہیں جانا؟“ فارقلیط حسن آفس جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا، عروبہ صوفے کے اوپر پاؤں کیے، سمٹ کر بیٹھی ہوئی تھی، وہ اچانک مڑا اور پوچھنے لگا۔

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”کیا اب تم اپنی پریشانی مجھ سے چھپاؤ گی؟“ وہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

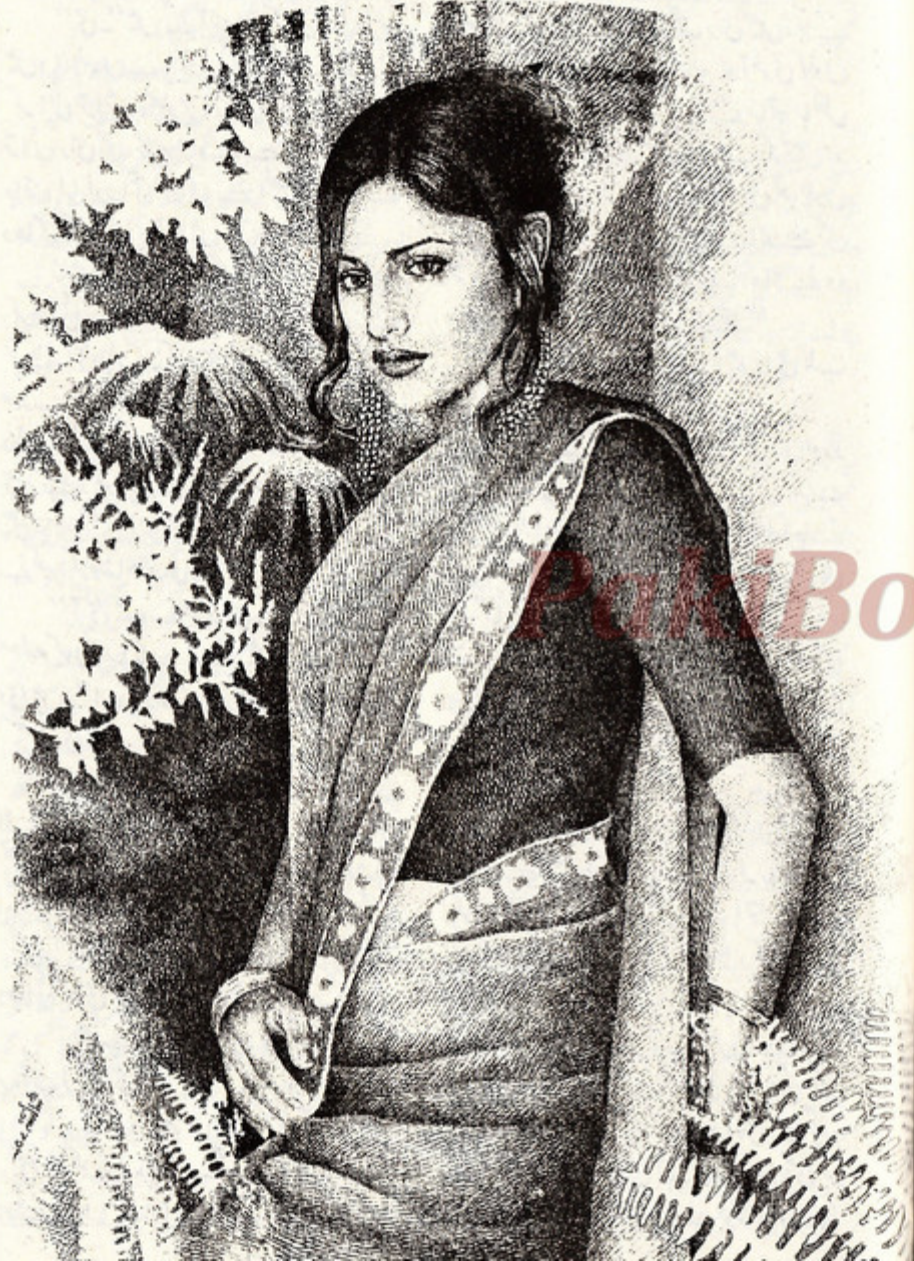
”فارقلیط حسن میں پریشان نہیں ہوں، پلیز مجھے ڈسٹرب مت کریں۔“ اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

”اوکے۔“ وہ اٹھا اور باہر نکل گیا، سارا دن عروبہ پریشان اور بے چین رہی، رات فارقلیط حسن دیر سے گھر آیا تھا۔

”آپ ناراض ہیں مجھ سے؟“ عروبہ نے اس کی غیر معمولی خاموشی کو بھانپتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔“ فارقلیط حسن نے سرفی میں ہلایا، وہ گود میں اسے لپیٹ رکھے کام کر رہا تھا، سرسری





”میں خود..... نہیں..... آئی..... وہ.....“

مجھے..... اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔  
”کیا وہ آپ کو اٹھا کر لائے ہیں، ماما بھی  
بھی آپ کو احساس نہیں ہو گا کہ آپ کتنی غلط  
ہیں۔“ وہ تیزی سے واپس مڑی تھی، اس بات کی  
پردہ کیے بغیر کہ ان کے دل پر کیا بیت رہی ہے،  
وہ پتھر کا بت بنی کھڑی تھی، جب اس کا داماد لباس  
تبدیل کر کے آیا تھا۔

”آپ کھڑی کیوں ہیں، بیٹھیں نا۔“ اس  
کی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی، اس لمحے  
ایسے اس عورت پر بہت ترس آیا تھا، وہ کتنی تنہا  
تھی۔

☆☆☆

نوبیلہ بہت دنوں سے ڈاکٹر ہارون کمال  
سے نہیں ملی تھی، انہوں نے کئی بار کہا، مگر اب وہ  
ان کی کال بھی رسیو نہ کرتی تھی، نہ ہی میٹج کا  
جواب دیتی، تو ار کا دن تھا وہ اپنے بیدروم میں  
بڑھ رہی تھی جب ملازمہ اس کے لئے پیغام لے  
کر آئی۔

”نوبیلہ لی بی آپ سے ملنے کوئی آیا ہے۔“  
وہ بتا کر پلٹ گئی تھی۔

”مجھ سے ملنے کون آ گیا؟“ زیر لب  
پوچھتی، دوپٹہ درست کرتی وہ لاؤنج میں آ گئی  
تھی، سامنے پایا کے ساتھ بیٹھے ڈاکٹر ہارون کمال  
کو دیکھ کر وہ چکرا کر رہ گئی، وہ کس بے تکلفی سے  
ان سے باتیں کر رہا تھا۔

”السلام علیکم!“ اس نے سلام کیا، ڈاکٹر  
ہارون کمال اٹھ کر کھڑے ہو گئے، عین اسی لمحے  
صوفیہ لاؤنج میں داخل ہوئیں، ان کے پیچھے  
ملازمہ ٹرائی دھلیکتی ہوئی آ رہی تھی، نوبیلہ نے پایا  
کی جانب دیکھا، وہ اسی کو دیکھ رہے تھے۔

(جاری ہے)

☆☆☆

”آپ انھیں ادھر سے۔“ اس نے اس  
عورت کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھایا اور اب کی بار وہ  
خاموشی سے اٹھ گئی اور اس کے ساتھ چلتی ہوئی  
گاڑی تک آئی تھی، اس شخص نے فرنٹ ڈور کھول  
کر اسے اندر بٹھایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال  
لی۔

گاڑی میں بیٹھ کر آتا تھا، وہ پوری طرح بیگی  
ہوئی تھی، رفتہ رفتہ بہت سے درد جاگنے لگے تھے،  
انگی پر لگے زخم میں سے نیسیں اٹھنے لگی تھیں۔

سب سے زیادہ درد دل میں اٹھ رہا تھا، اس  
نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں موند  
لیں، ساتھ بیٹھے شخص نے بغور اسے دیکھا تھا۔

گاڑی گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی  
اور پورچ میں جا کھڑی ہوئی۔  
”آجائیں باہر۔“ اس شخص نے دروازہ  
کھول کر اسے پکارا، وہ چند ثانیے ناچمی کے عالم  
میں وہیں بیٹھی رہی اور جب سمجھ آیا کہ وہ کہاں  
ہے تو باہر آ گئی۔

”آئیں۔“ وہ اسے ساتھ لے کر اندر کی  
جانب بڑھا، اس کے دل کی حالت بھی بہت  
عجیب تھی، وہ دونوں لاؤنج میں داخل ہوئے،  
سامنے ہی وہ منتظر کھڑی تھی۔

”کہاں تھے آپ احمد؟ میں اتنی پریشان  
تھی، کال بھی پک نہیں کر رہے تھے۔“ وہ تیزی  
سے اس کے قریب آئی تھی اور بھی اس کی نظر  
عقب میں کھڑی اپنی ماں پر گئی اور لمحہ لگا تھا اس کا  
موڈ آف ہونے میں وہ وہاں سے جا چکا تھا۔

”منع کیا تھا میں نے آپ کو، پھر آپ کیوں  
آئیں۔“ شوہر کے وہاں سے جاتے ہی وہ ماں  
سے مخاطب ہوئی تھی، اس کی حالت اور کیفیت کو  
نظر انداز کرتے ہوئے۔



میں تیزی سے ہاتھ چارہ تھی کہ آئی نے مجھے مخاطب کیا۔

”مجھے یہ چھوٹا آئینہ تو پکڑا۔“

”جی۔“ میں نے آئینہ اٹھا کر ان کے ہاتھ میں دیا، انہوں نے ہاتھ اوپر کر کے ایک آنکھ کھول کر اپنی تراشیدہ بھنویں جنہیں ابھی میں مزید تراش رہی تھی، کا ہر زاویے سے سرگھما گھما کر جائزہ لیا اور اتنی تیزی سے انھیں کہ میرے دھاگہ پکڑے ہاتھ فضا میں معلق ہی رہ گئے تھے۔ ”میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ صرف neat کرنا آئی بروز کو، کوئی شیب مت دینا اور تم نے، تم نے اتنی باریک کر دیں یہ..... یہ..... یہ۔“ صدے سے ان کی آواز ہی بیٹھ گئی، وہ اب اپنی دونوں آنکھیں کھول کر بلکہ ضرورت سے زیادہ جیسے جیسے دیکھ رہی تھیں غم سے مزید نڈھال ہوتی چلی جا رہی تھیں، ان کا چہرہ تاریک پڑ گیا تھا، میں نے گھبرا کر وضاحت کی۔

”آئی میں نے نیٹ ہی کی ہیں، آپ کو نہ معلوم کیوں ایسا لگ رہا ہے کہ میں نے باریک کر دی ہیں۔“ ان کا دکھ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا، وہ مسلسل نفی میں سر ہلا رہی تھیں۔

”صرف پتلی ہی نہیں چھوٹی بھی کر دی ہیں ان فیلپیکس والوں نے اتنی خوبصورت لک دی تھی اس بار کہ شیب نے بھی تعریف کی ورنہ وہ اور میری تعریف کر دیں، وہ تو منہ سے نہ پھوٹیں کبھی۔“ انہوں نے ساتھ ہی اپنے شوہر کی بھی دھلائی کر دی تھی، میں گھبرا کر آگے ہوئی۔

”یہ شیب بھی بہت اچھی لگے گی آئی آپ پر، آپ دیکھئے گا تو۔“

”جب خود مجھے ہی اچھی نہیں لگ رہی تو کسی اور کو خاک اچھی لگے گی۔“ بھنا کر کہتے ہوئے انہوں نے سامنے لگے قد آدم آسنے میں

خود کو دیکھا اور بار بار دیکھا، بالآخر مایوسی سے سر ہلایا۔

”نہیں بالکل نہیں، جی بات تو یہ ہے کہ وہ مجھے خود بھی بہت عجیب سی لگ رہی تھیں، بڑے سے منہ پر اتنی باریک بھنویں، جو آخری کونوں سے تقریباً غائب ہو چکی تھیں، کے ساتھ بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی تھیں لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا ماسوائے اس کے کہ میں جھوٹی تعریفوں کے پل باندھ دوں اور وہ میں نے باندھنے بھی شروع کر دیئے تھے پر ان کی ایک دھاڑ نے وہ سارے پل ایک ساتھ گرا دیئے تھے۔“

”اب یہ منہ لے کر جاؤں میں اپنی کلب میں۔“

”ظاہر ہے آئی اب اتنی ایمر جنسی میں اور تو کوئی منہ نہیں لگ سکتا۔“ بوکھلاہٹ میں میرے منہ سے الٹا سیدھا نکل گیا، انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورا تھا اور میرا تو دل ہی بیٹھ گیا، ایک تو وہ ویسے ہی نہ ہونے کے برابر بھنوں میں، آنکھوں کے اوپر کی سرخ اور سو جھی ہوئی جلد میں اتنی عجیب لگ رہی تھیں کہ اس طرح سے مجھے دیکھنے پر ایسی ڈراؤنی لگیں کہ بس، میں سہم کر پیچھے ہوتی تھی۔

”بلاؤ عالیہ کو، میں اس سے پوچھوں تو سہی، کہاں سے تمہیں ٹریننگ دلوائی ہے کہ یہ حشر میرا کر دیا۔“ ان کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا، اور میں می کی عدالت میں معاملے کو جاتا دیکھ کر بوکھلا گئی۔

”ارے آئی پلیز آپ ٹینس مت ہوں، شیب تو آئی بروز پٹل سے بھی بن جائے گی بلکہ آپ کی نیچرل شیب سے بھی بہت اچھی بنے گی، آپ بیٹھیں تو سہی، میں آپ کا مینی پیڈ بھی کر دوں گی اور میک اپ اور بھی۔“ منت خوشامد اور لالچ

کے سہارے میں نے انہیں واپس بٹھایا اور مزید ایک گھنٹہ ان پر لگا کر انہیں اس وقت تک کے لئے مطمئن کر کے بھیجا اور خود ہیں کرسی پر گر سی گئی تھی۔

☆☆☆

”خرد، یار لگتا ہے پھر سے میرے برے دن آ گئے ہیں۔“ میں ابھی لاؤنج میں آ کر بیٹھی ہی تھی کہ حریم چلی آئی، کافی کمر کی کرتی، آف وائٹ ٹراؤزر اور دونوں رنگوں کا چیک کا دوپٹہ اوڑھے، تھکی تھکی سی وہ صوفے پر بیٹھ گئی، میں چونک کر سیدھی ہو گئی۔

”خیریت کیا ہوا؟“

”یہ ریسٹورنٹ بھی مجھے چھوڑنا پڑے گا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ریسٹورنٹ والی جاب بھی مجھے چھوڑنی پڑے گی۔“ اس نے کہیاں گھٹنوں پر ٹکا نہیں اور تھیلیوں پر پیشانی ٹکا دی۔

”پاگل تو نہیں ہو گئیں کچھ، اب تو جا کر کہیں سکون سے ٹکی ہو تو ٹکی رہو، اب کیا مصیبت ہو گئی؟“ وہ کتنی ہی دیر اسی پوزیشن میں بیٹھی رہی۔

”اب پھونو بھی کیا ہوا ہے؟“ میں چڑ گئی، وہ گہری سانس لیتی سیدھی ہو بیٹھی۔

”ہمیشہ والا مسئلہ، کتنے دن ہوئے ایک لڑکا روزانہ ریسٹورنٹ آ رہا ہے، بلاناغہ، کبھی پیزا آرڈر کرتا ہے، کبھی برگر اور کبھی پاستہ، وہاں بیٹھ کر بہت کم کوئی چیز کھاتا ہے، کبھی کافی پی لی، کبھی چائے، ہائی جو بھی آرڈر کرتا وہ بیک کروا کر لے جاتا، روز اس کا آنا اور کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر مجھے دیکھنا اور بہانے بہانے سے مخاطب کرنا، ریسٹورنٹ کے عملے کو متوجہ کرنے لگا، اب یوں ہوتا کہ وہ جیسے ہی آتا سب اپنا اپنا کام چھوڑ کر اس کی حرکات، اس کا دیکھنا، مجھ سے مخاطب ہونا سب نوٹ کرنے لگے، مجھے سخت ٹینشن محسوس

ہونے لگی، بالآخر اس دن میں نے اس سے کہہ ہی دیا کہ سب دبی دبی زبان میں باتیں بنا رہے ہیں، آپ کیوں میرے لئے پرائیم کرسی ایٹ کر رہے ہیں تو.....“ وہ چپ ہو گئی۔

”تو؟“ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”کوئی بدتمیزی کی اس نے تم سے؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”اس نے کہا کہ وہ خود یہ سب روز روز انورڈ نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ ایک غریب گھرانے کا واحد کفیل ہے اور ایک شاپنگ مارٹ میں صرف دس ہزار روپے کی نوکری کرتا ہے مگر وہاں اس مہنگے ریسٹورنٹ میں وہ محض میرے لئے۔“ وہ پھر خاموش ہو گئی۔

”اوہ۔“ میں نے لمبی سانس لی تھی، ایک بار پھر اس کا حسن اس کے لئے، اس کی نوکری کے لئے مسئلہ بنے جا رہا تھا اور یہ کوئی پہلی بار نہیں تھا، اس سے پہلے وہ کئی نوکریاں محض اپنی عزت بچانے کے لئے چھوڑنے پر مجبور ہوئی تھی۔

وہ چار بہنیں تھیں اور بیمار ماں، والد اس کے انتقال کر چکے تھے، تینوں بہنیں اس سے چھوٹی تھیں، حریم نے گریجویشن کے بعد ہی جاب کے لئے دھکے کھانے شروع کر دیئے تھے، ساتھ ساتھ وہ پاسٹرز بھی کرتی رہی، جاب تو اسے نوراً مل جاتی تھی مگر وہ جس وجہ سے ملتی تھی وہ جلد ہی حریم کو ساسی و درکرز اور پاس کی بدلتی نظروں سے سمجھ آ گئی تھی، ریسٹورنٹ والی جاب سے پہلے وہ پانچ نوکریاں چھوڑ چکی تھی، گھر گھر جا کر ٹیوشنز تک اس نے پڑھا لیں تھیں، وہاں بھی کسی کا بھائی کسی کا ماموں تو کسی کا چچا اس کے لئے مسئلے بننے رہے اور وہ ایک کے بعد ایک نوکری چھوڑتی، اب یہ جاب اسے ڈیڈی نے دلوائی تھی، اس ریسٹورنٹ کے مالک ڈیڈی کے بہت اچھے



گے کہ دس ہزار وہ یونہی لٹا دیتا ہے تو انہیں کیا دے گا۔“ یہ مشورہ اس کے دل کو کچھ تو لگا تھا، وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔

”حلیہ بتاؤ اس کا کیسا ہے؟“ میں نے چٹکی بجا لی،

”امم م۔“ وہ سوچ سوچ کر بتانے لگی۔

”لمبا ہے، گورا چٹا سا، ہلکی سی بڑھی ہوئی شیو اور آنکھیں بڑی اور لائٹ براؤن اور بال بھی براؤن۔“ وہ جیسے جیسے حلیہ بتا رہی تھی، میری آنکھیں بھی ویسے ویسے پھٹتی جا رہی تھیں۔

”یہ ایک غریب لڑکے کا حلیہ ہے؟“

”کیوں غریب خوبصورت نہیں ہو سکتے؟“

اس نے ناراضی سے مجھے دیکھا۔

”ہاں بالکل ہو سکتے ہیں، جیسے تم مگر یہ تو..... اچھا یہ بتاؤ، دبلا پتلا سا ہے؟“ میں نے

بات تبدیل کی۔

”نہیں بالکل نہیں، بلکہ وہ تو کسی ایکسٹریسٹ

کلب کا ممبر لگتا ہے، اتنی اسٹریٹنگ باڈی ہے اس

کی۔“

مجھے بیٹھے بیٹھے چکر آنے لگے تھے، یہ دس

ہزار ماہوار کمانے والے لڑکے کا حلیہ تھا کم از کم

میں نے ایسا کوئی غریب لڑکا نہیں دیکھا جو اس

جسامت کا حامل ہو۔

”بائی دادے، تم کیوں اسے اتنے غور سے

دیکھتی ہو۔“ وہ تو بھڑک اٹھی۔

”شیم آن یوخر، روزہ منوس آکر گھنٹہ گھنٹہ

کھڑا رہتا ہے، تو مجھے اس کا حلیہ بھی یاد نہیں ہو

گا۔“

”اوکے اوکے، مجھے میری پلاننگ پر غور

کرنے دو، پھر میں نائل سے ڈسکس کرٹی

ہوں۔“ میں نے اسے سلی دی۔

☆☆☆

جاننے والے تھے اور یہ پہلی جاب تھی، جسے کرتے ہوئے حریم کو آٹھ ماہ ہو چکے تھے اور میں خوش تھی کہ وہ اب کسی بھی پریشانی کے بغیر سٹیل ہو چکی ہے مگر نہیں، وہ پھر مصیبت میں پھنس گئی تھی، اصل

مصیبت اس کا حسن تھا، بے تحاشا حسن سرخ سفید رنگت کے ساتھ تنکھے نقوش، مشقت کا مارا

دبلا پتلا سراہا، جو پہن لیتی سج جاتا، کئی بار مجھے

افسوس ہوتا کہ میرا کوئی بڑا بھائی کیوں نہیں تھا کہ

میں اسے اپنی بھابھی بنا لیتی، مگر نائل ابھی اولیوڑ

میں تھا، دم وہ بنوں کا اکلوتا بھائی آپ شادی کے

بعد اسلام آباد میں ہوئی تھیں، اب ہم دونوں ہی

ہوتے تھے اپنے ماں باپ کی آنکھ کے تارے۔

”آہ۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

”تو پھر کیا سوچا تم نے؟“ میں نے چائے

کا کپ اس کی طرف بڑھایا۔

”یہی تو سمجھ نہیں آ رہی کہ میں اس لڑکے کا

کیا کروں یا تو اسے بے عزت کروں یا پھر یہ

جاب بھی چھوڑ دوں۔“

”نہیں پلیز یہ جاب نہیں چھوڑنا، اس لڑکے

کا کچھ کرتے ہیں۔“

”مثلاً کیا کرتے ہیں؟“ اس نے مشکوک

نظروں سے مجھے دیکھا، یہ اس کی عجیب عادت

تھی، اپنا ہر مسئلہ مجھ سے ہی ڈسکس کرتی تھی اور

میری صلاحیتوں کی طرف سے تحفظات کا بھی

شکار رہتی تھی، غصہ تو مجھے بہت آتا مگر اس کی

پریشانیاں دیکھتے ہوئے اسے رعایت دیتی تھی۔

”کرتے یہ ہیں کہ اس کا پیچھا کرتے ہیں،

میں اور نائل اس کا تعاقب کرتے ہوئے اس کا

گھر وغیرہ دیکھ لیتے ہیں پھر اس کے پیرنس کو

شکایت لگا میں گے، یہ نڈل کلاس لوگ اپنی عزت

وغیرہ کے لئے بہت کاتشس ہوتے ہیں، وہ فوراً

اسے لگام ڈالیں گے بلکہ وہ تو خونخوار ہو جائیں

☆ ☆ ☆

☆☆☆

”خالہ آپ کی پیشانی خاصی کشادہ ہے، بے شک ہی ایک اچھی پیشانی کہلاتی ہے مگر look اچھا نہیں آتا، میں چاہتی ہوں، میں آپ کا اچھا سا میرا شائل بنا دوں، جس سے یہ کچھ ڈھک جائے۔“

”مگر میری بیوٹیشن نے تو ایسا کچھ نہیں

کہا۔“ انہوں نے بے نیازی سے سر جھٹکا۔

”وہ کیوں کہیں گی، آپ ان کی ریگولر کسٹر

ہیں تو وہ آپ کو ایسی ویسی بات کہہ کر ناراض

تھوڑی تا کر میں گی۔“ میری نقطہ پر وہ کچھ متفق نظر

آئیں۔

”بات تو تمہاری ٹھیک ہے ویسے۔“

”تو آئیں، میں آپ کی کنگنگ کر دوں۔“

انہیں اپنے پارلر کی چیئر پر بٹھا کر لیڈر ایپرن ان

کے گلے میں باندھ کر میں نے تیزی سے کنگنگ

شروع کر دی، خالہ اس دوران واٹس ایپ پر کسی

سے چیٹنگ کرتی رہیں۔

”اب دیکھیں خالہ کیا شاندار لک آیا ہے

آپ کا۔“ میں نے سامنے لگے بڑے سارے

آئینے کی طرف اشارہ کیا، انہوں نے پہلے بیٹھے

بیٹھے خود کو دیکھا پھر شاید خود ہی اپنے حسن کی تاب

نہ لائیں اور تڑپ کر کھڑی ہو گئیں۔

”یہ..... آ..... آ۔“ ان کی چیخ اتنی

دلاؤ تھی کہ میں بھی دہل گئی اور می (میری بد قسمتی

کا عروج کہ) وہ میرے پارلر کے قریب سے گزر

رہی تھیں، بہن کی چیخ پر تڑپ کر اندر آئیں تھیں۔

”کیا ہوا عارفہ کیوں چیخیں تم اس طرح؟“

ان کی آواز پر خالہ ان کی طرف مڑیں اور می جو

ابھی کچھ اور بھی کہہ رہی تھیں، دم بہ خود ہو کر انہیں

دیکھتی رہ گئیں۔

”کچھ حال.....“

”ہیلو اپوری ون۔“ ہادی کی آواز پر میں ن مڑ کر دیکھا، براؤن ٹکڈو میں اپنی شاندار پرسنائی کے ساتھ وہ لیپ ٹاپ بیک اور موبائل تھامے لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔

”کیسے ہو ہادی اور کیسا چل رہا ہے آفس؟“

”فرسٹ کلاس۔“ وہ اپنے کمرے میں چلا

گیا، وہ ایسا ہی تھا لئے دیئے رہنے والا، اکلوتا

ہونے کا سارا غور اپنے اندر سمیٹے۔

خالہ کے دو ہی بچے تھے، ہادی اور ہارہ آج

ہادی نے اصرار کر کے مجھے بلایا تھا، می اور خالہ کسی

پارٹی میں گئیں تھیں اور ہم دونوں ٹی وی دیکھتے

ہوئے گوپ میں مشغول تھیں، اتنے میں ہادی

تیزی سے نیچے آیا تھا، اتنا کچھل ڈرینگ کر کے

کہ میں حیران رہ گئی، وہ ہمیشہ بہت زبردست

ڈریس اپ ہوا کرتا تھا اور اب ایک بلو شارٹس

میں میراؤن سینڈ وشرٹ، جس کا ہڈ پیچھے گرا ہوا تھا،

(یہ اور بات کہ وہ اس حلقے میں بھی بہت اچھا لگ

رہا تھا) اتنا اجنبی سا دکھ رہا تھا کہ میں تو حیرت

سے منہ کھولے اسے دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔

”چائے تو پی لو۔“ اسے باہر جاتا دیکھ کر

ہادی چلائی، اس نے مڑ کر فنی میں سر ہلایا اور ہاتھ

سے بائے بائے کرتا باہر چلا گیا تھا۔

”آج کچھ لیٹ ہو گئے ورنہ تو چھ بجنے سے

پہلے بھائی صاحب کو گھر سے نکل جانا ہوتا ہے۔“

ہادیہ طنزیہ بڑبڑائی، میں نے حیرت سے اسے

دیکھا۔

”کہاں جانا ہوتا ہے؟“

”کوئی کلب جوائن کیا ہے، وہاں اسنوکر

کے لئے یہ سب فرینڈز جمع ہوتے ہیں۔“

”اچھا۔“ پھر ہم دونوں اپنی باتوں میں لگ

گئے تھے۔



”یہ کیا کیا ہے تم نے عارف، بندہ اپنی عمر کا بھی کچھ لحاظ کرتا ہے، یہ بے نی کنگ کسی طرح بھی تم پر سوت کر رہی ہے، بالکل نمونہ لگ رہی ہو تم۔“ مئی تو خالہ پر برس پڑیں تھیں۔

”میری بھی سن لو، یہ تمہاری بیٹی کا کارنامہ ہے۔“

”اس نے کیا سوتے میں تمہارے بال کاٹے ہیں تم اس کے آگے آکر بیٹھی ہو تو نا، اتنے بڑے بیوی سیلون میں جاتے جاتے تمہیں کیا سوچھی کہ اس عقل کی دشمن کے سامنے آ بیٹھیں۔“

مئی کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا اور خالہ کا صدمہ، وہ بے حال ہو کر کاؤچ پر لیٹ گئیں۔

”نی الحال سامنے کے بالوں کو نوڈ کر کے پین لگا دو اور پیچھے اسٹینشن (Extention) لگا دو۔“ مئی کی ہدایات پر مین ان کانپتے ہاتھوں سے عمل کیا تھا، اس دوران خالہ اور مئی نے میرے متعلق جو کچھ کہا وہ ناقابل بیان و ناقابل اشاعت تھا، مگر میں اہل صبر میں سے ہونے کی وجہ سے برداشت کرنے پر مجبور تھی، رات کو میں نے بلال کا فون آنے پر ذرا ڈھیلے لہجے میں بات کی تھی۔

”خیریت آج تو سارے بلب ہی فیوز لگ رہے ہیں۔“

میں نے بہت دکھ سے اپنی بے عزتی کا قصہ کہہ سنایا۔

”یہ دنیا ہے ہی نا قدری، فری میں سردمز دے رہی ہو تو کسی کو قدر نہیں، ویسے بھی ہیرے کی قدر جو ہری ہی جانتا ہے، میں تمہارا بیج قدر دان ہوں، تم دیکھنا شادی کے بعد کسی کی ہمت نہیں ہوگی کہ تمہارے ساتھ ایسا سلوک کر سکے۔“

وہ بہت سنجیدگی سے مجھے تسلی دے رہا تھا مگر مجھے تا نہیں کہوں، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بلی

روکنے کی کوشش کر رہا ہے، میں نے تشکیک سے کہا۔

”تم ہنس رہے ہو؟“ اس کا جواب خاصی تاخیر سے آیا تھا۔

”نہیں یار میں پانی پینے لگ گیا تھا، پھر وہ مجھے پھپھو اور وانیہ کی رمضان سے متعلق کی جارہی تیاریوں کے متعلق بتانے لگا، میں بھی اسے اپنے دیگر معمولات سے آگاہ کرنے لگی بلال میری پھپھو کا بیٹا اور میرا مگنیت تھا، ہر روز رات کو سونے سے پہلے اس کا معمول تھا کہ وہ فون ضرور کرتا تھا، سلام کے بعد اس کا معمول کا جملہ ہوتا تھا اور سناؤ، آج کیا قیامت ڈھائی ہے؟“

اور میں اسے اپنے سارے دن کی کارکردگی سے آگاہ کرتی تھی، جواباً وہ بھی دن بھر کی دوداد سنا تا۔

☆☆☆

”خالہ اور خالو رمضان میں عمرہ کرنے جا رہے تھے اس خوشی میں انہوں نے ایک پارٹی ارنج کی تھی، میں حریم کو بھی منار کے ساتھ لے آئی تھی، وہ سوائے ہمارے گھر کے کہیں نہیں جاتی تھی، میں نے اس کی امی کلثوم آنٹی سے خصوصی استدعا کی تھی تو انہوں نے اسے اور چھوٹی ماہم کو بھیج دیا تھا، حریم فیروز کی اور پنک کنٹراسٹ کے لباس میں اتنی خوبصورت لگ رہی تھی کہ ہر منظر پر حاوی ہو چکی تھی، میں نے اور پنک اور شاکنگ پنک کنٹراسٹ پہنا ہوا تھا اور یقیناً اچھی لگ رہی تھی، اپنا اور حریم کا میک اپ کر کے مئی کے ساتھ ہم سب خالہ کے ہاں آ گئے، لان بچہ نور بنا ہوا تھا، شام رات میں تبدیل ہو رہی تھی، رنگ برنگے ملبوسات کی بہار، باتوں کی جھنجھناہٹ اور بچوں کی چہکار ایک بہت خوبصورت ماحول تخلیق کر رہی تھیں، ہم بھی آگے بڑھ کر اسی ماحول کا حصہ بن گئے۔“

گئے، ہادیہ، حریم کو دیکھ کر بہت خوش تھی، اللہ حریم تو کسی طور ہمارے گھر تو آئیں۔“ وہ حریم کو اچھی طرح جانتی تھی اور یہ بھی کہ وہ کتنے سخت ماحول کی پروردہ ہے، سو اس کی آمد پر اس کی خوشی جتنی بھی تھی، کچھ ہی دیر میں وہ ہادی کے ساتھ آئی۔

”یہ میرا بھائی ہے ہادی اور ہادی یہ حریم، خرد کی دوست، آج اتنے عرصے کے بعد ہمارے گھر آئی ہیں۔“

ہادیہ خوشی خوشی تعارف کروا رہی تھی، اسے اپنے بھائی پر ناز تھا اور بچا تھا، اس وقت بلیک ڈنر سوٹ میں اپنی تمام تر وجاہت و خوبصورتی کے ساتھ وہ پوری محفل پر چھایا محسوس ہو رہا تھا، حریم کی طرف اس نے اپنی تہی ہوئی گردن موڑ کر سرسری سا دیکھا تھا مگر پھر اسی پوزیشن میں ساکت رہ گیا تھا، بڑی بڑی آنکھیں کچھ اور کھل گئی تھیں، ہونٹ دائرے کی شکل میں مسٹ گئے تھے، تجر اس کے چہرے کے نقوش سے نپکا پڑ رہا تھا۔

میں نے اس کے تاثرات کو نا سمجھی سے دیکھا، حریم کو دیکھ دیکھ کر بڑے بڑے ساکت و جامد رہ جاتے تھے مگر ان کے چہرے پر آنے والے تاثرات اس کی خوبصورتی کی حسین کے لئے ہوتے تھے، جبکہ ہادی کی آنکھوں سے حیرت اڑی پڑ رہی تھیں، میں نے حریم کو دیکھا، اس کی آنکھیں تو کیا منہ بھی کھلا ہوا تھا۔

”تم، تم؟“ اس نے انگلی سے ہادی کی طرف اشارہ کیا اور وہ مخاطب بھی اسی سے تھی، میں نے اتنی بے تکلفی پر تعجب سے باری باری حریم اور ہادی کو دیکھا تھا، ہادیہ بھی ہکا بکا کھڑی تھی۔

”تم ہادی کو جانتی ہو حریم؟“

”ہاں، مگر کب اور وہ میں۔“ وہ بولی تو لہجہ

پھنکارتا ہوا تھا۔

”یہ ایک غریب دس ہزار روپے کمانے والا لڑکا ہے جو صرف میری وجہ سے ریسٹورنٹ میں روزانہ آتا ہے۔“ ہادی سینے پر ہاتھ باندھے، سیدھا کھڑا بڑی دلچسپی سے حریم کے رنگ بدلتے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

”اور سب بھی یقیناً جھوٹ ہو گا تمہارے اس جھوٹ کی طرح۔“ حریم نے چبا چبا کر کہا، وہ ہادی کو دیکھ رہی تھی، وہ ہلکا سا مسکرایا اور دو قدم آگے بڑھ کر اس کے بالکل سامنے کھڑا ہو گیا۔

”اور کچھ بھی جھوٹ نہیں ہے، سب سچ ہے، میں وہاں آپ کے لئے ہی جاتا ہوں اور جاتا رہوں گا جب تک.....“ وہ رکا، اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”جب تک آپ مجھ سے منسوب نہیں ہو جاتیں۔“

”تم جیسے جھوٹے انسان کے ساتھ اور میں؟ میں منسوب ہوں گی، ایسا کبھی سوچنا بھی مت۔“ وہ تو شعلے کی طرح بجڑی۔

”یہ ایک بے ضرر سا جھوٹ تھا، جس سے آپ کو کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟“ وہ رسان سے بولا۔

”تو یہ وہ لڑکا جو تم کہہ رہی تھیں، جنہیں تنگ کر رہا ہے وہ یہ تھا ہادی؟“ میری آنکھیں پھٹ کر ڈھیلوں سے باہر آ جاتیں تو وہ بھی کم ہوتا، ہادی کسی لڑکی کے لئے غریب لڑکے کا روپ دھارے، جو کسی کو کوئی وقعت دینے کا قصور نہیں کر سکتا تھا، وہ اپنی ہی ذات کی کشش میں اتنا مگن رہتا تھا کہ خالہ اسے کتنی لڑکیاں دکھا چکی تھیں مگر وہ حامی نہیں بھرتا تھا اور دل آیا بھی تو کہاں؟

”ہاں یہ ہے وہ غریب لڑکا۔“ حریم ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی اور غصے سے پلیٹ



گئی، میں تیزی سے اس کے پیچھے لپکی تھی۔

”یار حرم مجھے کیا پتا تھا کہ وہ ہادی ہوگا، وہ تو ریسٹورنٹ ہی اس کا اپنا ہے، یہ تو جب چاہے، جیسے چاہے جاسکتا ہے، ویسے تو یہ اتنا روڈ ہے کہ مجھے تو بالکل یقین نہیں آ رہا کہ یہ تمہاری خاطر، میرا مطلب ہے یوں حلیہ بدل کر ایک ٹائم پر وہاں روز جانا۔“ اس کے تئیر کڑے ہوتے دیکھ کر میں نے بات بدلنے کی کوشش کی، میں تو عام حالات میں ہاتھ پاؤں چھوڑ دینے والی لڑکی تھی تو یہاں تو غیر متوقع صورتحال نے میرے دماغ کے ساتھ بیٹے باندھ دیئے تھے، کھوپڑی کی دیواریں ارد گرد حصار باندھے نہ کھڑی ہوئیں تو وہ سر میں سے نکل کر جانے کہاں کہاں چلا جاتا، ہادی اور حرم، حرم اور ہادی، یا اللہ میں نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا تھا، غالباً حرم کو مجھ پر ترس آ گیا تھا۔

”اس اوکے تم پریشان نہیں ہو۔“ اس نے میرا سر پر رکھا ہاتھ تھپکا، اتنے میں ہادی اندر آئی۔

”حرم دیکھو جو کچھ بھی ہے وہ تمہارے اور ہادی کے بیچ میں ہے، سو پلیز اپنا موڈ ٹھیک کر لو اور باہر آ جاؤ، کھانا لگ چکا ہے، پلیز کم۔“

”اوکے چلو خرد۔“ کھانے کے بعد میں نے خالہ سے حرم کو ملوایا، انہوں نے اس کی آمد پر بہت زیادہ خوشی کا اظہار کیا اور شکریہ بھی ادا کیا کہ وہ آئی، پھر ہم لوگ آگے حرم اور ماہم کو ان کے گھر چھوڑا اور خود گھر آ گئے، فری ہو کر بلال کو کال کی، اسے آج کی مصروفیت کا معلوم تھا سو وہ انتظار کر رہا تھا کہ کب میں فری ہوں اور اس سے بات کروں، میں نے سلام کے فوراً بعد یہ حیران کن واقعہ اس کے گوش گزار کیا، وہ حیران ہونے کے بجائے ہنس ہنس کر دہرا ہوا رہا تھا، واٹس ایپ روڈ نوکال تھی سو میں اسے ہنستا ہوا دیکھ رہی تھی

اور اچنبھے سے گھور رہی تھی، اتنی ہنسی کی کیا بات تھی آخر؟

”تو فائنلی تمہارے کزن کا روزہ ٹوٹ گیا اور اسے پسند بھی آئی تو تمہاری غریب سی فرینڈ۔“ وہ ابھی بھی ہنس رہا تھا۔

”وہ صرف دولت کے معاملے میں غریب ہے ورنہ حسن کی دولت سے مالا مال ہے۔“ میں نے ہاتھ نچا کر بتایا۔

”تم سے زیادہ حسین؟“ اس کی آنکھوں سے شرارت فٹک رہی تھی، میں سنجیدہ ہو گئی، بہت زیادہ

”گولڈن ورڈز، ایک لڑکی دوسری لڑکی کی تعریف کرے، واہ انقلاب، انقلابات ہیں زمانے کے۔“

”ہادی تو بہت سیریس لگتا ہے مگر حرم۔“ ”وہ بھی مان جائے گی اگر ہادی کی محبت جچی ہوئی تو۔“ اس نے مجھے تسلی دی پھر کافی دیر ہم یہی کچھ ڈسکس کرتے رہے تھے۔

☆☆☆

”آئیں ماریہ آپی، میں آپ کا فیشل کر دوں، آپ کی اسکن بہت رف ہو رہی ہے۔“ ”ہاں نا، اکیچو سکی الرجی بہت ہو رہی تھی تو ڈاکٹر نے مجھے کچھ عرصہ کے لئے بیچ وغیرہ کے لئے منع کر دیا ہے تو پھر اسکن تو خراب ہوئی ہی ہے ورنہ میں تو باقاعدگی سے پارلر جاتی تھی۔“ وہ بے چاری خود دم زدہ تھیں۔

”ارے آپی کچھ نہیں ہوتا آئیں میں سادہ سافٹل کرتی ہوں آپ کا، ایک دم فریئر لک آئے گی۔“ وہ کچھ ہچکچاہٹ کے بعد مان گئیں، میں نے ان کی صبح چچی کی پھر ہانہیں گیا تو بالکل لائٹ سافٹل کھول کر لگا ہی دیا۔

”یہ بھی ماسک ہے۔“ انہیں میں نے چکارا

اور کچھ ہی دیر میں وہ بے چین ہونے لگیں۔

”خرد، بیٹا مجھے جیسن ہی ہو رہی ہے، ہلکی ہلکی سی سونیاں چھ رہی ہیں۔“

”ارے کچھ نہیں آپی، ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔“

وہ خرد ہی کیا جو وقت سے پہلے عقل کو ہاتھ مار لے، کچھ ہی دیر میں وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھیں۔

”یہ یہ کیا لگایا ہے تم نے مجھے بہت جلن ہو رہی ہے اوہ مائے گاڑ، یہ کہیں بیچ تو نہیں۔“ وہ تیزی سے واش بیسن کی طرف بھاگیں، اچھی طرح منہ دھویا مگر ان کی بے چینی کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی، وہ برس میں کچھ ڈھونڈنے لگیں، شاید میڈی کونون کرنے لگیں ہیں، میں خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹی، اب وہ بار بار چہرے کو کھج رہی تھیں، اتنے میں می خود ہی آ گئیں۔

”ماریہ تم آئیں اور مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔“ وہ فوراً محبت سے ان سے ملنے کے لئے آگے آئیں اور ٹھٹک گئیں۔

”یہ تمہارے چہرے کو کیا ہوا ہے اور یہ تو بہت ریڈ ہو رہا ہے۔“

”ہاں عالیہ آپی، مجھے بیچ سے الرجی ہے اور خرد نے شاید بیچ لگا دیا میرے فیس پر۔“ انہوں نے کوئی ٹیوب نکالی اور جلدی جلدی اپنے چہرے پر لگانے لگیں، ان کا چہرہ بہت عجیب سا ہو رہا تھا، نمی نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا تھا، ماریہ آپی کی بے چینی مجھے شرمندگی میں مبتلا کر رہی تھی، جیسے تیسے ان کی حالت سنبھلی اور وہ گھر چلی گئیں مگر می نے مجھے نہیں بخشا۔

”تم آخر مان کیوں نہیں لیتیں کہ یہ تمہارے بس کا کام ہی نہیں ہے، اور کس کس کا حلیہ بگاڑو گی، اس دن فاخرہ نے بھری محفل میں بیٹھ کر اپنی آئی بروز کا وہ رونا رویا کہ مارے

شرمندگی کے سمجھ نہ آئے کہ کیا وضاحت دوں، عارفہ الگ اپنی رفیس میرے سامنے بکھیر لیتی ہے، جتانے کو کہ میری بیٹی صاحبہ نے اس کے ساتھ یہ ظلم کیا ہے، پہلے تو بیگال کی کھٹی لبی رفیس تھیں جو اب تم نے ہی جھاڑ دی ہیں، ساری بات ہی یہ ہے کہ تم موقع دیتی ہو تو مجھے یہ ساری شرمندگی برداشت کرنی پڑتی ہے، ایک ہی بار مجھے بتا دو تم نے مجھے اور کتنا ذلیل کروانا ہے، میں اپنا ماسک میک اپ کر لوں۔“

”پلیز می۔“ میں رو پڑی، وہ کچھ خاموش سی ہو گئیں۔

”تم ایسا کرو، کوئنگ کلاسز جوائن کر لو، کچھ ہی دنوں میں رمضان شروع ہو رہا ہے، اچھی اچھی ڈشز بنایا کرو تا کہ آگے بھی کام آئیں، بڑی عید کے بعد تمہاری پچھو کا پکا ارادہ ہے شادی کا، اچھا ہے تب تک تم کچھ کچھ جاؤ گی۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا تھا، واقعی یہ بیوشن بننا مجھے راس نہیں آیا تھا، ہر جگہ بے عزتی ہی ہوئی تھی سو اب بہتر تھا کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔

☆☆☆

حرم بہت دنوں کے بعد آئی تھی، مجھے بھی ٹائم نہیں ملا کہ میں اس کی طرف جاپانی، نہ فون پر کوئی خاص بات ہوئی تھی، اسے میں نے اپنی نئی مصروفیت کا بتایا اور اس نے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

”اب آئی ہو تو کھانا کھا کر ہی جانا، میں تمہارے لئے اسپیشل بریانی بناؤں گی آج میرے ہاتھ کی بریانی کھا کر جانا۔“

وہ میرے ساتھ ہی کچن میں آ گئی، میں نے اسے سلاڈ کاٹنے چڑ لگایا اور خود مصالحہ تیار کرنا شروع کر دیا۔

”تم جا رہی ہو ریسٹورنٹ؟“ میں نے



## شگفتہ شگفتہ رواں دواں



## اردو کی آخری کتاب

طنز و مزاح



آج ہی اپنے قریبی بک شال یا رام راستہ سے طلب فرمائیں

لاہور اکیڈمی

پبلی منزل محمد علی امین میڈیکل سٹریٹ 207 سرگرم روڈ اردو بازار لاہور  
فون: 042-37310797, 042-37321690

ریٹورنٹ۔“ وہ ہنستے ہوئے آرڈر نوٹ کروانے لگی، میں نے اس کی ہنسی کے داغی ہونے کی دعا دل سے مانگی تھی۔

☆☆☆

”آخر ماما نے کیا سوچ کر تمہارا نام خرد رکھا؟“ بلال کے سوال نے مجھے آگ ہی لگا دی تھی۔

”جیسے پھپھو نے تمہارا نام بلال رکھا حالانکہ تمہارا اذان دینے سے کیا واسطہ؟“ وہ کتنی ہی دیر ہنستا رہا۔

”اچھا بتاؤ، عید کے لئے کیا گفت بگواؤں؟“

”جو مرضی بھیج دو، اب کل سے روزے شروع ہیں اور ماما مجھے نئی چیزیں بنانے کو بولیں گی اور میں۔“ میں رو ہاکی ہو گئی۔

”چلو تم ایسا کرنا جب کبھی بنانا مجھ سے بات کرتی رہنا، میں تمہیں یاد کروا رہا ہوں گا۔“

”پتا نہیں بلال تم دیکھ لو، میں بہت کچھ غلط کر دیتی ہوں تم کوئی اچھی سی لڑکی۔“ اس کی دھاڑ نے میری بات ہی کاٹ دی تھی۔

”کوئی فضول بات نہیں، میرے لئے تم ساری دنیا سے بڑھ کر ہو اور سب سے اہم بات یہ کہ۔۔۔۔۔“ وہ رکا۔

”میں پوری جان سے متوجہ تھی۔“

”ایسی بے وقوف بیوی تو نفعت سے کم ہرگز نہیں۔“ اس کی شرارت سے کہنے پر میں چلا اٹھی۔

”بلال کے بچے۔“

”وہ تو اگلے سال۔“ اس نے شرارت سے آنکھ دبائی، میں نے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ کال ہی کاٹ دی تھی۔

☆☆☆

چاول ایلنے کے لئے چولہے پر رکھے تھے اور بریانی کا مصالحہ دم پر) اسے بیڈ پر بٹھا کر خود بھی ساتھ بیٹھ گئی۔

”اب تفصیل سے بتاؤ سب کچھ۔“ وہ مسکرا کر بتانے لگی کہ کیسے ہادی نے اسے اپنی بے پناہ محبت کا یقین دلایا اور اسے شادی کے لئے رضا مند کیا، پھر وہ اسے ہادی سے ملوانے کے لئے گھر لے گیا جہاں خالہ اور ہادی نے بہت محبت و چاہت سے اس کا استقبال کیا اور تحائف کے ساتھ رخصت کیا اور ساتھ ہی اس کی امی سے ملنے کا وعدہ بھی۔

”میں تم سے مشورہ کرنے آئی ہوں۔“

”نوراً پہلی فرصت میں انہیں گھر بلاؤ اور دیکھو خالہ ہادی نے مجھ سے ذکر تک نہیں کیا اور میں کیا چھوڑنے والی ہوں، دیکھو تو ان کا کیا حشر کرتی ہوں۔“ میں نے آستین چڑھائیں، وہ کھٹکھٹلائی۔

”پہلے کچن میں چلیں، بریانی کا حشر دیکھ لیں۔“ اس نے تو مذاق میں کہا تھا مگر میں تو سر پر باؤں رکھ کر بھاگی تھی، چاولوں کا پانی نشتارنے کے لئے جو چھلنا سک میں رکھا تھا، وہ رکھا ہی رہ گیا، کیونکہ پانی تو سارا چاول اپنے اندر جذب کر چکے تھے، مصالحے کی بوئیاں نیچے میں تیر رہی تھیں، میں صدمے سے پاگل ہو جاتی مگر ہنسی روکتی ہوئی حریم آگے بڑھی اور تھوڑے سے اور چاول الگ سے اہال کر چکن کا وہ ملغوبہ اس میں مکس کر کے بریانی کی شکل دی اور کھانے کے قابل بنایا۔

”چلو آج میں اپنے ریٹورنٹ کی بریانی تمہیں کھلاتی ہوں۔“ اس نے فون اٹھا کر کال ملائی، میں نے ابرو چڑھایا۔

”ہاں بالکل، اب تو جی جی تمہارا اپنا

اسے چھیڑا، اس کا رنگ بھی گلابی ہو گیا۔

”ہاں۔“ میں نے آنکھیں پھاڑیں۔

”اور ہادی بھی آتا ہے؟“

”ہاں۔“ وہ ساتھ ساتھ سلاکٹ رہی تھی، سو چہرہ جھکایا ہوا تھا، میں نے ہاتھ سے اس کا سر اوپر کیا۔

”ادھر دیکھنا میری طرف، یہ کیا چل رہا ہے اندر ہی اندر؟“ میں نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے، وہ مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”کچھ نہیں۔“

”کچھ نہیں، بہت کچھ، معاملہ تو صاف گڑبڑ دکھائی دے رہا ہے، جلدی بتاؤ، کیا پروگریس ہوئی ہے؟“

”بس یہی کہ اس نے مجھے پروپوز کیا ہے؟“

”بس؟“ میں نے بھی یوں بس کہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

”اور تم نے کیا کہا؟“

”میں نے اپنی ساری مجبوریاں بتائیں کہ میں اگر شادی کر لوں تو پیچھے میرے گھر والوں کے لئے کتنے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔

”تو، ہادی نے کیا کہا پھر؟“ میں نے بے تاب سے پوچھا، اس کے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکان پھیلی۔

”اس نے کہا کہ وہ مریم کو میری جگہ جاب دے دے گا اور مزید میں جس طرح چاہوں ان کی ہیلپ کر سکتی ہوں۔“

”تو اس کا مطلب ہے تم راضی ہو۔“ میں دھمال ڈالنے سے پہلے کنفرم کرنا چاہتی تھی، سلاکٹ رائیڈ سب وہیں نیبل پر ڈھک کر بارے خوشی کے میں اسے کمرے میں لے آئی (یہ قطعی بھول کر کہ



# شہر و کلاکس

تحسین اختر

فرش سے عرش تک جس کا شہرہ تھا وہ خاتم النبیینؐ کا مقدس چہرہ تھا جہالت کی رات تھی جب ساری کائنات محبوب خدا بن کے اجالا ہر سو بکھرا تھا سب شجر و بشر اور پتھر تعظیم کو جھکے تھے جب بھی جہاں سے بھی وہ نور مجسم گزرا تھا محبوب کے آگے کوئی نظروں میں چٹا نہیں اٹھتا سدا کے لئے سزا وار ٹھہرا تھا

## ناولٹ

کے پراثر بولوں میں کھوئی ہوئی تھی اور اتنا کھوئی ہوئی تھی کہ اسے قریب ہی پڑے اپنے سیل فون کی بھی ہوش نہ تھی جس پر لگتی دیر سے نہال کی کال آ رہی تھی۔

”نہال کالنگ۔“ مشائم اندر کمرے میں آئی تھی اور اسے گمن دیکھ کر اس کے موبائل کی طرف بڑھی تھی، ”نہال کالنگ“ دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی، اس نے موبائل اٹھایا اور کال اٹینڈ کر کے کان کے ساتھ لگا لیا تھا۔

”ہیلو! حریم۔“ نہال کی مسرور کن آواز اس کی سماعتوں میں اتری تو ایک پل کو تو لگا کہ کسی نے کوئی امرت کانوں میں ٹپکا دیا ہو مگر حریم کا نام سن کر دوسرے پل لگا کہ کسی نے پگھلا ہوا سیبہ اندر اتار دیا ہو۔

”حریم نہیں مشائم۔“ وہ تلخی سے بولی تھی،

آٹھویں قسط





تب تک حریم بھی اس کی طرف متوجہ ہو چکی تھی اور اس کے ہاتھوں میں اپنا سیل فون دیکھ کر حریم کا خون کھولنے لگا تھا۔

”مشائم! اوہ اب اتنا گرگنی ہو کہ کسی کی پرسنل چیزوں کو بھی بے دھڑک استعمال کرنے لگی ہو۔“ وہ طنزیہ مسکرا کر بولا تھا، مشائم پہلے ہی جل رہی تھی اب تو آگ کے بھلا بھڑ پر جا بیٹھی تھی۔

”شٹ اپ۔“ اس نے نہال سے کہا تھا اور موبائل بیڈ پر پھینک کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی، کال ابھی تک چل رہی تھی، حریم نے آگے بڑھ کر موبائل اٹھایا تھا۔

”اس کی جرات کیسے ہوئی تمہارا سیل فون اٹھانے کی۔“

”کم آن نہال! اس میں اتنا غصہ کرنے والی کیا بات ہے، اس کا دل کیا ہوگا تم سے بات کرنے کو، اس میں اتنی قیامت کھڑی کرنے والی بات ہے۔“ غصہ تو حریم کو بھی اس غلط حرکت پر بہت آیا تھا مگر وہ نہال کو اور بھڑکانے کی بجائے ٹھنڈا کرنے لگی تھی۔

”غصہ ہونے والی بات ہے نا۔“  
”اچھا چلو چھوڑو، یہ بتاؤ فون کیوں کیا؟“  
اب کہاں یاد رہ گیا کہ فون کیوں کیا، وہ جل کر بولا تھا۔

”ہوں چلو ایسا کرو فون بند کر کے یاد کر لو کہ کیا کہا تھا، پھر دوبارہ کر لینا، شاباش گڈ بائے۔“ حریم نے پیار سے کہہ کر فون بند کر دیا تھا وہ حریم کو آوازیں دیتا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

”مومو یہ کیا حلیہ بنایا ہوا ہے تم نے اپنا۔“ مسز علوی کو بیٹیوں کا خیال پہلے بھی نہیں آیا تھا اور نہ ہی انہوں نے بھی ان پر توجہ دینے کی زحمت کی تھی، مگر جب سے مریم روٹھ کر آئی تھی تب سے

وہ آتے جاتے اسے کوئی نہ کوئی بات کہہ دیتی تھیں۔

”کیا ہوا ہے میرے حلیے کو، ٹھیک ہوں۔“ ماں کی توجہ کی وہ لوگ کب نادہ تھیں اس لئے جیسے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔

”ذرا آئینہ تو دیکھو، کہاں سے ٹھیک ہو۔“  
”یہ آپ نے کب سے مجھے غور سے دیکھا شروع کر دیا۔“ اس نے حیرت سے پوچھ ہی لیا تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“  
”مطلب بھی آپ خوب اچھی طرح جانتی ہیں۔“ وہ ذرا ہوا خوری کے لئے باہر جانا چاہتی تھی، ماں کو جواب دے کر باہر نکل گئی تھی۔

”ہونہ! سر پہ ہی چڑھتی جا رہی ہے۔“ وہ بھی بڑبڑاتے ہوئے اپنے کمرے میں ٹھس مکی تھیں، انہیں بھی کب اپنی اولاد کو پروٹوکول یا نام دینے کی عادت تھی۔

وہ گھر سے نکل کر قریبی پارک میں چلی آئی تھی، ٹھنڈی نم ہوائے اس کا استقبال کیا تھا شاید کہیں قریب ہی بارش ہوئی تھی، فضا میں نمی ابھی تک محسوس کی جاسکتی تھی، وہ چلتے چلتے ایک بیچ پر کر بیٹھ گئی تھی اور خوبصورت موسم کو دھکی دل کے ساتھ محسوس کرنے لگی تھی، اتنے میں ایک فٹ بال اس کے پاؤں پر آ کر لگا تھا، وہ پاؤں سہلانے لگی تھی، پتہ نہیں کس بدتمیز نے یہ پچھا ہے وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ وہ بدتمیز فٹ بال کے پیچھے بھاگتے ہوئے آ گیا تھا۔

”اوہ سوری، آپ کو لگا تو نہیں۔“ اسے اگلیوں سے پاؤں دباتے دیکھ کر بھی پوچھنے لگا تھا۔

”نہیں لگا تو نہیں، میں تو شوق سے پاؤں دبا رہی ہوں۔“ وہ ایسی مصہویت پر چڑ کر بولا

”اوہ اس کا مطلب ہے لگ گیا، سوری۔“ وہ اب شرمندہ نظر آنے لگا تھا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، لے جائیں اپنا فٹ بال۔“ وہ بے رخی سے فٹ بال کی طرف اشارہ کر کے بولی تھی، وہ فٹ بال اٹھا کر چل پڑا تھا، ہاں چند قدم دور چل کر واپس مڑا تھا اور ایک دلکش مسکراہٹ اس کی طرف اچھال کر درختوں کے پیچھے گم ہو گیا تھا۔

”بدتمیز۔“ وہ دانت پکچا کر بولی تھی۔  
”پاؤں تو ٹھیک ہے نا آپ کا، درد تو محسوس نہیں ہو رہا نا، آجائیں میں گاڑی میں آپ کو چھوڑ دوں۔“ وہ کچھ دیر بیٹھ کر پارک سے باہر نکل آئی تھی ابھی پارک کے گیٹ پر ہی تھی کہ وہ لسوڑے کی طرح پھر چٹ گیا تھا۔

”جی نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں اور خود چل کر گھر جاسکتی ہوں۔“  
”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ وہ اب اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔

”میں نے کہا نا میں ٹھیک ہوں اور خود چل کے جاسکتی ہوں، اب آپ بھی جاسکتے ہیں۔“  
مریم کو اس طرح کے چپکو لوگ بالکل بھی اچھے نہیں لگتے تھے، وہ رک کر اپنی بات دہراتے ہوئے ذرا غصے سے بولی تھی۔

”ہاں تو میں بھی اپنے گھر جا رہا ہوں کون سا رک کر آپ کے راستے میں کھڑا ہوں۔“  
”ہوں۔“ مریم غصے سے دوسری طرف مڑ گئی تھی، وہ اسی راستے پہ کھڑا تا دیر اس کو دیکھتا رہا تھا اور خواہ مخواہ ہی مسکراتا رہا تھا۔

☆☆☆

موحد نے گارمنٹس کا بزنس شروع کر لیا تھا، یہ اور بات کہ بزنس کوئی بھی ہوتی جلدی نہیں

چلتا، موحد کو ابھی تجربہ بھی کوئی نہیں تھا اس لئے ابھی کوئی خاص سیل نہیں ہو رہی تھی ہاں یہ تھا کہ وہ بڑی ہو گیا تھا اور گھر میں وانیہ بوری رہتی تھی۔

ایک دن وانیہ کے لئے ایسا ہی بوریٹ بھرا دن تھا جب اسے ماما کی بے حد یاد آئی تھی اور وہ رہ نہ سکی تھی اس نے اپنے سیل فون سے ماما کا نمبر ٹرائی کیا تھا، نمبر ملاتے ہی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی تھی کہ ماما جانے اس کی آواز سن کر کیا بولیں، مگر آگے تو نمبر بند تھا، اس نے مایوس ہو کر ڈیڈی کا نمبر ٹرائی کیا تھا، حالانکہ جس طرح ڈیڈی اس سے ناراض تھے وہ بھی ان کو فون کرنے کی ہمت نہ کر پاتی، مگر اس وقت ماما سے بات کرنے کا اتنا دل کر رہا تھا کہ وہ بے اختیار ہی ڈیڈی کا نمبر ڈائل کر بیٹھی تھی اور اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا کہ ڈیڈی کا نمبر بھی بند تھا، جس طرح ماما اور ڈیڈی بڑی رہتے تھے، سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ ان کا نمبر بند ہو، شاید ان دونوں نے اس سے رابطہ ختم کرنے کی خاطر اپنے اپنے نمبر ہی بدل لئے تھے، اس نے کافی دیر صبر کیا تھا مگر جب رہ نہ سکی تو اپنے گھر کا نمبر ملایا تھا، فون کسی ملازم نے اٹھایا تھا۔

”ماما سے بات کروادیں۔“  
”کون؟ وانیہ بی بی۔“ وہ ان کا کلک رشید تھا جس نے اسے پہچان لیا تھا۔

”ہاں وانیہ بول رہی ہوں، ماما کہاں ہیں؟“

”صاحب اور بیگم صاحبہ تو دو بی بی چلے گئے ہیں، بیگم صاحبہ کی طبیعت صحیح نہیں رہتی تھی یہاں، صاحب ان کو لپکا لپکا لے گئے ہیں اور یہ گھر وہ اپنے منیجر کو بیچ گئے ہیں، بی بی جی وہ بھی بہت اچھے ہیں، انہوں نے ہم سب کو رکھ لیا ہے اپنے پاس، بالکل صاحب جی کی طرح ہمارا خیال



رکھتے ہیں۔“ رشید نے دو منٹوں میں ہی اسے ساری انفارمیشن دے دی تھی۔  
 ”چھاڈیڈ کا کوئی نمبر ایڈریس۔“  
 ”نہیں جی، ہمارے پاس نہ تو ان کا کوئی نمبر ہے نہ ایڈریس۔“  
 ”اچھا ٹھیک ہے۔“ اس نے مایوسی سے فون رکھ دیا تھا۔  
 ”جان موحّد! کیا ہوا یہ آنکھیں کیوں نم ہیں۔“ موحّد شام کو گھر آیا تو وہ بہت تجھی تجھی پھر رہی تھی، اس کے پاس بیٹھا تو وہ اور بھی اداس لگی۔  
 ”مما یاد آ رہی ہیں۔“ اس نے بچوں کی سی مصوویت سے کہا تھا۔  
 ”تو اس میں اتنا اداس ہونے والی کون سی بات ہے، ان کو فون کر لو، ان سے بات کر لو، وہ لاکھ تم سے ناراض ہیں مگر بات کر لو گی تو تمہارے دل کو تسلی ہو جائے گی۔“  
 ”آج میں نے ان کو فون کیا تھا۔“  
 ”اچھا پھر۔“  
 ”ڈیڈ ماما کو لے کر دوئی شفٹ ہو گئے ہیں اور گھر بھی انہوں نے سیل کر دیا ہے، انہوں نے اپنے نمبرز بھی بدل دیئے ہیں، اب کسی کے پاس ان کا کوئی ایڈریس ہے نہ فون نمبر۔“  
 ”اوہ یہ تو بہت برا ہوا، مگر ان کا تو آدھے سے زیادہ بزنس یہاں ہے پاکستان میں، وہ سب کیسے چھوڑ کر جاسکتے ہیں۔“  
 ”وہ وہاں بیٹھ کر بھی تو بزنس کو دیکھ سکتے ہیں، پھر یہ بھی نہیں پتہ کہ انہوں نے فیکٹریز بھی سیل کر دی ہیں کہ نہیں۔“  
 ”اچھا تم پریشان مت ہو، ایسا نہیں ہوگا، ان سے رابطے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکل آئے گی۔“  
 ”جج کہہ رہے ہوتا موحّد۔“

”ہاں میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔“  
 ”میں انہیں بہت مس کرنے لگی ہوں۔“  
 ”ظاہر ہے تمہارے ماں باپ ہیں، تم انہیں بھول تو نہیں سکتی ہو۔“  
 ”اچھا میں تمہیں ایک بات تو بتانا بھول ہی گیا، کل اماں ہمارے پاس آ رہی ہیں، انہیں تم سے ملنے کا اتنا شوق ہے کہ ان سے صبر ہی نہیں ہو رہا، وہ کل آ رہی ہیں۔“  
 ”اوہ تو تم اب بتا رہے ہو مجھے۔“  
 ”یار آتے ہی تو تم نے مجھے پریشان کر کے رکھ دیا تھا، تمہاری اتری صورت دیکھ کر میں سب کچھ بھول بھال گیا۔“  
 ”چلو ایسا کرتے ہیں، بازار چلتے ہیں تمہاری آؤٹنگ بھی ہو جائے گی اور جو چیز گھر میں نہیں ہے وہ بھی لے لینا، میری ماں پہلی دفعہ میرے گھر آ رہی ہے، میں نہیں چاہتا کہ ان کو کسی چیز کی کمی محسوس ہو۔“  
 ”ہاں کچھ چیزیں ختم ہیں۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی تھی۔  
 ”چلو پھر جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“ وہ بیڈ پر سے اٹھتے ہوئے بولا تھا۔  
 ”کھانا نہیں کھائیں گے کیا؟“  
 ”نہیں آج باہر کھائیں گے۔“ وہ واٹس ایپ میں گھسے ہوئے بولا تھا۔  
 ”اماں کے آنے پر وہ بہت خوش تھا جبکہ آج ہی وانیہ اپنے می ڈیڈی کے لئے اداس تھی اور آج ہی ان سے بات نہیں ہو سکی تھی۔“ وانیہ کی اداسی کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔  
 موحّد کی اماں وانیہ کی سوچوں کے بالکل الٹ تھیں، اس نے ہمیشہ ماؤں کا اور ہی روپ دیکھا تھا، ایک مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والی ماں کیسی ہوتی ہے، وہ کب جانتی تھی، اس لئے

جب موحّد بس اسٹینڈ سے اماں کو لے کر گھر آیا تھا تو سفید چادر کی بگل مارے موٹے رنگ کا چکن کا سوٹ پہنے اور کالی عامی چپل میں اماں وانیہ کو بالکل بھی متاثر نہ کر سکی تھیں، حالانکہ اماں نے اپنی سی تیاری پتہ نہیں کتنے دن لگا کر کی تھی اور خود کو اسلام آباد تک پہنچنے میں کیسے بلکان نہیں کیا تھا اور خود کو اس وقت وہ کوئی بہت ہی اعلیٰ وارفع چیز سمجھ رہی تھیں۔  
 ”اماں یہ وانیہ۔“ موحّد نے ماں کو بانہوں کے گھیرے میں لے کر وانیہ کا تعارف کروایا تھا۔  
 ”آپ کی لاڈلی اور اچھوتی بہو۔“  
 ”اور وانیہ اماں سے ملونا۔“ دونوں کی چپ کو موحّد نے توڑا تھا، وانیہ دو قدم آگے بڑھی تھی اور اماں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے بانہوں کے گھیرے میں لے لیا تھا۔  
 ”سدا جگ جگ جیو، سدا سہاگن رہو۔“  
 اماں ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر اور ٹی شرٹ میں ملبوس اس ماڈرن اور بے حد خوبصورت لڑکی کو اپنی بہو کے روپ میں دیکھ کر پہلے تو کم صم ہو گئی تھیں، وانیہ انہیں دیکھ کر جتنا مایوس ہوئی تھی وہ وانیہ کو دیکھ کر اتنا ہی متاثر ہوئی تھیں، انہوں نے ایسی بہو کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا، ان کے موحّد کے لئے رب نے ایسی لڑکی لکھی ہوگی انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔  
 ”اماں کیسی لگی آپ کی بہو۔“ اماں سے مل کر وانیہ بچن میں کچھ کھانے پینے کو لینے چلی گئی تھی، موحّد نے ماں کے پاس آ کر سرگوشی میں پوچھا تھا۔  
 ”اماں بتاؤ نا۔“ اماں اب جدید طرز کے فلیٹ کو بھٹی بھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی جب موحّد نے بے پنی سے پھر پوچھا تھا۔  
 ”کیا بتاؤں، وہ کوئی لڑکی تھوڑی ہے، حور

ہے حور، ویسے تمہیں ایسی انگریز (انگریز) لڑکی کہاں سے مل گئی۔“ اماں نے اپنے جذبات کو زبان دی تھی۔  
 ”بس اماں تیرے پتر کی قسمت ہی ایسی ہے۔“ وہ کارل اکرڈ کر بولا تھا، اتنے میں وانیہ ٹرے میں جوس اور کچھ پھل لے آئی تھی۔  
 ”لیں اماں۔“ اس نے جوس کا گلاس اماں کے ہاتھ میں پکڑا یا تھا اور پھل سامنے ٹیبل پر رکھ دیئے تھے اور خود سامنے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔  
 ”پتر وہاں کیوں بیٹھ گئی ہو ادھر آؤ نا میرے پاس۔“ اماں نے اسے اپنے پاس بلایا تھا۔  
 ”ہاں آؤ نا، اماں کے پاس آ کر بیٹھو۔“ موحّد نے بھی لقمہ دینا ضروری سمجھا تھا، وانیہ اٹھ کر اماں کے پاس آ گئی تھی۔  
 ”موحّد تمہیں خوش تو رکھتا ہے نا، کوئی تنگی تکلیف تو نہیں ہے نا پتر۔“ اماں کو جوس بہت مزیدار لگا تھا، عجیب ہی ذائقہ تھا، وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر کر جوس انجوائے کرتے ہوئے وانیہ سے پوچھنے لگی تھیں۔  
 ”نہیں، ہم دونوں بہت خوش ہیں۔“  
 ”یہ تو بہت اچھی بات ہے، اللہ پاک تم دونوں کو ایسے ہی خوش رکھے، موحّد وہ میرا بیگ تو پکڑا نا ذرا۔“ جوس ختم ہو گیا تھا، اماں نے گلاس ٹیبل پر رکھ کر موحّد کو پکارا تھا، موحّد جلدی سے بیگ اٹھا لیا تھا۔  
 ”میں یہاں دفعہ اپنی نو (بہو) کو ملنے آئی تھی یہ اس کے لئے لائی تھی مگر اب اس کو دیکھ کر مجھے اپنی لائی ہوئی چیز۔ اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔“  
 اماں نے بیگ کھول لیا تھا اور چیزیں نکالنے کے ساتھ ساتھ شرمندگی سے کہہ رہی تھیں، بہت عام



سے پرنٹ کے دو سوٹ، سستی سی پارے والی چوڑیاں، پازبیں، سستا سائیک اپ کا سامان، ٹیبل پر بڑا عجیب ہی بہاد دکھا رہا تھا۔  
 ”یہ سب عابدہ نے خریدا تھا۔“ اماں نے سارا مدعا عابدہ پر ڈال دیا تھا۔  
 ”ارے نہیں اماں آپ اتنی خوشی سے لائی ہیں تو برا کیوں ہوا، سب بہت اچھا ہے۔“ وانیہ سب چیزیں دیکھ کر ابھی تذبذب میں تھی کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے موصد بول اٹھا تھا۔  
 ”وانیہ اٹھاؤ سب، یہ بھی گاؤں کی سوغات ہے سب۔“ موصد نے ساتھ ہی وانیہ کو آنکھ سے اشارہ کیا تھا، وانیہ حرکت میں آئی تھی۔  
 ”ہاں سب اچھا ہے۔“ وانیہ نے مرے مرے لہجے میں کہا تھا اور چیزیں اٹھا کر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔  
 ”پتر! اسے اچھا نہیں لگانا۔“  
 ”نہیں اماں، ایسی بات نہیں ہے، وانیہ ایسی نہیں ہے، آپ دل پر مت لیں کوئی بات۔ سب بہت اچھا ہے۔ آپ اتنی دور سے ہمارے لئے آئی ہیں، اتنا کچھ لائی ہیں، پھر اچھا کیوں نہیں۔“ موصد اماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر اماں کا دل ہلکا کرنے لگا تھا اور اندر کمرے میں وانیہ اپنی چیزوں کو پکڑے کھڑی تھی یہ وانیہ کی قسمت تھی جسے اس نے خود بنایا تھا اپنے ہاتھوں سے۔

☆☆☆

”آج شام کو تم کہاں جا رہی ہو۔“ نہال حرم کے سر پر کھڑا بڑے اشتیاق سے پوچھ رہا تھا، پہلے وہ ڈھکے چھپے انداز میں اپنی محبت کا اظہار کرتا تھا، مگر حرم نے دیکھا تھا کہ پچھلے کچھ دنوں سے اس نے کل کر بڑے مان اور استحقاق سے اس محبت کا استعمال شروع کر دیا تھا اور یہی

بات حرم کو حیرت میں ڈال دیتی تھی۔

”کیا مطلب کہاں جا رہی ہوں؟“ وہ حیران ہو کر بولی تھی۔

”حرم پلیز جو میں پوچھ رہا ہوں اس بات کا جواب دو۔“

”کہیں بھی نہیں، مجھے کہاں جانا ہے۔“ وہ انجان بننے ہوئے بولی تھی۔

”کیا تم آج شام کو امیر جنجوعہ کے ساتھ ڈنر پر نہیں جا رہی ہو۔“ وہ نظر چرا رہی تھی مگر وہ سامنے آکر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا تھا۔

”اچھا مجھے تو نہیں پتہ، تمہیں کس نے کہا۔“  
 ”زیادہ معصوم بننے کی ضرورت نہیں ہے، میں بھی اسی آفس میں اور انہی لوگوں کے درمیان رہتا ہوں اور اللہ کا شکر ہے کہ آنکھیں اور کان کھلی رکھتا ہوں اس لئے یہاں جو کچھ بھی ہوتا ہے یا ہونے جا رہا ہوتا ہے مجھے سب خبر ہوتی ہے۔“  
 ”اوہ تو تم نوکری کے لئے نہیں جاسوسی کرنے آتے ہو یہاں۔“

”جو بھی سمجھ لو تم، بہر حال تم اب ایسے کسی ڈنر شرم میں نہیں جاؤ گی۔“  
 ”میں کوئی شوق سے نہیں جاتی ہوں، یہ میری جاب کا حصہ ہے اور مجھے جاب کے رولز کو فالو کرنا پڑتا ہے۔“

”آ..... چھا..... ذرا دکھانا جاب کے رولز اینڈ ریگولیشنز کہاں لکھے ہوئے ہیں اور کس نے لکھے ہیں ذرا میں بھی تو دیکھوں۔“ وہ طنز سے بولا تھا۔

”دیکھو نہال، مجھے یاشر صاحب کا حکم ماننا پڑتا ہے۔“

”یاشر صاحب کے پاس تم مجبوری سے جاب ضروری کرتی ہو لیکن اس کا مطلب یہ نہیں

ہے کہ تم نے اپنی مجبوریوں کا سودا کر لیا ہے، حرم اتنا ہی آگے بڑھو جتنا واپس بھی آسکو، تمہیں نہیں پتہ ان بڑے لوگوں کے پاس کیسے کیسے دریا ہیں اور اس میں کتنے بڑے بڑے مگر مجھ ہیں جو تم جیسوں کو نکلنے کے لئے تیار بیٹھے رہتے ہیں۔“

”مجھے سب پتہ ہے، یہ میری پہلی جاب نہیں ہے، مجھے ایسے لوگوں کا بہت تجربہ ہے۔“

”پھر بھی..... پھر بھی تم جان بوجھ کر اس میں ڈوبنا چاہتی ہو۔“ وہ دھکی لہجے میں بولا تھا۔

”ڈوبنا نہیں چاہتی، اپنے مسئلے حل کرنا چاہتی ہوں، تمہیں پتہ ہے میری ماں کیسی عورت ہے، میں گھر پیسے نہ بھیجوں تو وہ مجھے گھر کی دہلیز بھی نہ پار کرنے دے، ابھی اماں کی بجائی کی شادی کے لئے یاشر صاحب سے ایک لاکھ روپیہ لے کر اماں کو دیا ہے، اب اگر یاشر صاحب کی بات نہیں مانوں گی تو وہ مجھے کب اتنی سہولتیں دیں گے۔“

”بے وقوف لڑکی جس ایک لاکھ روپے کو تم یاشر صاحب کا احسان سمجھ رہی ہو اور ابھی تک اس احسان میں ڈوبی ہوئی ہو، تمہیں کیا خبر کہ تمہارے ذریعے امیر جنجوعہ سے یاشر صاحب نے کتنے لاکھوں نکلوائے ہوں گے، وہ ایک لاکھ دے کر انہوں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ وہ تمہارا حق بنتا تھا، مگر تمہیں اتنا چھوٹا سا پوائنٹ اتنی چھوٹی سی بات کی سمجھ نہیں آ رہی ہے۔“ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

”اچھا چلو وہ میرا حق تھا تو آگے کیا مجھے نوکری نہیں کرنی اب جو وہ کہیں میں انکار کرتی جاؤں۔“

”جو جائز کام ہے اس پر تمہیں کون کہتا ہے انکار کرو، میں بھی نہیں کہتا مگر ہر کام کے لئے چاہے وہ غیر ضروری کیوں نہ ہو مت حامی بھرو،

خدا کے لئے مت حامی بھرو۔“

”تمہیں بہت خیال ہے میرا۔“

”ہاں ہے تو کہہ رہا ہوں نا، کچھ سوچو، اپنے بارے میں، اپنی عزت کے بارے میں اور..... اور میری محبت کے بارے میں۔“ وہ جاتے جاتے اسے ہلکے ہلکے لہجے میں سمجھا بھی گیا تھا اور آخر میں چھڑ بھی گیا تھا۔

امیر جنجوعہ جس طرح اس پر لٹو ہو رہا تھا یہ بات تو حرم کے دل کو بھی کھٹک رہی تھی مگر یاشر علوی پر اسے اتنا یقین تھا کہ اسے لگتا تھا کہ یاشر علوی بھی اس کے ساتھ برا نہیں ہونے دے گا اور ہمیشہ ہر قدم پر اس کا ساتھ دے گا، مگر اس وقت نہال کی باتوں نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

شام کو وہ سستی سے بیڈ پر پڑی تھی جب یاشر صاحب کی کال آئی تھی۔

”کیا ہوا حرم طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ وہ اس کی آواز سے اندازہ لگا کر بولا تھا۔

”نہیں سر، بس ٹھیک ہو گیا ہے۔“ اس نے آواز میں مزید ثقاہت طاری کرتے ہوئے کہا تھا۔

”اوہ مگر کب، صبح آفس میں تو تم بالکل ٹھیک تھیں۔“ وہ فکر مند نظر آنے لگا تھا۔

”بس سر ہائل آئی تو کچھ عجیب سافیل ہو رہا تھا اور اب شام تک ٹھیک ہو گیا ہے۔“

”اوہ، یہ تو برا ہوا، چلو پھر تم آرام کرو، اس حالت میں امیر جنجوعہ کی میٹنگ خاک انیڈ کر سکو گی، میں اس سے ایکسکوز کر لیتا ہوں۔“

”جی سر۔“ اس نے جان چھوٹنے پر لاکھوں شکر ادا کیا تھا اور فون بند کر کے لیٹ گئی تھی، شکر ہے کچھ دنوں تک یہ مسئلہ حل ہو جائے گا، کل سے عید کی چھٹیاں ہو رہی تھیں اور اسے بھی کل گاؤں



چلے جانا تھا، اس نے مطمئن ہو کر سر تکیہ میں گھسا لیا تھا۔

☆☆☆

تمہاری خاموشی کا سبب

جانتا ہوں میں

روٹھے ہو تم

مانتا ہوں میں

پر حصارانا میں قید

اب کی بار بھی

میری یہ خواہش ہے

کہ ہر باری طرح

تم ہی مجھے مناؤ

پر یونہی دنوں کا شمار کرتے کرتے

تمہارا انتظار کرتے کرتے

کیلنڈر کی طرف دیکھا

تو خیال آیا

اب کی بار میں

اپنی انا کو توڑ دوں

محبت کی کہانی کو

نیا اک موڑ دوں

شاید اسی طور ہو جائے

میری ساری کوتاہیوں کا تدارک

لو آج میں تمہیں کہتا ہوں

جان جاں!

عید مبارک!

چاند رات تھی ہر طرف شور شرابا اور گہما گہمی عروج پر پہنچی ہوئی تھی، جب مریم نے اپنے Whats app یہ منصور کی طرف سے ایک خوبصورت میج کے ساتھ یہ نظم وصول کی تھی، وہ جب سے ناراض ہو کر آئی تھی، منصور اسے لاتعداد میسر کر چکا تھا مگر اس نے ایک بھی جواب نہیں دیا تھا، ابھی بھی عید مبارک کہے بنا نہ رہ سکا

تھا اور پڑھ کر مریم کے چہرے پر مسکراہٹ تک نہ آئی تھی، اس نے بے دلی سے پڑھ کر موبائل سائیڈ پر رکھا تھا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر لیٹ گئی تھی، اتنے میں دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی، اس نے ذرا سا بازو ہٹا کر دیکھا تھا۔

اس وقت ملازمہ کے سوا اور کون ہو سکتا تھا، مگر یہ کیا اندر ملازمہ نہیں منصور چلے آئے تھے، اس نے بازو آنکھوں پر اچھی طرح جمالیا تھا گویا یہ بھی ناراضگی کے واضح اظہار کا طریقہ تھا، وہ قدم قدم چلتے ہوئے قریب آئے تھے اور اس کے بالکل پاس آکھڑے ہوئے تھے، پھر انہوں نے جھک کر اس کا بازو ہٹایا تھا، مریم نے ایک نظر نکلی سے ان پر ڈالی تھی اور دوسری سائیڈ پر کروٹ لے لی، جیسے انہیں چہرہ بھی نہ دکھانا چاہتی ہو، وہ بیڈ کے کنارے تک گئے تھے۔

”ناراضگی اچھی لگتی ہے، مگر اتنی بھی نہیں کہ بندہ منہ ہی موڑ لے۔“ انہوں نے اس کا بازو تھام کر اس کا رخ اپنی طرف موڑا تھا۔

”تمہیں پتہ ہے صبح عید ہے اور آج چاند رات، یعنی خوشیوں بھری رات اور تم ایسے روٹی ہو، یار بس کرو اور غصہ ختم کر دو، تم میرے بغیر اور میں تمہارے بغیر عید کیسے منا پاؤں گا۔“

”یہ اس وقت سوچنا تھا جب ذرا سی بات پہ طوفان اٹھایا تھا۔“ وہ بھری بیٹھی تھی۔

”جو ہوا میں اس کو دھرانے نہیں بلکہ بھلانے آیا ہوں، اس لئے گزری کوئی بات نہ ہو گی بس اٹھو اور ہمارے ساتھ گھر چلو۔“ اتنے میں ہما اور سنی دونوں دروازہ کھول کر بھاگتے ہوئے اندر آئے تھے اور مریم کے بیڈ پر چڑھ گئے تھے۔

”ماما چلیں نا گھر، صبح عید ہے۔“ دونوں نے بیک آواز میں کہا تھا، مریم کو لاکھ غصہ سہی مگر

ان دونوں کے جن میں منصور بھی شامل تھے ان کی محبتوں کے آگے ہار گئی تھی اور اسے اٹھ کر بیٹھنا ہی پڑا تھا۔

”ہرا۔“ بچوں نے نعرہ لگایا تھا اور منصور کا چہرہ بھی خوشی سے چمک اٹھا تھا، مریم کا دل اندر سے ذرا خوش نہیں تھا مگر اسے ناچار اٹھنا پڑا تھا۔

”ماما جلدی سے تیار ہو جائیں پھر ہمیں ڈھیر ساری شاپنگ کے لئے بازار جانا ہے اور پاپا نے وعدہ کیا ہے آج ہم ڈھیر بھی باہر کریں گے اور بعد میں بہت سارا گھومیں گے بھی۔“ سنی نے جوش سے کہا تھا۔

”ہاں مریم جلدی سے چینیج کر کے آؤ۔“ منصور نے بھی سنی کی بات کی تائید کی تھی، مریم اٹھ کر کپڑے اٹھا کر دوش روم میں گھس گئی تھی۔

”مومو کہاں جا رہی ہو۔“ بچے اور منصور گاڑی میں بیٹھ گئے تھے اس کا ایک قدم گاڑی کے اندر اور دوسرا اچھی باہر تھا جب ماما باہر سے آئی تھیں اور تیزی سے اپنی گاڑی سے اتر کر مومو کے پاس آکر پوچھنے لگی تھیں۔

”اپنے گھر، منصور اور بچوں کے ساتھ۔“

مریم نے بتایا تھا۔

”کیا... مگر تم تو...“

”ہاں ناراض تھی مگر ان لوگوں نے آکر میری ناراضگی ختم کر دی ہے۔“ اس نے ماں کی ادھوری بات کا پورا مطلب سمجھ کر جواب دیا تھا۔

”ہائے مئی، کل عید ملنے آئیں گے ہم لوگ اگر آپ گھر پر ہوئیں تو۔“ وہ کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گئی تھی، مسز علوی تن فرن کرتی اندر چلی گئی تھیں، جو مزہ انہیں مریم کا گھر اجاڑ کر آتا کہ وہ شروع سے ہی منصور کو ناپسند کرتی تھیں، وہ مزہ آج مریم کو ان کے ساتھ جاتے دیکھ کر کیسے آسکتا تھا۔

بڑے عرصے بعد بچوں نے چاند رات

بڑے اہتمام اور جوش کے ساتھ منائی تھی، اس رات منصور نے انہیں دل کھول کر شاپنگ کروائی تھی، گڑیا اور مریم کو پارلر سے مہندی لگوائی تھی تب تک دونوں باپ بیٹا پارلر کے باہر بیٹھے آکس کریم کھاتے اور موبائل پر میگزین پھیلے رہے تھے، بالآخر خیر نمودار ہونے سے کچھ پہلے وہ لوگ بازار سے گھر لوٹے تھے، بچے تو گھر آکر سو گئے تھے مگر منصور نے مریم کو سونے نہیں دیا تھا، اس کے لئے خود چائے بنائی تھی اور اس کو لے کر باہر لان میں آگیا تھا، وہ آج مریم سے ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتا تھا، منصور کی اتنی والہانہ چاہت دیکھ کر مریم کا موڈ بھی کچھ کچھ ٹھیک ہوئی گیا تھا۔

☆☆☆

گرمی بے حد زیادہ تھی، لوچلتی تو پاؤں تک کو جھلسا کر رکھ دیتی، ایسے میں روزہ رکھنا اور عبادت کرنا مشکل نہ ور لگ رہا تھا مگر جن لوگوں کو عادت تھی وہ بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ یہ سب کر رہے تھے، حریم نے بھی روزہ نہیں چھوڑا تھا، ابھی بھی جاب کے ساتھ ساتھ بے شک آفس کا ٹائم رمضان کی وجہ سے کم ہو گیا تھا، وہ روزے بھی رکھ رہی تھی اور حتی الامکان عبادت کرنے کی بھی پوری کوشش کرتی تھی، آخر آخری عشرہ بھی اختتام کو پہنچا تھا اور وہ عید کی چھٹیوں میں گاؤں آگئی تھی۔

گاؤں میں اس بار چاند رات اس کے لئے عجب اداسی لے کر اتری تھی، جس دشمن جاں کی محبت وہ دل میں چھپائے ہوئے تھی اور ابھی اس محبت کا اظہار بھی ضروری نہ سمجھا تھا مگر اس نے کیا کیا، شہر میں ہی امیر و کبیر لڑکی سے بیاہر چالیا اور آج کل تو سنا تھا کہ اسلام آباد میں رہ رہا تھا، یہ بات بھی اسے گاؤں آکر پتہ چلی تھی۔

”تو ایسے کیوں لیٹی ہوئی ہے، مہندی نہیں



لگانی کیا۔“ چاندنی ہاتھ میں مہندی کی کون پکڑے اس کے سر پر آسوار ہوئی تھی۔

”نہیں مجھے نہیں لگانی۔“ اس نے ایسے ہی امرود کے بیڑ کے نیچے چار پائی پر لیٹے لئے جواب دیا تھا۔

”اچھا تمہیں نہیں لگانی پر مجھے تو لگانی ہے۔“ وہ دھب سے اس کے پاؤں کی طرف بیٹھ گئی تھی چار پائی چوں چوں کرتے رہ گئی تھی۔

”خدا کو مانو چار پائی توڑنی ہے اماں کا پتہ ہے نا۔“ وہ گھر کی چیزوں کو کیسے سنبھال کر رکھتی ہیں۔

”ہاں ہاں پتہ ہے تمہاری اماں کا، ان کا بس چلے نا تو گھر کا کوڑا کرکٹ بھی باہر نہ پھینکیں، اسے بھی گھر کے اندر ہی استعمال کر لیں۔“ ساتھ ہی اس نے امرود کی ہنسی پھینچی تھی۔

حریم کے چہرے پر ذرا دیر کو اس کی بات مسکراہٹ لہرائی تھی پھر جلد ہی اس نے ہونٹ جھینچ لئے تھے۔

”چھوڑ دو ٹہنی کو شام کے وقت درختوں کو نہیں ہلاتے۔“ ساتھ ہی چاندنی کو ٹوکا تھا۔

”اچھا بی اماں، اب اٹھ بھی چکو اور میرے مہندی لگاؤ۔“ چاندنی نے ابھی تک اسے کسلمندی سے بڑے دیکھ کر کہا تھا۔

”ہاں ویسے تم نے میری جان کیوں چھوڑنی ہے۔“ حریم اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور اس سے کون لے کر اس کے گورے گورے ہاتھوں پر بڑی مہارت سے تیل بوٹے بنانے لگی تھی۔

”سنا ہے وہ اسلام آباد میں رہ رہا ہے آج کل۔“ چاندنی نے آہستہ سے اس کے کان کے پاس سرگوشی کی تھی۔

”ہوں پتہ ہے۔“ وہ سر جھکائے تیل بنانے میں مصروف رہی تھی۔

”خالد بھی اس کے پاس گئی ہوئی ہے عید منانے۔“

”اچھا اور عابدہ۔“

”وہ اپنے گھر ہے، اپنے سرال۔“

”چلو ہمیں کیا، کوئی جو مرضی کرے۔“ وہ لا پرواہی سے بولی تھی۔

”کوئی..... اب وہ ”کوئی“ ہو گیا۔“

”ہاں جب اپنا نہیں رہا، کسی اور کا ہو گیا تو ہمارے لئے تو غیر ہی ہوا نا۔“ وہ خیالوں میں بے ہوئے ہوئی تھی۔

”چھوڑو پھر اس بے وفا کا خیال۔“ چاندنی کا ایک ہاتھ خوشنما تیل بوتلوں سے بھر گیا تھا، وہ دوسرا ہاتھ اس کے آگے کرتے ہوئے بولی تھی۔

”میں نے کون سا اس کا خیال پکڑا ہوا ہے، چھوڑ ہی تو دیا ہے کب کا، مگر یہ جودل ہے نا پتہ نہیں اس کی کھڑکیاں اتنی مضبوطی سے کیوں بند ہیں لاکھ کوشش بھی کروں تو کھلی نہیں ہیں، میں تو کہتی ہوں یہ کھڑکیاں اک بار کھل جائیں اور اس ظالم کا نام یہاں سے نکل جائے تو مجھے بھی سکون نصیب ہو۔“

”ان کھڑکیوں میں محبت کی میخیں گڑی ہوئی ہیں، یہ آسانی سے کب کھلیں گی۔“ چاندنی نے کہا تھا۔

”ان محبت کی میخوں کو نفرت کی ہتھوڑی سے ہی نکالا جاسکتا ہے بس۔“ وہ اس کے ہاتھ پر پھول بناتے ہوئے بولی تھی۔

”حوری ایک بات پوچھوں؟“

”ہاں ایک چھوڑ کر دس پوچھو۔“

”کیا وہ بھی تم سے محبت کرتا تھا؟“

”پاکل! مجھے کیا پتہ، شاید نہیں، اگر کرتا ہوتا تو یوں چھوڑ جاتا۔“

”تو پھر چھوڑو اس کو، جس کا ابھی تک یہ

نہیں پتہ کہ اسے تم سے محبت تھی بھی یا نہیں، تم بتاؤ وہ نہیال کا قصہ کہاں تک پہنچا۔“ اس نے بات بدلی تھی، حریم جب شیر سے گاؤں آئی تھی تو چاندنی سے ہر بات شیر کرتی تھی اور اس میں بار بار نہال کا ذکر بھی آتا تھا۔

”نہال کا قصہ؟“

”ہاں اور وہ بی بی مشائم کا قصہ کہاں تک پہنچا۔“

”بی بی مشائم کا قصہ کہاں تک پہنچنا تھا، وہ تو گوڑے گوڑے نہال کے عشق میں ڈوبی ہوئی مگر یہ نہال ہی ہے جو اسے لفٹ نہیں کرواتا۔“

”وہ کیوں اتنی نفرت کرتا ہے اس سے۔“

”پیاری سہیلی جب دل پر کوئی چیز نہ جڑے وہ کسی بھی ہو پھر اس سے تا عمر نفرت ہی رہتی ہے، ویسے میں اس کو تجیز لو تو اس کے پاس ایک ہزار ایک وجوہات ہیں مشائم بی بی سے نفرت کی، مشائم تمہیں تو پتہ ہے کسی کلاس سے تعلق رکھتی ہے جس میں لڑکی اور لڑکے کا میل جول عام سی بات ہے، مشائم کی بھی بہت دوستیاں ہیں، ایسے ہی اس کے ایک کلاس فیلو نے اسے اپنے فارم ہاؤس پر بلایا تھا، اور یہ بی بی اپنی عزت کی پرواہ کیے بغیر اس کے پاس پہنچ گئی، وہ تو شکر ہے وہاں کے ملازم نے اس کی عزت بچائی۔“

”اس قصہ کا بھی نہال کو پتہ ہے بس وہ انہی باتوں کی وجہ سے اسے اچھی لڑکی نہیں سمجھتا اور وہ ہے کہ بس اس سے محبت کرتی ہے۔“

”محبت کرتی ہے یا ناگ کرتی ہے۔“

”نہیں نہیں، وہ جیسی بھی ہے اس بات کی گواہی میں دوں گی کہ وہ نہال سے محبت کرتی ہے۔“

”اور آج کل تمہارے ساتھ اس کے

تعلقات کیسے چل رہے ہیں۔“

”بس ایسے ہی ہیں، یوں بھی وہ عید کے بعد اپنے گھر شفٹ ہو جائے گی، پھر تو ہمارا ملنا ملنا بھی کبھی کبھار کا رہ جائے گا۔“

”تم نے یہ تو بتایا نہیں کہ نہال کس کو پسند کرتا ہے۔“

”مجھے بتانے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ تمہیں سب پتہ ہے۔“ حریم نے مہندی والا ہاتھ اس کے بالوں کے ساتھ صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔

”تو تم اس کی محبت قبول کر لو نا۔“ اس کے دونوں ہاتھوں پر بھر بھر کر مہندی لگ چکی تھی، وہ ہاتھوں پر پھونکیں مارتے ہوئے بولی تھی۔

”وہ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔“

”یہاں کسی کو بھی کچھ حسب آرزو نہ ملا کسی کو ہم نے ملے اور ہم کو تو نہ ملا“ اس دنیا کا تو یہ والا حساب ہے۔“ حریم بولی تھی۔

”کانی پرانا شعر ہے۔“ چاندنی مسکرائی تھی۔

”بے شک پرانا سہی، مگر محبت کے سبھی تقاضوں پر پورا اترتا ہے۔“

”یہ اماں اور ان کی فوج کہاں ہے، گھر میں بڑی خاموشی ہے۔“ چاندنی کو باتوں میں پہلے تو احساس نہیں ہوا اب ہوا تو پوچھنے لگی تھی۔

”اماں یہیں کہیں محلے میں کسی کے گھر ہوگی اور فوج بھی ساتھ ہی ہوگی۔“

”اور ابا؟“

”ابا اندر لیٹا ہوا ہے، بلکہ شاید آنکھ لگ گئی ہوگی ورنہ ابھی تک باہر آچکا ہوتا۔“

”گھر میں سکون جو ہے ابا بے چارے کو بھی دو گھڑی سکھ کا سانس لینے دو۔“ چاندنی

”اور آج کل تمہارے ساتھ اس کے



شرارت سے بولی تھی، حریم اس کو گھور کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

موحد عید کی نماز پڑھ کر آیا تو وانیہ بچن میں تیار شیار ہو کر شیر خورمہ بنارہی تھی بلکہ بنا لیا تھا بس اب باؤل میں نکال رہی تھی جب موحد نے پیچھے سے آکر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے خود سے لپٹا لیا تھا اور دھیرے سے اس کے کان میں کہا تھا۔

”عید مبارک جاناں؟“ وانیہ پھول کی طرح کھل اٹھی تھی اور جواب میں اس نے بھی عید مبارک کہا تھا۔

”یہ تم ہی ہو، یا میری نظر کا دھوکہ ہے۔“ وہ کانچ کی ڈھیر ساری چوڑیاں کلائیوں میں سجائے مہندی ہاتھوں پر پرچائے سبز اور سرخ کڑھائی والے سوٹ میں دل میں اتر جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی، ایسے میں تعریف اور توصیف تو اس کا حق بنتی تھی نا۔

”یہ میں نہیں کوئی اور ہے۔“ وہ بھی شرارت سے بولی تھی۔

”پترا!“ اتنے میں اماں موحد کی آواز سن کر بچن میں آکر بولی تھی، وانیہ ایک جھٹکے سے الگ ہوئی تھی اور موحد بھی سنبھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”جی اماں عید مبارک۔“ موحد جلدی سے آگے بڑھ کر اب ماں سے لپٹ گیا تھا، جبکہ وانیہ کو اماں کا اس طرح بے دھوک بچن میں چلے آنا بہت برا لگا تھا، جب سے اماں ان کے پاس رہنے آئی تھیں ان کا کوئی پرائیویسی ہی نہیں رہ گئی تھی، ان کا جب دل کرتا ان کے کمرے میں یا کہیں بھی بے دھوک کھس جایا کرتی تھیں، وانیہ کو بے تحاشا غصہ آتا تھا مگر کیا کرتی موحد کا لحاظ

”پترا چل آباہر عابدہ کو عید مبارک کا فون کر لیں۔“

”ہاں ہاں اماں چلو، عابدہ بھی ہم سے بات کرنے کے لئے بے چین ہو گئی۔“ موحد اماں کو لے کر بچن سے باہر آ گیا تھا، وانیہ کو اس سارے منظر میں اپنا آپ بے حد فضول لگا تھا، وہ اپنے کمرے میں آگئی تھی، کمرے میں آکر اس نے می پاپا کا نمبر ملایا تھا مگر دونوں کا نمبر بند ہی جا رہا تھا، اس کا بھی دل چاہ رہا تھا کہ وہ بھی اپنے ماں باپ کو عید مبارک کہے، مگر یہ سب تو اسے پہلے سوچنا چاہیے تھا جب وقت تھا، اب تو وقت ہی ہاتھ سے پھسل گیا تھا۔

”وانیہ..... وانیہ کہاں ہو بھئی۔“ وہ موبائل ہاتھ میں تھا مگر سم تھی جب موحد باہر سے پکارتا ہوا آیا تھا۔

”یہ عابدہ تم سے بات کرنا چاہتی ہیں۔“ موحد نے اپنا موبائل اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا تھا۔

”السلام علیکم، بھابھی عید مبارک۔“ دوسری طرف عابدہ کی چپکتی ہوئی آواز آئی تھی۔

”وعلیکم السلام، تمہیں بھی عید مبارک۔“ اسے نا چاہتے ہوئے بھی اپنا موڈ ٹھیک کرنا پڑا تھا، پھر تھوڑی بہت ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے فون بند کر دیا تھا۔

”موحد ہم ابھی باہر جا میں گے گھومنے۔“ وہ حتی لہجے میں بولی تھی۔

”ہاں تو ٹھیک ہے، ابھی چلے جاتے ہیں۔“

”اور اماں؟“

”جیسے تم کہو۔“

”انہیں گھر پر ہی رہنے دو۔“

”یار وہ اکیلی بور ہو جائیں گی، انہیں بھی لڑھکتے ہیں۔“ موحد نے آہستہ سے کہا تھا

حالانکہ اس کے دل کی پوری خواہش تھی کہ اماں بھی ان کے ساتھ چلے۔

”نہیں بور ہو میں میرے پاس ان کا بھی حل ہے، انہیں الیاس بھائی کے گھر چھوڑ دیتے ہیں نگہت بھابھی کی کمپنی اماں خوب انجوائے کرتی ہیں۔“ وانیہ نے موحد کے دوست کا نام لیا تھا، نگہت چونکہ گاؤں کی تھی اس لئے اس کی اماں کے ساتھ خوب بنتی تھی۔

”چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔“ وہ اب عید کے دن بیگم صاحبہ کو ناراض بھی نہیں کر سکتا تھا اس لئے مان کر بولا تھا۔

انہوں نے ٹیکسی لی تھی اور پہلے اماں کو الیاس کے گھر چھوڑا تھا اور پھر دونوں وانیہ کی فرمائش پر دامن کوہ کی طرف آگئے تھے۔

دامن کوہ کی طرف جانے والا راستہ پر کشش اور خوشبو بھرا تھا، رمضان میں گرمی نے کڑا کے نکالے تھے مگر عید والے دن گرمی کا زور ٹوٹ گیا تھا اور صبح صبح ہونے والی ہلکی بارش نے موسم اور مزاج دونوں خوشگوار کر دیئے تھے۔

”موحد یہاں رکنا۔“ ایک موٹر مڑتے ہوئے جھاڑیوں کے جھنڈ میں بندروں نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے، وانیہ جو کئی ملکوں میں گھوم چکی تھی مگر جب بھی اپنے وطن کے ایسے حسین تلاء دیکھتی یونہی خوش ہو جایا کرتی تھی، ابھی بھی وہ یہاں ان بندروں کو دیکھنا اور ان کو پتہ کھلانا چاہتی تھی۔

موحد نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہہ کر ٹیکسی رکوا لی تھی، وہ دونوں باہر نکل آئے تھے، یہاں ان جیسے اور بھی منچلے بندروں کی شرارتوں سے محفوظ ہو رہے تھے، وانیہ نے قریب ہی کھڑی ریڑھی سے بھٹے خریدے تھے اور بندروں کو ڈالنے لگی تھی، چھوٹے بڑے بہت سارے بندر اس کے

ارد گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔

”یار کہیں کاٹ ہی نہ لیں۔“ موحد کو تشویش ہو رہی تھی۔

”ہاں ان کے دانتوں کو دیکھ کر تو یہی لگ رہا ہے کہ یہ مجھے کھا ہی جائیں گے۔“ وانیہ نے ہاتھ میں پکڑے سارے بھٹے ان کی طرف اچھال دیئے تھے اور خود ایک اونچی سی جگہ پر بیٹھ گئی تھی۔

”کتنا سکون ہے نا یہاں۔“

”ہاں بہت۔“ موحد بھی اس کے قریب بیٹھ کر بولا تھا۔

”میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ کبھی میں یوں ایسی کسی جگہ پر تمہارے ساتھ اس طرح تنہا بیٹھی ہوں گی۔“

”تم کیا کبھی کوئی بڑی نہیں سوچتی کہ اس کے آنے والی زندگی یوں ہوگی بلکہ بڑی کی کسی لڑکے کو بھی نہیں پتہ ہوتا کہ اس کی زندگی میں کون آئے گا اور کتنا اہم ہو جائے گا۔“

”موحد ایک بات کہوں؟“

”ہاں کہو یار، اس میں سوچنے والی کون سی بات ہے۔“

”تم یونہی مجھ سے محبت کرتے رہو گے نا، مجھے چاہتے رہو گے نا۔“

”میں تمہارے سوا کسی اور کو کیسے چاہ سکتا ہوں، مسئلہ تو تمہارا ہے، تمہاری مجھ سے محبت کم تو نہ جائے گی۔“

”میری محبت۔“ وہ استہزاء سے ہنسی تھی۔

”جس نے گھر دولت شان و شوکت ماں باپ دوست احباب جانے تمہارے لئے کیا کیا نہیں چھوڑا وہ اس محبت کو کیسے کم ہونے دوں گی، اس کے پاس تمہارے سوا اور ہے ہی کیا۔“ وہ اپنے مہندی لگے ہاتھوں کو دیکھ کر بولی تھی۔



”میں تمہارے ساتھ ہوں تمہارے پاس ہوں تو سمجھو سب کچھ تمہارے پاس ہے۔“ وہ اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا تھا۔  
 ”واقعی!“  
 ”ہاں واقعی، چلو آؤ اب چلیں، بے چارا ٹیکسی والا ہمارا انتظار کر رہا ہے۔“  
 ”ہاں چلو۔“ وہ مودعہ کا ہاتھ تھام کر اٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

فرض کرو یہ روگ ہو جھوٹا  
 جھوٹی پیت ہماری ہو  
 فرض کرو اس پیت کے روگ میں  
 سانس بھی ہم پہ بھاری ہو  
 فرض کرو یہ جوگ جوگ کا  
 ہم نے ڈسٹوگ، پاپا ہو  
 فرض کرو بس ہیں حقیقت  
 باقی سب کچھ مایا ہو

چاندنی عید والے دن حریم کی اداسی ختم کرنے کو اسے گاؤں میں لگے عید میلے میں لے گئی تھی، وہ دونوں گول گپے کھا رہی تھیں جب حریم کے موبائل پر نہال نے نظم بھیجی تھی، حریم پڑھ کر مسکرائی تھی، چاندنی نے فوراً تاڑ لیا تھا۔  
 ”کس کا ہے؟“ چاندنی نے گول گپا نگل کر بے صبری سے اسے کہنی مار کر پوچھا تھا۔

”نہال کا۔“ وہ چاندنی سے کیا چھپاتی۔  
 ”اچھا کیا لکھا ہے۔“ چاندنی کٹھے پانی سے چٹخارہ لیتے ہوئے بولی تھی، حریم نے اسے نظم پڑھ کر سنا دی تھی۔

”واہ مزہ آ گیا۔“ چاندنی کو کچھ سمجھ آئی تھی کچھ سر کے اوپر سے گزر گئی تھی۔  
 ”کس کا؟“ حریم نے گول گپوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

”دونوں کا۔“ چاندنی اس کا مطلب سمجھ کر مسکرائی تھی، پھر دونوں ہلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔  
 عید میلے میں حریم سارے گاؤں کی عورتوں اور لڑکیوں سے ملتی تھی، کئی چاچا یا میوں سے تو کافی عرصے بعد ملاقات ہو رہی تھی، سب اس سے بہت خلوص اور پیار سے مل رہے تھے، وقتی طور پر حریم کا بھی دل بہل گیا تھا۔  
 ”آؤ جھولا لیں۔“ چاندنی جھولے والے کو دیکھ کر لپچائی تھی۔

”ارے نہیں یار، ہم کون سا بچے ہیں۔“  
 حریم اب اپنا ایک اسٹیش رکھتی تھی، اسے ایسے بچوں جیسے کام کرتے اب عجیب لگتا تھا۔  
 ”بچے کیوں، ہم جوان ہیں، بوڑھے تو نہیں، آؤ نا۔“ چاندنی اس کا ہاتھ کھینچ کر جھولے والے کے پاس لے گئی تھی، حریم ناں ناں کرتی رہ گئی تھی۔

”آف اگر امیر بنو، یا شہر علوی، صدیقی وغیرہ دیکھ لیں تو حیرانی کے مارے بے ہوش ہیں ہو جائیں۔“ جھولا چل پڑا تھا، حریم نے چاندنی کے کان میں سرگوشی کی گئی۔  
 ”یہ کون ہیں سب۔“ چاندنی اتنے بھاری بھر کم ناموں کو سن کر رہی حیران ہوئی تھی۔  
 ”آفس والے اور ون۔“

”چھوڑو آفس وائس تو۔“ چاندنی نے کہا تھا اور جھولے کے سرے لیتے ہی تھی، حریم کے دل میں جانے کیا آیا تھا اس نے اپنا فون سنبھالا تھا اور گاؤں کے میلے کی جھولے سمیت مودی بنانے لگی تھی۔

☆☆☆

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا، کھڑکیوں پر بھاری پردے گرے ہوئے تھے، ٹائٹ بلب کی روشنی اور اسے سی کی تختی دونوں مل کر کمرے کو بڑا

خوابناک سا ماحول دے رہی تھیں، مشائخ مردوں تک بلا کبل اوڑھے سو خواب تھے، آج عید کا دن تھا مگر اس گھر میں عید کی گہما گہمی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی، عید کی نماز کا کوئی تصور نہیں تھا، صبح سویرے اٹھنے کا کوئی عادی نہیں تھا، عید کی سویاں پکا کر ہسائیوں میں بھیجنے کا یہاں کوئی خیال تک نہیں تھا کہ یہ مڈل کلاس کے چو نچلے تھے، اپر کلاس ان روایتی رسم و رواجوں سے بالند تھی اور اگر کچھ لوگ جانتے بھی تھے تو ایسا کر کے وہ اپنا اسٹیش کم نہیں کر سکتے تھے، بس اتنا فرق پڑا تھا اس گھر کی روٹین میں کہ علوی صاحب اور مسز علوی اپنے شہر اور گھر میں ہی تھے، عید کی وجہ سے انہوں نے بیشتر مصروفیات ترک کر دی تھیں اور جس طرح پر دہی کھر لوٹے ہیں ایسے ہی وہ بھی علوی ہاؤس میں آٹھ گھنٹے تھے، یہ اور بات کہ عید کس طرح منائی جاتی ہے یہ ان کے اپنے طور طریقوں پر منحصر تھا، آج رات کون کے گھر ایک گرینڈ پارٹی کا اہتمام تھا، جسے عید پارٹی بھی کہہ سکتے ہیں اور بزنس پارٹی بھی، ملازمین اسی پارٹی کے اہتمام میں مصروف تھے اور گھر میں جو مین افراد تھے، وہ اپنے کمروں میں نیند کے مے لے رہے تھے۔

مشائخ کی آنکھیں کھلی تو کچھ ہی دن لے کیا رہے بجا رہی تھی، اس نے ایک انگڑائی لے کر خود کو دیکھا، اس نے اپنے سر پر ایک سیاہی لگا کر باؤں کو سینے کے بعد اس نے تپے کے پاس پڑا سیل فون اٹھایا تو اس پر فریڈز کے لاتعداد میسجز تھے ہر کسی نے اپنے اپنے انداز میں عید و ش کی تھی، وہ جلدی جلدی سارے میسجز کھنگالنے لگی تھی، اسے بس ایک نام کی تلاش تھی، مگر وہ نام اس کی لسٹ میں کہیں نہیں تھا، اس کے دل کو ٹھیس پہنچی تھی، گو کہ اس نے

ہاسل سے گھر آتے وقت خود سے عید کیا تھا کہ اب وہ کبھی اس سے رابطہ نہیں کرے گی بس جتنا خود کو گرانا تھا اتنا ہی بہت تھا، مگر اس وقت جب دل بے تاب تھا، بے چین تھا تو کہاں کا وعدہ کہاں کا ارادہ، اس نے موبائل پکڑا تھا اور سب سے دل چھو لینے والا میسج اسے فارورڈ کر دیا تھا، اسے تو مشائخ کو عید مبارک کہنے کی توفیق نہیں ہوئی تھی مگر وہ تو اسے عید مبارک کہہ سکتی تھی۔

”آج رات کو ہمارے گھر ایک بہت بڑی عید ملن پارٹی ہے میں تمہیں اس میں شمولیت کی دعوت دیتی ہوں۔“ اس نے نہال کو میسج کیا تھا اور خود واش روم میں گھس گئی تھی۔

”ایسی پارٹیاں آپ کو ہی مبارک ہوں مشائخ بی بی، کسی کو دعوت دیتے وقت اتنا تو دیکھ لیتے ہیں کہ اس بندے کے تعلقات آپ کے ساتھ کیسے ہیں تعلقات ہیں بھی یا نہیں۔“ وہ واش روم سے واپس آئی تو نہال کا جوابی میسج آیا ہوا تھا۔

”مذتیز کہیں کا۔“ اس نے موبائل فیس سے پیٹیک دیا تھا۔

”چلو شہنم بی بی صبح صبح اسٹنٹ کروانے کا شوق پڑا یا تھا۔“ جو اسٹنٹ کردائی۔“ وہ خود کو لعنت ملامت کرتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئی تھی۔

☆☆☆

چونکہ علوی صاحب اور مسز علوی مریم نے ناراض تھے وہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی منصور سے شادی کرے اس لئے انہوں نے خود سے مریم کو اس عید ملن پارٹی میں انوائٹ بھی نہیں کیا تھا، بلکہ جس طرح مریم دوبارہ ناراضگی کے بعد منصور کے ساتھ چلی گئی تھی اور ماما کو لفٹ نہیں کرا کر گئی تھی اس بات نے تو مسز علوی کو پہلے



سے بھی زیادہ مشتعل کر رکھا تھا اس لئے ان کے لئے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ مریم اور اس کے ہیپنڈ کو بلائیں البتہ مشائے نے فون کر کے مریم کو دعوت دی تھی۔

”جانو! شام کو ہمارے گھر خود ایک چھوٹا سا فنکشن ہے، منصور اور میرے کولیکڑات کھانے پر آرہے ہیں، اس لئے ہم نہیں آسکتے۔“ مریم چونکہ جانتی تھی کہ اس کے ماں باپ اس سے ناراض ہیں اس لئے وہ کیسے جاسکتی تھی اس نے مشائے کو سہولت سے جواب دے دیا تھا۔

”تھوڑی دیر کے لئے آ جاتیں تو اچھا تھا۔“

”اگر ہمارے گھر مہمان نہ آرہے ہوتے تو میں تمہاری آفر بھی نہ ٹھکراتی اور ضرور آتی، لیکن ڈیڑا اب میری مجبوری کو سمجھنا۔“

”اوکے ٹھیک ہے پھر۔“ مشائے نے فون بند کر دیا تھا۔

”کون تھا؟“ منصور نے پوچھا تھا۔

”مشائے!“

”کیا کہہ رہی تھی؟“

”برعید پر ہمارے گھر گرینڈ پارٹی ہوتی ہے اسی میں مجھے اور آپ کو بلاری تھی۔“

”اچھا تو تم نے منع کیوں کیا، ہم چلے جاتے، اپنے مہمانوں کو تو ہم کل بھی بلا سکتے تھے۔“

”ہم کیسے جاتے منصور، ماما اور ڈیڈی آپ کو پسند نہیں کرتے، مجھ سے بھی ناراض ہیں، مجھے صرف مشائے نے بلایا، ان کی طرف سے کوئی انویشن نہیں ملا اس کا مطلب ہے وہ ہمیں نہیں بلانا چاہتے تو پھر ہم کیسے چلے جاتے۔“ وہ ذرا سخی سے بولی تھی۔

”اچھا چلو چھوڑو، تم اپنے گھر کا خیال کرو

اور شام کی تیاری کرو۔“ منصور نے کہا تھا حالانکہ وہ کہہ سکتے تھے کہ مجھ سے شادی کرنے میں مریم سو فی صد تمہارا ہاتھ تھا میں خود ایسا نہیں چاہتا تھا، مگر وہ اس وقت مریم کو کچھ جتنا نہیں چاہتے تھے، مریم کا موڈ بڑی مشکل سے ٹھیک ہوا تھا۔

”ان سے ملو منصور یہ ہیں حرم عباس، میرے بہت ذہین و فطین اسٹوڈنٹ، ابھی حال ہی میں انگلینڈ سے برنس ایڈمنسٹریشن کی ڈگری لے کر لوٹے ہیں۔“ شام کو جب مریم اور منصور اپنے مہمانوں کو ریسو کر رہے تھے تو پروفیسر مشتاق نے اپنے ساتھ آئے جس نوجوان کا تعارف کروایا تھا وہ مریم کو ایک پل میں پہچان گیا تھا، یہ اور بات کہ مسز منصور کا حوالہ اس کے لئے بہت تکلیف دہ تھا، وہ تو ابھی پارک والی پہلی ملاقات کے شمار میں تھا کہ مریم مسز منصور کے روپ میں اس کے تمام سنے تہہ بالا کر گئی تھی۔

”اچھا تو یہ ہیں حرم عباس جس کا تذکرہ مشتاق ہر وقت آپ کی زبان پر رہتا ہے۔“ منصور نے خوشدلی سے حرم عباس سے بغل گیر ہوتے ہوئے مشتاق سے پوچھا تھا۔

”بالکل بالکل اور میں نے تم سے وعدہ کیا تھا نا کہ اس بار حرم عباس کو تم سے ملوانے لازمی لاؤں گا اور دیکھ لو آج عید کے دن میں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔“ مشتاق نے کہا تھا جبکہ مریم مسز مشتاق کو لے کر سنگ ایریا کی طرف آگئی تھی حالانکہ وہ بھی ایک نظر میں ہی اس شاساچرے کو پہچان گئی تھی۔

”بہت اچھا کیا، آئیے نا بیٹھے ہیں کیا ساری باتیں یہیں کھڑے کھڑے کر لی جائیں گی۔“ منصور انہیں لے کر بیگمات کے پیچھے آگئے تھے۔

”حرم عباس نے یہاں پاکستان میں لیڈر کا کاروبار شروع کیا ہے۔“

”اچھا! تو حرم عباس کیسا تجربہ رہا؟“

”جی بہت اچھا، ایسے ہی لوگ کہتے ہیں پاکستان میں کاروبار کے مواقع نہیں جبکہ میں کہتا ہوں کہ پاکستان میں کاروبار کے بہت مواقع ہیں، اپنے وطن کی تو بات ہی نہیں ہے اور پھر جو مزہ اپنے ملک میں اپنے لوگوں کے ساتھ کام کر کے آتا ہے وہ کہیں اور کہاں۔“

”ویری گڈ، بہت اچھے خیالات ہیں آپ کے، اگر ہمارے ملک کا ہر جوان ایسے ہی سوچنے لگے تو پھر پاکستان بہت جلد ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا ہو سکتا ہے۔“ منصور نے حرم عباس کے خیالات کو سراہا تھا، حرم عباس ان سے باتیں بھی کر رہا تھا اور ذرا فاصلے پر بیٹھی ہوئی خواتین میں گھری مریم پر بھی ایک نظر ڈال لیتا تھا، حالانکہ وہ نظری کی یہ چوری کب چاہتا تھا مگر نظر بھی کہ بھٹک بھٹک کر ادھر ہی جا رہی تھی، مریم نے بھی اتنے فاصلے سے اس کا دیکھنا ٹھوس کیا تھا، یہ چونکہ خالصتاً فیملی فنکشن تھا اس لئے سب اپنے تھے ایک فیملی کی طرح تھے، اتنے میں ہمارا سنی بھی باہر سے آگئے تھے ان کے ساتھ ان کے ہی ہم عمر دو تین مہمان بچے تھے، گزرا تو آتے ہی مریم کے ساتھ چٹ گئی، ادھر حرم عباس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

”اف محبت بھی ہوئی، دل بھی آیا تو کس پر دو بچوں کی اماں جان پر۔“ وہ خود ہی دل میں ایک مذاق اڑاتے ہوئے سوچنے لگا تھا، پھر ملازمین نے کھانا سرو کرنا شروع کر دیا تھا، کھانا بہت مزیدار تھا اور بڑے پر تکلف ماحول میں کھایا گیا تھا۔

”بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ منصور اور مریم مہمانوں کو سی آف کرنے کے لئے ایک بار پھر اکٹھے کھڑے تھے جب منصور حرم عباس سے

ملا تو اس نے نہایت شائستگی سے کہا تھا مریم کو صاف لگا تھا کہ اس نے اسے ہی سنا ہے۔

”مجھے بھی بہت خوشی ہوئی حرم عباس آپ سے مل کر۔“ منصور نے بھی الوداعی کلمات کہے تھے۔

”پھر آپ کب ہمارے غریب خانے کو رونق بخش رہے ہیں۔“ حرم عباس نے پوچھا تھا۔

”جب آپ کہیں؟“

”اوکے تو پھر ہم لوگ جلد ہی ملیں گے۔“ حرم عباس منصور سے مل کر رخصت ہو گیا تھا، مریم بھی آخری مہمان کو سی آف کرنے کے بعد اندر آ گئی تھی، ٹھکن ہی اتنی زیادہ ہو گئی تھی بچے اور منصور بھی بہت تھک گئے تھے۔

مریم نے بچوں کو پیچھ کر دیا تھا اور سونے بھیج دیا تھا، پھر ملازمین کو پچھلاوا سینے کے لئے کچھ ہدایات دی تھیں اور خود منصور کے پیچھے اپنے بیڈ روم میں آگئی تھی، عید کا دن اپنے پیچھے اچھی یادیں چھوڑ کر رخصت ہوا تھا۔

☆☆☆

”ابا میں نے کہا نا مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔“ حرم باب کی بات پر اچھل پڑی تھی۔

”تو پھر کب کرنی ہے، یہی تو عمر ہوتی ہے لڑکیوں کو شادی کی۔“ لبتی بیگم کے سر سے ایک لاکھ روپے کا خمار اتر گیا تھا، اس لئے دن بدن حرم کے ساتھ اب اس کا لہجہ بھی تنگھا ہوا رہا تھا، وہ اندر آ کر اس کے سر پہ کھڑا ہو کر بولی تھی۔

”مجھے نہیں پتہ کب کرنی ہے، بس ابھی نہیں۔“ حرم نے لبتی بیگم کو جواب دیا تھا۔

”اور ابا یہ بات آپ سے کہتے ہوئے مجھے کچھ اچھا تو نہیں لگ رہا مگر اماں اپنے جس بیٹے کے ساتھ میری شادی کرنا چاہ رہی ہیں، وہ میرے قابل ہے کیا، بے کار، بے روزگار، ان



پڑھ اور آوارہ بس وہی میرے لئے رہ گیا ہے۔“  
 ”اے بی بی زبان کو کچھ لگام دو، جتنا کچھ تم نے میرے پیچھے کے بارے میں کہہ دیا ہے اتنا برا نہیں ہے وہ، تم کو چاہتا ہے، پسند کرتا ہے اسی لئے تم سے شادی کرنا چاہتا ہے ورنہ میرے خوبرو اور جوان جہاں پیچھے کے لئے ایک سو ایک رشید۔“ لہٰذا بیگم پیچھے کے بارے میں اس کی گل افشائیاں سن کر تڑپ اٹھی تھی۔  
 ”اچھا یعنی کہ آپ کا بھتیجا مجھ سے شادی کر کے میرے پر احسان کرنا چاہتا ہے۔“ حریم نے طنز سے کہا تھا۔  
 ”جوری اماں ہے تمہاری، تمہارا بھلا ہی سوچے گا نا۔“ ابا نے اس ساری بحث میں برائے نام ماں کے ڈر سے حصہ لے کر کہا تھا۔  
 ”ہاں جانتی ہوں کتنا بھلا سوچتی ہیں یہ میرا۔“ حریم منہ ہی نہ بڑبڑاتی تھی۔  
 ”دیکھ لیا نا اپنی لاڈلی کوسر پر چڑھانے کا انجام۔“ جب حریم پر بس نہ چلا تو اماں نے اپنی توپوں کا رخ ابا کی طرف موڑ لیا تھا۔  
 ”میں سمجھاؤں گا اسے، تم فکر نہ کرو۔“ ابا کو پھر بھی اپنی بیگم صاحبہ کی فکر تھی۔  
 ”ہونہہ! سمجھاؤں گا، تمہاری تو جیسے بڑا سن لے گی۔“

”ویسے تمہیں کیا سوجھی ابھی اس کی شادی کی، اس کی کون سا عمر نکلی جا رہی ہے، گھر کے لئے اچھا خاصا کماری ہے وہ۔“  
 ”تو تو حید کون سا اس کی نوکری چھڑوا دے گا، وہ تو کہہ رہا تھا پھپھو جیسے وہ نوکری کرتی ہے کرتی رہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“  
 ”ہاں اسے کیا اعتراض ہوگا، خود تو ویلا نکما ہے، بیوی کی کمائی ہی کھائے گا آخر۔“ حریم جو کمرے سے باہر نکل گئی تھی، اماں کی بات سن کر

اس نے ایک بار پھر کمرے میں انٹری ماری تھی۔  
 ”زیادہ بکواس نہ کر، اپنا کاروبار کرتا ہے۔“ شوہر کے سامنے لپٹی نے پیچھے کی دھاک بٹھانا چاہی تھی۔

”کاروبار..... ہاں سارا دن کبوتر اڑاتا ہے، کبوتروں کا کاروبار کرتا ہے، بڑا منافع بخش کاروبار ہے، گھر کی چیزیں بھی بیچ کر لوگ اس کاروبار پر لگا دیتے ہیں۔“ حریم نے کہا تھا اور دھپ دھپ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگئی تھی اور چھت پر بھی اپنی چارپائی پر آکر لیٹ گئی تھی، پیچھے لپٹی بیگم اسے گالیوں سے نوازنے لگی تھیں، ابا بیگم کو چپ نہیں کروا سکتا تھا نہ ہی بیٹی کے پیچھے جا کر اپنی شامت بلوا سکتا تھا اس لئے چپ چاپ کان لیٹ کر گھر سے ہی باہر نکل گیا تھا۔

کھلی چھت پر تازہ ہوا چل رہی تھی، حریم کا دماغ اماں کی باتوں سے بچنے والا ہو گیا تھا اس نے چارپائی پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لئے تھے اور پھر سفید دودھیانکے پر سر رکھ دیا تھا۔  
 ”یا اللہ! میرے نام کا تارہ کہاں ہے۔“ وہ تاروں بھرے آسمان پر اپنے نام کا اک تارہ تلاش کرنے لگی تھی، مگر وہ تارہ اسے مل کے نہیں دے رہا تھا، جانے کہاں کھو گیا تھا۔

☆☆☆

یہ پہلی عید تھی جو شیریں اور عماد نے وانیہ کے بغیر منائی تھی، شیریں تو سارا دن بستر سے ہی نہیں اٹھ پائی تھی، اس نے بیٹی کے دفائی کا غم دل سے لگا لیا تھا، عید کا سارا دن بھی روتے دھوتے ہی گزارا تھا۔

”شیریں تم وانیہ کو اتنا مس کر رہی ہو تو اس سے بات کر لو، اگر ہم اپنی اولاد کے بغیر نہیں رہ سکتے تو ہمیں ہی جھک جانا چاہیے۔“ عماد نے شیریں کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اپنے

سارے اصول توڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔  
 ”نہیں عماد، میں یوں سک سک کر مر جاؤں گی مگر وانیہ کو نہ تو معاف کروں گی اور نہ ہی زندگی بھر اس سے بات کروں گی۔“ وہ ضدی لہجے میں بولی تھی۔

”پاؤں چھوڑ دو یا پھر اس کا خیال، مگر تم نہ تو ضد چھوڑتی ہو اپنی اور نہ ہی بیٹی کو بھلاتی ہو۔“

”کیا کروں، دونوں چیزیں میرے بس میں نہیں ہیں۔“ وہ پھر سک اٹھی تھیں۔

”دیکھو میں تمہیں یہاں لے آیا ہوں، میں نے تمہاری خاطر شہر تو کیا ملک ہی چھوڑ دیا ہے، صرف اور صرف تمہیں بھلانا کو، پھر تمہارا دل کیوں نہیں بھلتا ہے۔“

”بھل جائے گا، اس دل کا ایک دن بھلنا ہی ہوگا۔“ شیریں نے ایک عزم سے کہا تھا یہ اور بات کہ ایسا عزم وہ روزانہ کرتی تھی اور روزانہ توڑتی تھی، پھر وہ ایک دم بستر سے اٹھی تھی اور شیشے کے سامنے کھڑی ہو کر اپ اسٹک لگانے لگی تھی، اپ اسٹک لگانے کے بعد اس نے بال بنائے تھے۔

”چلیں آئیں باہر گھومنے چلتے ہیں۔“ وہ عماد کی بانہوں میں نہیں ڈال کر تیار ہوئی تھی، کبھی بھی تو عماد کو وہ پاگل لگنے لگتی تھی۔

”ہاں چلو۔“ وہ سب کچھ بھول کر اسے لے کر باہر نکل آیا تھا۔

”کاش ہمارا کوئی اور بچہ ہوتا۔“ شیریں نے چلتے چلتے کہا تھا۔  
 ”وہ کیوں؟“

”ایک نے خیال نہ کیا، دوسرا تو ہمارا خیال کرتا۔“

”یہ سب سوچنے اور کہنے کی باتیں ہیں، اگر دوسرا بھی نہ کرتا تو۔“

”نہیں عماد ایسے مت کہو، میری ساری اولاد ایک جیسی کبھی نہ ہوتی۔“  
 ”اچھا چلو آؤ آؤ اس کریم کھاتے ہیں۔“ عماد نے ایک جگہ رک کر کہا تھا۔  
 ”اتنی سردی میں۔“

”ہاں اتنی سردی میں تو آؤ اس کریم کھانے کا مزہ آتا ہے۔“

”مگر وہ تو جوان لوگوں کو آتا ہے، ہم بوڑھے کہیں سردی سے ہی نہ ٹھنڈے جائیں۔“

”ارے یہ کیا شیریں عماد اپنے آپ کو بوڑھا کہہ رہی ہے، جو اتنی اپ تو ڈیٹ رہا کرتی تھی کہ لوگ اسے بیس سال چھوٹا سمجھتے تھے، وہ شیریں عماد۔“ عماد حیران ہوا تھا۔

”ہاں وقت بڑے بڑوں کو بدل دیتا ہے۔“

”چھوڑو یہ فرسودہ باتیں، ہم کوئی بوڑھے وڑھے نہیں ہوئے، تم آؤ آؤ اس کریم کھاتے ہیں۔“ عماد اس کا ہاتھ کھینچ کر آؤ اس کریم پارلر کی طرف بڑھ گیا تھا۔

(جاری ہے)

ابھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیں

ابن انشاء

- ☆ اردو کی آخری کتاب.....
- ☆ شمار گندم.....
- ☆ دنیا گول ہے.....
- ☆ آوارہ گرد کی ڈائری.....
- ☆ ابن بطوطہ کے تعاقب میں.....

☆☆☆



# محبت میں سوز و گداز

ریحانہ آفتاب



4/2/2

”امر! کہاں ہو؟“ آواز کے ساتھ ہی کمرے کا دروازہ غلٹ میں کھلا تھا، وہ جو کارپٹ پر پیش اپ کر رہا تھا، رک گیا مگر پوزیشن برقرار رکھی۔

”آج جاگنگ کو نہیں گئے، خبر تھی کمرے میں ہی اٹھک بیٹھک ہو رہی ہوگی۔“ وہ یہہہ غلٹ میں اس کے بیڈ پر بیٹھ گئی، اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”یہ آج تم جاگنگ کو کیوں نہیں گئے؟“ کہتے کے ساتھ ہی اس کا بیڈروم بھی ٹھیک کرتی جا رہی تھی۔

”نصیب دشمنان آنکھ نہیں کھلی۔“ مجبوری بتائی۔

”اسی لئے کمرے میں اٹھک بیٹھک ہو رہی ہے۔“

”اب آپ اسے کچھ بھی کہہ لیں لیکن ایکسر

سائز اور میں لازم و ملزوم ہیں۔ وہ بدستور مصروف تھا، پسینے کے قطرے پیشانی پر چمکنے لگے تھے۔

”ماشاء اللہ باڈی تو واقعی قابل رشک ہو رہی ہے، اس بار بھی کانٹیسٹ میں پہلی پوزیشن کی ہوگی۔“ وہ یہہہ توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے بیڈ شیٹ جھاڑ رہی تھی۔

”ذرا نوازی ہے، آپ کی۔“ وہ مسکرایا۔

”بہت باتونی ہو تم، اتنی غلٹ میں تم سے ایک بات کرنے آئی تھی، وہ بھی بھلا دی۔“ اسے اچانک یاد آیا کہ وہ اس سے ضروری بات کرنے آئی تھی۔

”اتنی تیز رفتاری سے آپ مجھ سے کوئی بات کرنے ہی آ سکتی ہیں، کیسے ہمہ تن گوش ہوں۔“ لہجہ اب بھی شرارت تھا۔

”ابھی ممکا کا فون آیا ہے، میری بہن

## مکمل ناول



4/2/2



مینا بل، دو پہر کی فلائٹ سے آرہی ہے، تم اسے  
پک کر لو پلیز۔“ وہ جو مسلسل پیش اپ کر رہا تھا،  
دھڑام سے زمین بوس ہو گیا۔

رہے ہو۔“ کمر پہ ہاتھ ٹکا کر اسے مصنوعی خشکی سے ٹھونسنے لگی۔

”بھیا جی، سنا ہے آپ کی آدمی گھر والی آ رہی ہیں؟“ بریڈ پہ بٹر پھیلاتے ہوئے شوخی سے

امروز کی طرف رخ کر کے ہدایت کرنے لگا، وہ  
سعادت مندی کا عظیم مظاہرہ کرنے لگا۔



”ہاں یہ صحیح رہے گا دیے بھی مجھے مینا بل کی پسند ناپسند پتا ہی نہیں ہے۔“ ودیہہ کو افسوس ہوا۔  
”بیٹھے میں کیا بناؤں؟“ اب اگلہ مرحلہ سامنے تھا۔

”پڈنگ تو سب ہی شوق سے کھا لیتے ہیں، ساتھ ہی فروٹ سیلڈ۔“ چائے کا آخری سیپ لے کر پیالی رکھ دی۔  
”چلو ہو گی مشکل آسان، ابھی تک رشیدہ نہیں آئی، صفائی کب ہو گی؟“ ودیہہ فکر مندی سے گھڑی دیکھ رہی تھی۔

”ریلیکس بھابھی، آپ اتنی فکر مند کیوں ہو رہی ہیں؟“ اسے حیرانی ہو رہی تھی، کیسی بہن تھی جس کی پسند ناپسند تک ودیہہ کو پتا نہیں تھی۔

”پہلی بار مینا بل آ رہی ہے کیسے فکر مند نا ہوں، اصل میں میری اور اس کی عمر میں چھ سال کا فرق ہے، پھر وہ شروع سے نانو کے پاس رہی کبھی کبھی اس سے بات ہو جاتی تھی مگر اپنی دوستی نہیں ہم میں جیسی اور بہنوں میں ہوتی ہے، شاید عمر کا گیپ ہے یا دوری، لیکن خونی رشتہ ہے، محبت تو ہے اس سے۔“ ودیہہ نے اب کے تفصیل سے جواب دیا، جس میں اس کے کئی سوالوں کے جوابات تھے، امر دز کو بھی نشانی ہوئی ودیہہ کی بوکھلاہٹ بے جا نہیں تھی، آخر کو آٹھ سال بعد دونوں مل رہی تھیں اور پہلی بار مینا بل ان کے سسرال آ رہی تھی، وہ چاہتی تھی سب کچھ بہت اچھا ہو۔

”کچھ چیزیں بازار سے لانی ہیں، رکو میں لسٹ بنا کر لانی ہوں، کرم خان کو بازار بھیج دو تو چار گھنٹے گزر کر آتا ہے۔“ وہ جواٹھنے کی تیاری کر رہا تھا پھر بیٹھ گیا، ودیہہ فوراً لسٹ لے آئی تھی، وہ بازار کو ہولیا، بازار میں کچھ زیادہ ہی وقت لگ گیا تھا، سامان سے لدا پھندا لوٹا تو ملازمہ آچکی تھی

اور آدمی صفائی بھی ہو چکی تھی۔

”بڑی دیر کر دی امر۔“ ودیہہ چیزوں پہ اک نظر ڈال کر اس کے چہرے پہ نظر ڈالنے لگی، جہاں بے زاریت تھی۔

”بازار جا کر احساس ہوتا ہے واقعی ملک کی آبادی بڑھ گئی ہے، دوکاندار عورتوں کے مقابل مردوں کو گھاس بھی دیر سے ڈالتے ہیں۔“ وہ کم بھنایا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔

”اچھا تم تیار ہو جاؤ، فلائیٹ کا وقت ہونے والا ہے۔“ ودیہہ نے اس کی توجہ گھڑی کی سویوں کی طرف دلائی۔

”میں شاور لینے جا رہا ہوں، کپڑوں سے گوشت پھلکی کی اسمیل آرہی ہے۔“ منہ بنا کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

فلائیٹ آچکی تھی، پنجر کسٹم سے کلیئر ہو کر آنے لگے تو وہ بھی مینا بل واحد کے نام کی تختی لئے کھڑا ہو گیا، صورت تو پہلے بھی دیکھی تھی، لیکن اسے یقین تھا جو بھی ڈری تھی، آچل کو سر پہ لئے ہاتھوں سے دبوچے برآمد ہو گی، وہی ودیہہ کی بہن ہو گی، جتنی مشرقی ودیہہ تھی اس کی بہن کو بھی کم و بیش ویسی ہی ہونی چاہیے، کافی لوگ نکل آئے تھے مگر اس کی مطلوبہ چیز نہیں نکلی۔

”کہیں محترمہ جہاز میں ہی تو نہیں رہ گئیں۔“ اسے کوفت ہونے لگی۔

”یہ مغربی ملک کی اندھی تقلید کرتے جاہل لوگ۔“ غصے سے نظر ہٹا کر اس نے دوسری طرف نظر ڈال لی، اک لڑکا اور لڑکی ساتھ نکلے تھے، لڑکی نے پیچ کر ٹی شرٹ اور بلیک جینز پہن رکھی تھی، لڑکے نے ریڈ ٹی شرٹ اور بلو جینز چڑھائی ہوئی تھی، لڑکے کا بازو لڑکی کی کمر کے گرد تھا، دونوں چہروں مہروں سے اشیائی لگ رہے

تھے مگر ان کا انداز مغربیت لئے ہوئے تھا۔  
”ہیلو! می مینا بل واحد۔“ وہی اور نچ شرٹ والی اس کے نزدیک آکر بولی، وہ جو منہ پھیرے کھڑا تھا حیرانگی سے اسے دیکھنے لگا، کیا تصورات کی دجیاں بکھری تھیں۔

”ہیلو!“ مینا بل واحد نے اپنا مرمیں سا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تھا، اتنی دیر میں وہ خود کو سنبھال چکا تھا۔

”السلام علیکم!“ ہاتھ سینے پہ باندھ کر اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر کے کہا۔

”وعلیکم، وعلیکم! یہاں کے لوگ پتا نہیں کیوں ہاتھ ملانے کو میووب سمجھتے ہیں، ڈزن میٹر، آئی تھک یو آر امروز۔“ اپنے ہاتھوں کو جینز کی جیبوں میں چھس کر بولی، وہ یہاں اور وہاں کی اس کی غلط فہمی بڑی اچھی طرح دور کر سکتا تھا مگر اس بکڑی حسینہ سے بات کرنے کے لئے نا پہلی ملاقات موضوع تھی نا جگہ۔

”امریہ وقاص احمد ہیں پلین میں میرے ہم سفر تھے۔“ ساتھ کھڑے بندے کا تعارف کرانے پہ امر دز نے ہاتھ بڑھایا، جسے وقاص احمد نے تمام لیا۔

”خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ وقاص نے اخلاق نبھایا، امر دز نے کچھ نہیں کہا مگر اس کے تاثرات سے صاف عیاں تھا اسے زرہ برابر خوش نہیں ہوئی تھی۔

”اوکے مینا ڈیر، میں چلا، کانیکٹ رکھنا۔“ وقاص ہاتھ ہلاتا چلا گیا۔

”مس یو۔“ مینا بل واحد نے بھی جواباً الوداعیہ انداز اپنایا، اس بے تکلفی پہ تو اس کی جان ہی جل گئی، یعنی حد نہیں، لاہور سے کراچی تک کے اک ہم سفر کے ساتھ اتنی بے تکلفی۔  
”چلیں۔“ اس نے بادل خواست کہا، سامان

ڈکی میں رکھ کر وہ ڈرائیونگ سیٹ پہ آ گیا، وہ پہلے ہی فرنٹ سیٹ پہ براجمان تھی۔

”دیدی اور جیو کیسے ہیں؟“ اسے اک اور بار پھر جھٹکا لگا تھا۔

”آپ کی آپنی بالکل ٹھیک ہیں۔“ آپنی پہ زور دیا۔

”کیا کرتے ہو؟“ سیٹ کی پشت سے سر نکاتے ہوئے اگلا سوال ہوا۔

”اف یہ بے تکلف محترمہ۔“ وہ جی بھر کر بھنایا۔

”تارے گنتا ہوں۔“ جل کے کہا۔

”بائی داوے کس کی یاد میں؟“ راز دانہ انداز میں قریب کھسک آئی تو وہ پہلو بدل کے رہ گیا۔

”ایسا کوئی نہیں ہے جس کا میری یادوں میں گزر ہو۔“ وڈا اسکرین کو دیکھتے ہوئے کہا اور اسپنڈ بڑھا دی، جلد سے جلد اس بلا سے پیچھا چھڑانا مقصود تھا۔

”ہوں، چلو کوئی بات نہیں، پڑھ رہے ہو یا پڑھ چکے؟“ اگلا سوال ہوا، غالباً محترمہ خاموش رہنا نہیں جانتی تھیں۔

”مڈل مل ہوں۔“ منہ بنا کر کہا۔

”اوہ لگتے تو نہیں ہو۔“ افسوس بھری آواز سے کہا اور نظر بھر کے دیکھا، اس نے خاموشی میں عافیت جانی۔

”احمر کیسا ہے؟“ ہیر کٹ بالوں کو اداے بے نیازی سے جھٹکا دیا۔

”بہت کیوٹ ہے۔“ بھیجے کے لئے لہجہ میں پیارا مڈ آیا۔

”تم تو خامے چیخ ہو گئے ہو، دیدی کی شادی کی تصویریں میں نے دیکھی ہیں، بہت بدل گئے ہو۔“ وہ اس پہ تفصیلی نظر جمائے بیٹھی



تھی۔

”چنچ تو آپ بھی اپنی آپنی سے بہت لگ رہی ہیں۔“ وہ اپنی ناگواری چھپانا پایا، مگر شاید وہ اپنے حال میں مست رہی تھی، اس لئے اس کی بے زاری محسوس نہ کر سکی۔

”ہر کوئی یہ ہی کہتا ہے، اب تو عادی ہو گئی ہوں، جب سے پاکستان آئی ہوں دیدی کے سکھراپے اور مشرقیت کا سن کر مجھے تو ضد ہو گئی کہ دیدی سے ملتا ہے، اس لئے چلی آئی، نا تو بتاتی ہیں دیدی پانچ سال امریکہ میں رہیں پھر بھی جانے کیوں دیدی مجھ جیسی نا بن سکیں۔“

”آپ کی منطق الٹی ہے، بھابھی کی طرح ہونے کی بجائے آپ افسوس کر رہی ہیں کہ وہ آپ جیسی کیوں نہیں۔“ لہجہ مستحضرانہ تھا، گاڑی سٹپل پر رک جی تھی۔

”یہاں کی ٹرینک اف تو ہے۔“ وہ گاڑیوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”اک بات سن لیں، میں اپنے ملک کی برائی ذرا بھی نہیں سن سکتا، آپ برائی کریں گی تو مجھے غصہ آئے گا اور شاید آپ مائنڈ کر جائیں، ہم جیسے بھی ہیں ہمارا ملک جیسا بھی ہے، لیکن مجھے محبت ہے پاکستان سے جان دینے کی حد تک اور میں اس کے خلاف کچھ نہیں سن سکتا۔“ وہ سختی سے گوش گزار کر رہا تھا۔

”اوکے..... اوکے تم فیر لوز نا کرو، میں برائی نہیں کر رہی۔“ اس کے بگڑے موڈ کو دیکھ کر کہا تو وہ لب بچھ گیا۔

”میوزک پی پلے کر دو۔“ غالباً اسے خاموشی سے نفرت تھی۔

”میوزک سسٹم خراب ہے؟“ اس نے جھوٹ کہہ دیا۔

”اسکون سے گزر رہے کہ وہ پھر بول پڑی، اس کا دل چاہ رہا تھا گاڑی کسی پول سے ٹکرا دے۔

”کبھی سوچا نہیں، لیجئے آپ کی منزل آ گئی۔“ اس نے کھر کے آگے گاڑی روک کر سکون کا سانس لیا، ہارن پر کرم خان نے دروازہ وا کر دیا، وہ زن سے کار پورچ کی طرف لے گیا، ودیہہ استقبال کے لئے نکل آئی تھی۔

”ہائے دیدی!“ ودیہہ کو دیکھتے ہی وہ سر پٹ دوڑی، کار کا دروازہ بند کرتے اس نے ناگواری سے اس کی حرکت کو دیکھا تھا۔

”ہائے دیدی، کتنی پیاری ہو گئی ہو۔“ ودیہہ کو زور سے پیچھے چناٹ کئی پیار کر ڈالے۔

”تم بھی ماشاء اللہ بہت خوبصورت لگ رہی ہو، آنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی؟“ ودیہہ نے اس کے ویسٹرن جلیے کو اک نظر دیکھ کر نظیر انداز کر دیا، جبکہ وہ خود شلوار سوٹ میں دوپٹا سلیپتے سے لئے کھڑی تھی۔

”ارے نہیں دیدی، کوئی دقت نہیں ہوئی، امر اور رنجو کہاں ہیں؟“ وہ اطراف میں نگاہ دوڑا رہی تھی۔

”امرا اسکول سے آنے والا ہے، اسفر آفس میں ہیں آج اہم میٹنگ تھی اس لئے تمہیں ریسیو کرنے نہیں جاسکے۔“ ودیہہ اسے لئے اندر کی طرف جانے لگیں۔

”بھابھی میں آفس جا رہا ہوں۔“ اس نے جاتی ہوئی ودیہہ کو مخاطب کیا۔

”ہائیک، آج تو تم نے چھٹی ماری تھی۔“ ودیہہ رک گئی تھی۔

”بس یونہی مذاق کیا تھا اوکے۔“ وہ پلٹنا چاہ رہا تھا۔

”تمہارے کہنے پر بریانی بنائی ہے، کم از کم وہ تو کھاتے جاؤ۔“

”بھابھی آفس میں لچ کر لوں گا۔“ وہ رکنا نہیں چاہ رہا تھا، وہ خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہی تھی۔

”بالکل نہیں لچ کر کے جاؤ، میں اسفر کے لئے بھی لچ بیج رہی ہوں چلو اندر۔“ ودیہہ کے اصرار پر وہ اک نظر مینائل پہ ڈال کے آگے بڑھ گیا۔

”کون سے آفس میں کلرک ہو؟“ مینائل کے سوال نے اس کے بڑھتے قدم روک لئے، اس کا دل بے ساختہ چاہا اس کے ماتھے پہ برا سا سوالیہ نشان بنادے۔

”کلرک!“ ودیہہ نے تھیر سے دہرایا تو امر و کو مسکراہٹ چھپانے کے لئے سر جھکاتا پڑا۔

”مینا، کون کلرک ہے؟“ ودیہہ ابھی تک حیرت کے سمندر میں غرق تھی۔

”امرا، اور کون؟“ ڈل فیل کو کلرک کی ہی جانب مل سکتی ہے نا۔“ اس نے افسوس بھرے انداز میں کہا، ودیہہ کی ہنسی بے ساختہ تھی، وہ بھی تھیر مد کی ذہانت پہ مسکرا دیا، کیا دور کی کوڑی لائی تھیں۔

”تم سے کس نے کہا، ڈل فیل ہے یہ۔“ ودیہہ نے امر و کے کان پکڑ لئے، وہ اس کی شرارت سمجھ گئی تھی۔

”امر نے۔“ پیٹڈ بیگ شولڈر سے اتار کر بولی۔

”بے وقوف بنایا ہے اس نے تمہیں، ایم بی اے کا ایگزٹم دے کر رزلٹ کا ویٹ کر رہا ہے اور جتنا یہ پڑھا کو ہے اسی حساب سے ہر بار پوزیشن بھی لیتا ہے ہم سب کو پوری امید ہے کہ اس بار بھی اس کی پوزیشن بنے گی، کیوں بنے گی نا؟“ ودیہہ نے کان کھینچے، وہ حیرت سے منہ کھولے کھڑی رہ گئی۔

”بھابھی درد کر رہا ہے۔“ اس نے کان چھڑایا۔

”میں اتنی دیر سے افسوس کر رہی تھی کہ اگر پڑھا لکھا ہوتا تو اس کی شخصیت کو چار چاند لگ جاتے، دیدی تمہارا دیور گڈ لکنگ مینڈم اور چارمنگ پرسنالی رکھتا ہے۔“ اس کے فرامنے سے کہے گئے، تعریفی جملوں نے اس کے چہرے پہ سرخی دوڑ گئی، ودیہہ نے منظر کو مسکراہٹ کے ساتھ شوخ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”اب سیر سے سوایر لکرایا ہے۔“

”یہ سیر سوایر کیا ہوتا ہے بھئی۔“ وہ بور کھڑی تھی۔

”کچھ نہیں تم چلو فریش ہو جاؤ۔“ وہ یہ اسے لے کر اندر جانے لگیں امر و پہلے ہی جا چکا تھا، امر بھی اسکول سے آ گیا تو وہ سچ کے لئے ڈائننگ ٹیبل پہ آ گیا۔

”ہائے دیدی، اتنی مرچیں، اف امر پانی دو پلیز۔“ بریانی کا پہلا چھچھ لیتے ہی وہ ہائے اوائے کرنے لگی آنکھوں میں مونے مونے آنسو آ گئے، اس نے خاموشی سے گلاس بڑھا دیا۔

”مجھے کیا خبر تھی تم مرچیں بالکل نہیں کھاتیں، یہ امر کو تو تیز مرچیں اچھی لگتی ہیں، سب ہی کھا لیتے ہیں، اچھا ٹھہرو میں تمہارے لئے کچھ اور بنالائی ہوں۔“ ودیہہ اٹھنے لگی۔

”ارے نہیں دیدی، اس کی ضرورت نہیں، یہ فروٹ سیلڈ ہے نا، میں اس سے کام چلا لوں گی۔“ سوسوں گرتے اس نے فروٹ سیلڈ کی طرف ہاتھ بڑھایا، ساتھ ہی امر کو دیکھنے لگی جو منہ بھر بھر کے کھا رہا تھا اور تو اور امر بھی، یعنی چاچو تو چاچو بھتیجا بھی بھان اللہ۔

”تم اپنی فیورٹ ڈشز بنا دو ڈنر پہ وہی بنا دوں گی۔“ ودیہہ متفکر نظر آ رہی تھیں کہ وہ کیسے



فروٹ سیلڈ سے پیٹ بھرے گی۔

”مجھے چائینز ڈسز پسند ہیں۔“ اس نے کھٹے میٹھے فروٹ کا مزہ لیتے ہوئے کہا، فروٹس کی مٹھاس نے منہ کی جلن کو ختم ہونے میں مدد دی تھی۔

”اوہ! مجھے تو ذرا بھی اچھی نہیں لگیں، یہ بریانی کتنے مزے کی ہے، آپ بھی کھائیں نا۔“ اس کی بات پہ احمر نے اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی۔ ”تمہیں مرچیں نہیں لگ رہیں؟“ میناگل نے تعجب سے پوچھا۔

”کچھ خاص نہیں۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔

”چاچو جان مجھے بھی تو کھلائیں نا، خود ہی کھا رہے ہیں۔“ وہ ٹھنکا۔

”تو اتنی دور کیوں ہو، آ جاؤ چاچو جان کے پاس۔“ ہاتھ بڑھایا تو وہ فوراً اپنی سیٹ چھوڑ کے اس کے پاس چلا آیا اور اس کی گود میں چڑھ کے بیٹھ گیا۔

”بچوں سے بہت محبت کرتے ہو؟“ دلچسپی سے سارا سین دیکھ کے بول پڑی۔

”نفرت تو مجھے کسی سے نہیں ہے۔“ اس کی طرف دیکھ کر بنا جواب دیا جلد ہی فارغ ہو کر آفس چلا گیا۔

☆☆☆

”کیا ہے ججو، یہاں میں بور ہونے تو نہیں آئی۔“ وہ کشن کو دو بچے صوفے پہ بیٹھی تھی۔

”بور کیوں ہو رہی ہو؟“ اسفر نے ٹی وی اسکرین سے نظر ہٹائی۔

”کیا کہنے آپ کے، آپ سارا دن آفس میں گزارتے ہیں، دیدی سارا دن کچن میں مصروف رہتی ہے اور آپ کے یہ بھائی۔“ ودیہ کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے وہ اسے دیکھنے

لگا جو نبھانے اس کے بارے میں کیا انکشاف کرنے جا رہی تھی۔

”امر کے پاس تو میرے لئے ٹائم ہی نہیں ہے، تین دن ہو گئے ہیں مجھے آئے ہوئے، اپنے آپ کو ڈل محسوس کر رہی ہوں، امریکہ میں تو آئے دن ہنگامہ برپا کیے رکھتی تھی۔“ وہ زور و شور سے اپنا کارنامہ سنارہی تھی۔

”لگتا ہے۔“ اس نے زیر لب کہتے چائے کی سیپ لی۔

”آپ دونوں آفس سے گھر آئیں تو بھی فائل کھولے مغز ماری کرتے رہتے ہیں، دیدی میں جانے کا سوچ رہی ہوں۔“ بیک وقت سب سے مخاطب تھی۔

”پہلی بار آئی ہو اور جانے کی اتنی جلدی، دراصل آج کل کام کچھ زیادہ ہے، اپنی دے تمہاری ناراضگی کے بارے میں بھی سوچتے ہیں۔“ اسفر نے انگلیوں سے پیشانی دبا لی۔

”کل سنڈے ہے کیوں نا پکنک پلان کریں۔“ اسفر نے ودیہ اور امروزی کی طرف تائیدی نظروں سے دیکھا۔

”سر میں درد ہو رہا ہے، کوئی پین کمر لا دوں۔“ ودیہ نے فکر مند سے پوچھا، اسفر نے نفی میں سر ہلا کر اسے مطمئن کیا۔

”اوہ پکنک کتنا مزہ آئے گا۔“ احمر ہوم ورک چھوڑ کر چنچنے لگا۔

”تو پھر ٹھیک ہے ہا کس بے کا پیر دگر ام رکھ لو۔“ اسفر نے فائل کر دیا۔

”امر تم تو کچھ بولو۔“ ودیہ نے اس کی خاموشی کو حیرانگی سے دیکھا۔

”کیا پوچھ رہی ہیں؟“ وہ فلور کشن پہ آڑا ترچھا بیٹھا تھا، سامنے لیپ ٹاپ آف تھا نظریں اسکرین پہ تھیں، ساتھ ہی چائے بھی پی رہا تھا،

نظریں اک لمحے کو ہٹا کر ودیہ سمیت سب پہ ڈالی۔

”کل پکنک پہ جارہے ہیں چاچو جان، آپ تو چلیں گے نا؟“ احمر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”میں نہیں جا رہا۔“ اس نے منہ بنایا۔

”کیوں؟“ احمر اٹھ کر اس کی پیٹھ پہ سوار ہو کر گلے کے گرد بانہیں لپیٹ گیا اس نے چائے کا کپ سائیڈ پہ رکھ دیا۔

”آپ جو نہیں جا رہے، اس لئے۔“ وہ جھول کر اس کے چہرے کی طرف آیا۔

”مگر میں تو جا رہا ہوں۔“ اپنے ہاتھ پیچھے کر کے اسے گرنے سے بچانے کے لئے وا کر دیے۔

”ہائے، میرے چاچو جانی کتنے اچھے ہیں۔“ ننھے ننھے ہاتھوں میں چہرہ تمام کر امروزی کے گال چوم لئے، تینوں محظوظ ہو رہے تھے۔

”یہ کیا بات ہوئی، بھئی ودیہ میں اور تم نہیں جا سکتے گے، جائیں دونوں چاچو، بھئیجا۔“ اسفر نے جھوٹی فحش دکھائی۔

”نا جائیں میں اور چاچو جان چلے جائیں گے، آپ تو مجھے پانی میں جانے ہی نہیں دیتے، چاچو جانی، منع تھوڑی کرتے ہیں نا چاچو جانی۔“

اس نے تائید چاہی تو وہ بھی فرط محبت سے بھجج گیا۔

”ہاں چاچو کی جان، سب ہم سے ہماری محبت سے ویسے ہی جلتے ہیں، دیکھو تمہاری ماما مجھے گھور رہی ہیں۔“ امروزی نے شرارت سے ودیہ کو دیکھا۔

”میرے بیٹے کو بہکا رہے ہو بد معاش۔“ ودیہ نے کشن اسکا پہ پھینکا، میناگل دلچسپی سے سارا منظر دیکھ رہی تھی، اسے یہ محبت بھری فضا

اچھی لگتی تھی، اسی اثناء میں لینڈ لائن پہ کال آنے لگی تھی، احمر کو اک ہاتھ سے لپٹائے امروزی نے قریب رکھا فون اٹھا کر کال ریسیو کی۔

”ہیلو جی، ہولڈ کریں۔“ دوسری طرف کی آواز سن کر اس کے لب بھجج گئے تھے۔

”میناگل آپ کی کال ہے۔“ ریسیور سائیڈ پر رکھ کر اس نے بتایا وہ تیر کی طرح ریسیور کی طرف بڑھی۔

”ہیلو، ہاں وقاص، وہ سیل فون چارج پہ لگایا ہوا ہے آف ہے، تمہارا نمبر مرس ہو گیا مجھ سے، دوبارہ لکھوا دو، اتنی دیر سے کیوں رابطہ کیا، جسٹ آ منٹ۔“ سوال و جواب کرتے ہوئے پین کے لئے نگاہ دوڑائی۔

”ہاں سیل آن کرتے ہی میں تمہیں کال کر لوں گی۔“ وہ دوسری طرف تسلی دے رہی تھی۔

”امر پین۔“ باتیں کرتے ہوئے اس نے پین کے لئے اسے اشارہ کیا لیکن وہ متوجہ نا ہو، وہ قدرے فاصلے پہ براجمان تھا، اس کے متوجہ نا ہونے پہ پین جھپٹ لیا، ساتھ ہی اس کا ہاتھ بھی تھام لیا۔

”ہاں وقاص بولو، ہوں ٹھیک ہے اوکے۔“ وہ بولتی جا رہی تھی اور فون نمبر امروزی کی ہتھیلی پہ لکھتی جا رہی تھی، وہ بھونچکا رہ گیا تھا، ودیہ اور اسفر ہنس پڑے، وہ حیرانگی سے اسے ہی گھورے جا رہا تھا۔

”ہاں میں کانٹکٹ کر لوں گی، تمہیں گھر کا ایڈریس بتایا تھا، آ جاتے۔“ باتوں میں مصروف اب بھی اس کا ہاتھ پکڑے بیٹھی تھی، وہ جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر لاؤنج سے باہر چلا گیا، میناگل نے چونک کر اسے دیکھا پھر باتوں میں مصروف ہو گئی، ودیہ اور اسفر بھی اپنے اپنے کاموں سے اٹھ گئے تھے، اک گھنٹے بعد باتوں سے فارغ ہو



کردہ اسے ہی ڈھونڈ رہی تھی۔

”دیدید امر کہاں ہے؟“ وہ یہہ کھانا دم پہ رکھ کر سیلڈ بنارہی تھی جب مینا کل اس تک آئی۔

”اپنے بیڈ روم میں ہو گا۔“ وہ یہہ نے مصروف انداز میں کہا، اسے بہن کا اتنی دیر اجنبی سے باتیں کرنا اچھا نہیں لگا تھا، مینا کل نے اسے بتا رکھا تھا کہ وقاص نامی شخص جہاز میں اس کا ہم سفر رہا تھا، وہ اسفر اور امر روز کے میزاجوں سے بھی واقف تھی مگر چونکہ مینا کل مہمان تھی اس لئے وہ باز پرس کر کے اسے ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی، اس نے بعد میں سمجھانے کا تہیہ کر لیا تھا، وہ یہہ کا جواب سن کر وہ اس کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

”امر، وہ فون نمبر دے دو۔“ وہ بیڈ پہ نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہا تھا، اٹھ بیٹھا۔

”کون سا نمبر؟“ دروازہ نیم وا ہی تھا جیسے اس نے نوک کر کے اجازت لینے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا اور کمرے میں داخل ہو گئی تھی، اسے سخت ناگوار گزرا۔

”وقاص کا، میں نے تمہارے ہاتھ پہ جو لکھا تھا۔“ وہ بے تکلفی سے بیڈ پہ براجمان ہو گئی۔

”وہ تو مٹ گیا، ہاتھ دھونے کے باعث۔“ ہتھیلی سامنے کی۔

”اوہ تم بھی عجیب ہو، نمبر بھی مٹا دیا۔“ وہ فرحت سے بیٹھی تھی امر روز سرک کر دور ہوا۔

”دعا کرو، وقاص جلد ہی کال کر لے۔“ افسردگی سے کہتے نظریں بید روم کے ڈیکوریشن پہ جمادیں۔

”مجھے کسی پاگل کتے نے کاٹا ہے۔“ اس نے زیر لب کہہ کے سر جھٹکا۔

”کمر تو بہت اچھا ڈیکوریت کیا ہے، واؤ شیسپیر کے ناولز۔“ وہ بک ریک دیکھتے بے قابو ہو گئی، ہر طرح کے ادبی سیاسی تاریخی کتابیں

بھری پڑی تھیں۔

”امر میں یہ ناول لے کر جا رہی ہوں پڑھ کے واپس کر دوں گی۔“ وہ کتابیں نکالنے لگی، اجازت سے زیادہ اطلاع دینے والا انداز تھا۔

”سوری میں اپنی کتابیں کسی کو نہیں دیتا، خراب ہو جاتی ہیں۔“ اس نے روڈی منع کر دیا۔

”لیکن میں تو لوں گی، تمہاری ہر ادا غضب کی ہے۔“ دھونس سے کہتے اس نے جیسے چیلنج کیا، وہ چیز کی جیبوں میں انگوٹھا ڈال کر اسے ہی دیکھ رہی تھی، اسے اس کی جینزنی شرٹ پہ ہی غصہ آتا تھا، وہ اس کی طرف دیکھنے سے بھی احتراز کرتا تھا۔

”میرا غصہ بھی بڑا غضب کا ہے، بھابھی نے ڈنر تیار کر لیا ہو گا چلیں۔“ تنگ کے کہتا وہ روم سے باہر نکل گیا، وہ آرام سے اس کی کتابیں نکالنے لگی۔

☆☆☆

دوسرے دن سب نے ہا کس بے پہ دھواوا بول دیا، وہ یہہ اور اسفر ساتھ ساتھ چلتے کافی دور نکل گئے تھے، امر اور مینا کل اس کے ساتھ تھے۔

”امر چلو نا، پانی میں۔“ اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”میں امر کے ساتھ ہوں، آپ جا میں۔“ اس نے اپنا بازو جھڑا لیا۔

”چاچو جانی چلیں نا میں بھی جاؤں گا پانی میں۔“ امر کے اصرار پہ اس نے جینز کے پائینچے فولڈ کیے اور امر کا ہاتھ پکڑ کر پانی میں اتر آیا، آگے جانے کے بعد احساس ہوا کہ مینا کل اس کے ساتھ نہیں ہے، واپس مڑ کر دیکھا تو وہ وہیں کھڑی اسے ہی گھور رہی تھی۔

”آ جا میں آپ بھی۔“ اس نے آفر کی۔

”ابھی میں نے کہا تو تم نے انکار کر دیا تھا۔“ وہ برامان گئی تھی۔

”آئی ایم سوری، اب آ جا میں۔“ اسے اپنے رویے کی بد صورتی کا احساس ہو گیا تھا مگر کیا کرتا، جب بھی اسے دیکھتا اس کی حرکتوں اور باتوں پہ نا چاہتے ہوئے بھی غصہ آ جاتا تھا، ایسکے زگر نے یہ وہ ساتھ آ گئی تھی۔

”میں اپنا سوئٹنگ کا سیٹم بھول آئی، دل چاہ رہا ہے سوئٹنگ کرنے کو۔“ اس نے ساتھ چلتے ہوئے کہا اور امر روز کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے، اسے بلانے پہ وہ خود کو کوس کے رہ گیا۔

”سوئٹنگ آتی ہے تمہیں؟“ وہ پتھر پہ بیٹھ کر پانی اڑانے لگی، امر روز بھی بڑے سے پتھر سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا، پانی کی لہروں کو امر خوش ہو کے دیکھ رہا تھا۔

”میں آنسکریم کھاؤں گا۔“ امر نے ضد کی۔

”ابھی چلیں گے تو پھر لے لیتا۔“ امر روز نے سمجھایا تو وہ چپ ہو گیا۔

”میں سوئٹنگ کا پوچھ رہی تھی۔“ اس نے سوال دہرایا، اس کی بے توجہی خسور ہو رہی تھی۔

”کیا کریں گی میرے بارے میں جان کر۔“ وہ اکٹاپا ہوا تھا۔

”نہیں آتی تو میں سکھا دوں گی۔“ اس نے شاہانہ انداز میں آفر دی۔

”توازش۔“ وہ چڑ کے بولا۔

”چلو امر آنسکریم کھانے چلتے ہیں۔“ وہ اٹھ کر آگے چلتے لگا، مینا کل اپنی جگہ پہ ہی بیٹھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”آپ نہیں کھائیں گی۔“ پلٹ کر پوچھنے لگا، جیسی بھی تھی اسے مینا کل سے جتنی بھی چڑھتی تھی تو اس کی عزیز بھابھی کی بہن، پہلی بار ان

کے گھر آئی تھی، آداب میزبانی نہانا فرض تھا۔

”موڈ نہیں ہے۔“ وہ بالوں کو جھٹک کر آگے جانے لگی۔

”پانی کا بھاؤ تیز ہے، اس نے تعبیر کی۔

”it is my life“ آپ جا میں۔“ وہ نخوت سے کہہ کر رکی نہیں اور آگے چلی گئی، جانوروں سے بھی بے زاری برتیں تو وہ بھی سمجھ جاتا ہے، وہ تو پھر ڈی ہوش اک تک چڑھی لڑکی تھی، وہ یہہ اور اسفر ہٹ میں بیٹھ چکے تھے، امر ان کی طرف بھاگا تو اس کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ مینا کل دایہ کی طرف متوجہ ہوا، جوش میں وہ آگے ہی بڑھے چلی جا رہی تھی، اک کے بعد دوسری لہریں آ رہی تھیں امر روز تشویش بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا، اس سے فاصلہ رکھے وہ ساتھ چلتے پہ مجبور تھا، مینا کل اسے فراموش کیے چلی جا رہی تھی۔

”مینا کل واپس چلیں۔“ اس نے پھر ضد سے زیادہ رکھنے کی سعی کی۔

”تم جاؤ اپنا کام کرو۔“ اس کی بات کو خاطر میں لائے بنا وہ مزید آگے بڑھ گئی تھی، یکے بعد دیگر بڑی لہریں آئیں اور اس کے مضبوطی سے جھے قدم کو اکھاڑ گئیں، سنہلتے سنہلتے بھی وہ غزاپ سے پانی میں ڈولنے لگی۔

”امرا! اس کی زوردار پٹچا بھری تھی، وہ تو پہلے ہی اس کے ساتھ قدم پہ قدم تھا، اس سے پہلے کہ لہریں اسے اپنے سنگ بہالے جاتیں، اس نے چھلانگ لگا کر اس کا بازو پکڑ کر کھینچا تھا، ارد گرد موجود لطف اندوز ہونے والے لوگوں میں بھی شور سا چمک گیا تھا، پتھر کا سہارا لے کر امر روز نے اسے تھام لیا تھا، مینا کل حلق اور آنکھوں میں نمکین پانی کی وجہ سے حواس باختہ سی ہو گئی تھی،



لہریں اب واپس جا رہی تھیں، وہ مارے خوف کے اس سے چمٹ کی گئی تھی۔

”منع کیا تھا نا، کیوں نہیں سنتیں، یہ آپ کا سوئمنگ پول نہیں ہے اسٹوپ۔“ امروز نے جھٹکے سے اسے الگ کیا تھا، غصے میں پیر سے پانی اڑایا، اس کے تو حواس بھی گم تھے، موت کو قریب دیکھا کہ سوچ کر ہی جھرجھری آ رہی تھی۔

”تھینکس امر، تھینک یو سوچ، اگر تم نہیں ہوتے تو، اف تو بہ۔“ اس کے حواس کچھ بحال ہوئے تو اسے امروز کا بگڑا موڈ نظر آیا۔

”سوری تمہاری بات نہیں مانی، معاف کر دو بھی، کہا نا آئم سوری۔“ امروز نے اسے گھور کے دیکھا مگر زیادہ دیر اس کی طرف دیکھ نہ سکا، ارد گرد خواہ تین کے ساتھ حضرات کی بھی بہتات تھی، امروز نے اپنی شرٹ اتار کر اس کی طرف بڑھائی۔

”کیوں؟“ وہ حیران تھی، اس وقت وہ جینز اور وہائٹ ٹی شرٹ میں ملبوس تھی۔

”خود یہ اک نظر ڈال لیں اور ارد گرد موجود لوگوں کے جم تھیں یہ بھی۔“ اس نے تھیکے لہجے میں کہا، امروز کے گریز کو دیکھ کر اس نے شرٹ لے لی تھی۔

”اور تم یونہی رہو گے۔“ اس کی طرف اشارہ کیا، جو بلیک جینز اور بلیک پینان میں اسارٹ لگ رہا تھا، کسرتی جسم نمایاں تھا۔

”میرا کیا ہے، آپ چلیں۔“ لا پرواہی سے اسے دیکھا جو اس کے بلیک شرٹ میں ملبوس تھی، اسفر اور ودیہ نے دونوں کو دیکھ کر نظروں ہی نظروں میں اشارہ کیا۔

☆☆☆

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ وہ آفس سے جلدی آ گیا تھا، کچن کا منظر بڑا حیران کن تھا، مینائل واجد

کچن میں تھی۔

”دیدنی اپنی کسی دوست کے ہاں گئی ہیں، انہیں شاید ہارٹ ایشو ہوا ہے، دیدنی نے کہا تھا جلدی آ جاؤں گی اور اب تک نہیں لوٹیں ملازم رکھنا تو انہیں پسند ہی نہیں ہے، ابھی خانا ماں ہوتا تو مجھے مشقت تو نہیں کرنی پڑتی، اتنا انتظار کیا، مگر بھوک بڑی زبردست لگی تھی سو چا آلیٹ ہی بنا لوں۔“ مصروف انداز میں کہا۔

امروز نے فرانی پین کو بغور دیکھا جس میں آلیٹ نامی کوئی چیز نظر نہ آئی البتہ انڈا توڑ کر ڈالا گیا تھا، جس کے ساتھ جھٹکے بھی دکھائی دے رہے تھے، زردی الگ اک طرف بہہ کر اپنی قسمت کو رو رہی تھی، پیاز موٹی موٹی پڑی تھی اور ہری مرچیں ڈنڈی سمیٹ استراحت فرما رہی تھیں، وہ اپنے قہقہے کو نارو رک سکا، وہ منہ بنا گئی۔

”یہ آلیٹ کی کون سی شکل ہے۔“ وہ ہنستے ہنستے قابو ہو گیا۔

”مذاق تو مت اڑاؤ، بھوک سے برا حال ہے۔“ وہ رو ہانسی ہو گئی۔

”لائیں میں آلیٹ بنا دوں۔“ شرٹ کی آستین فولڈ کر کے تیار ہو گیا۔

”پلیز۔“ وہ سائیڈ پہ ہو کر شلیف پہ چڑھ کے بیٹھ گئی، فرانی پین سے آلیٹ نامی چیز کو فرانی پین بدر کرنے کے بعد اس نے آلیٹ کے لوازمات کی کٹنگ کی، ساتھ ہی چائے بھی بنائی، وہ بغور اسے دیکھ رہی تھی۔

”واہ بہت میسٹی ہے، تم بھی کھاؤ۔“ فورک میں آلیٹ پروے اسے آفر کی۔

”نو تھینکس، صرف چائے کی طلب تھی۔“ وہ اپنا کپ اٹھا کر کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

مینائل ایڈ جسٹ ہو گئی تھی، اسے آئے مہینہ

ہونے کو تھا سب ہی اس کا بہت خیال رکھتے تھے، ودیہ تو خیر بہن تھی، اسفر بھی بھائی سے کم تو جہ نہیں دیتے تھے، احمر سے بھی اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی، بس اک امر تھا جو کبھی بات کر لیتا، ورنہ کاٹ کھانے کو دوڑتا، اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اس پہ توجہ دیتی تھی، ساتھ کے بنگلے کی لڑکیوں سے دوستی ہو گئی تھی، ان کے ساتھ کلب کی ممبرین چکی تھی، صبح سے شام تک فون کی بیل بجتی رہی تھی، سارا دن اسکا پپ پہ باتیں کرتی رہتی تھی۔

اب بھی وہ کسی سے آن لائن بات کر رہی تھی اور امروز ہل ہل کر وقت گزار رہا تھا، اس کی امپورٹ کال کرنے آنے تھی، مگر وہ آن لائن بیٹھی ہوئی تھی۔

”مینائل میری امپورٹ کال آنے والی ہے، پلیز تھوڑی دیر کے لئے آف آئن ہو جائیں۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا تھا۔

”اک منٹ کو نا۔“ آدھے گھنٹے سے وہ یہی اک جملہ سن رہا تھا، غصہ برداشت سے باہر ہو رہا تھا، مہمان کیا اسے تو بلائے جان لگے لگی تھی

اگر ودیہ کی بہن نا ہوتی تو دماغ ٹھکانے لگا دیتا، لمبی سانس لے کر وہ کچن میں ودیہ سے مدد مانگنے آ گیا۔

”بھابھی پلیز مینائل سے کہیں تھوڑی دیر کے لئے آف آئن ہو جائے میری اک امپورٹ کال آنی ہے شارجہ سے۔“ جھنجھلاہٹ میں لہجہ تیز ہو گیا۔

”آؤ میں کہتی ہوں۔“ ودیہ نے اس کے بگڑے موڈ کو دیکھ کر کام چھوڑ دیا۔

”مینا فون فری کر دو تھوڑی دیر کے لئے۔“ ودیہ نے سہولت سے کہا۔

”اچھا اپنا باڈی گاڈ بنا کر آپ کو لایا گیا

ہے۔“ وہ مسکرائی۔

امروز اپنا لیپ ٹاپ اس کے یوز میں دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا، اس طرف تو اس نے دھیان ہی نہیں دیا تھا، کس دھڑلے سے وہ اس کے کمرے میں گھس کر اس کی چیزیں استعمال کر رہی تھی۔

”بند کرو شاہاش۔“ ودیہ نے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔

”دیدنی!“ وہ احتجاجاً چلائی۔

”بعد میں کر لینا چندا، ابھی چلو۔“ وہ نروٹھے انداز میں اٹھ کر چل دی تھی، اس نے شکر کا سانس لیا، شارجہ بات کر کے کھڑا ہوا تو تیل بج اٹھی۔

”جائیے محترمہ آپ کا فون آچکا ہے۔“ وہ کچن میں اطلاع دینے آیا، شلیف پہ چڑھی بیٹھی سب کتر رہی تھی، فون کا سن کا سرپٹ دوڑتی بھاگی۔

”تم، سنڈ مت کرنا امر، بچپن سے مندی ہے نا تو نے اور سرچہ حالیا۔“

”ڈزن میٹر بھابھی آپ کی بہن ہیں میرے لئے باعث عزت ہے، لیکن آپ اسے سمجھایا کریں، یہ پاکستان ہے، امریکہ نہیں۔“ لہجے میں فکر مندی لئے وہ ودیہ کو ہمیشہ سے زیادہ اچھا لگا۔

”بہت سمجھاتی ہوں، سب سے زیادہ تو مجھے اس کے ہمہ وقت جینز شرٹ پہ غصہ آتا ہے، کئی بار ٹوک چکی ہوں، مگر پانتی ہی نہیں۔“ ودیہ کو کبھی اس کی فکر ہونے لگی تھی، وہ ان کے پرسنل معاملات میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

کلب جانے کے باعث اب وہ رات دیر سے بھی آنے لگی تھی، ودیہ پریشان تھی کہ کیسے کیا کرے، دیور اور شوہر کیا نہیں گے، گھبرا کر اس



نے ماما کو فون کر دیا۔

”وہ یہہ تم بھی اسے نہیں سنبھال سکیں، میں نے تو یہ سوچا کہ تمہارے پاس بھیجا تھا کہ وہ تم سے ہی ہلکے سیکھ لے گی، مگر یہ لڑکی۔“

”ماما میں ہر ممکن طریقہ اختیار کر چکی ہوں مگر وہ سمجھتی نہیں عادتیں اتنی پختہ ہو گئی ہیں کہ اب کوئی معجزہ ہی اسے سدھار سکتا ہے، مجھے تو اسفر اور اس کے سامنے شرمندگی ہونے لگی ہے، امر سے عموماً بدتمیزی کر جاتی ہے، امر نا چاہتے ہوئے بھی چپ رہتا ہے، امر کو تو اس کے پہناؤں اور لڑکوں سے دوستی بھی غصہ آ جاتا ہے، اسفر تو ابھی کچھ نہیں کہہ رہے مگر لگتا ہے انہیں بھی یہ سب پسند نہیں، اب تو دیر سے گھر آنے بھی لگی ہے۔“

وہ یہہ سخت بے بس نظر آرہی تھی۔

”اللہ نہ کرے اس کی وجہ سے تمہارے گھر کا سکون خراب ہو، تم اسے چلاتا کرو، اس کے لڑکوں والے انداز اب مجھے ہی نکالنا پڑیں گے۔“ ماما غصہ آ گیا۔

”جی بات کرتی ہوں مینا سے۔“ انہوں نے فون بند کر دیا اور جب اس نے سہولت سے ماما کا پیغام دیا تو اس نے صاف منہ پہ کہہ دیا۔

”اتنی جلدی واپس جاؤں، کیوں دیدی آپ مجھے رکھنا نہیں چاہتیں، ابھی تو میرا دل بھی کراچی سے نہیں بھرا۔“ اور وہ یہہ شرمسار ہو گئی تھی، امروز نے وہ یہہ اور اس کی ماما کی بات بھی سنی اور دونوں بہنوں کی بھی، اسے مینا کے سے چڑھی ہوئے لگی تھی، بعض اوقات تو اس کی باتیں سن کر جی چاہتا تھا پتھر مارے، ابھی رات ہی اس کا لیپ ٹاپ پھر غائب ہو گیا تو وہ غصے سے لاؤنج تک آیا حسب معمول وہ اس کا پپہ آن لائن تھی، دوسری طرف کوئی لڑکا آن لائن تھا، وہ واپس پلٹ جانا چاہتا تھا مگر مینا کے وادہ کی نارکنے والی

ہنسی نے اسے رکھنے پہ مجبور کر دیا، ہیڈ فون کا تلفظ کسے بنا اسپیکر آن تھا، کوئی مووی زیر بحث تھی، اس کی برداشت جواب دینے لگی تھی۔

”ایکسیکوزی مسٹر بند کریں گفتگو۔“ وہ قریب آ کر دھاڑا۔

”تم کیوں ہماری باتیں سن رہے ہو؟“ وہ چمک کر بولی۔

”مجھے کوئی شوق نہیں آپ لوگوں کی چپ باتیں سننے کا، سائن آف کریں۔“ وہ اس کے انداز پہ کھول گیا۔

”تم ہوتے کون ہو، مجھے روکنے والے؟“ وہ بھی غصے میں آ گئی، تیسرا بندہ خاموش تھا۔

”آپ حد سے بڑھ رہی ہیں مینا۔“

”تم کیوں اتنی فیئر کر رہی ہو؟“ اس نے دس انداز کی کراں گزری تھی۔

”مجھے کوئی شوق نہیں انٹرفیر کرنے کا ہمارا گھر شریفیوں کا گھر ہے، یہاں ایسی چپ باتیں نہیں ہوتیں، اور تم..... میری بات پلے نہیں پڑ رہی تمہارے مسٹر۔“ وہ سختی سے بولا تو لڑکے نے لائن کاٹ دی، اس نے جھٹکے سے تار نکالے اور اپنا لیپ ٹاپ لے کر چلا گیا، وہ غصے سے بیٹھی رہی۔

صبح ناشتے کی میز پر بھی وہ برے موڈ سے موجود تھی، امروز نے سکون سے ناشتہ کیا اور آفس چلا گیا، اسفر اور وہ یہہ اس کے بگڑے موڈ کی وجہ پوچھتے رہے۔

”ایڈیٹ، میگزین ہی نہیں، ایم بی اے کی ڈگری لئے پھر رہا ہے۔“ اس نے منہ بنایا، پچھلے ہی دنوں رزلٹ آیا تھا، اس کی دوسری پوزیشن بنی تھی، اسفر نے تو پارٹی کا کہا تھا، مگر وہ منع کر گیا، پھر بھی وہ یہہ نے اہتمام کیا تھا، سب کے ساتھ اس نے بھی گفت دیا تھا، فری ہو کر کمرے میں

آئی تو تھوڑی دیر بعد دستک دے کر امروز بھی آ گیا۔

”تم۔“ وہ حیران تھی، پہلی بار اس کے کمرے میں آیا تھا۔

”آؤ بیٹھو۔“

”میں بیٹھے نہیں آپ کا گفت واپس کرنے آیا ہوں۔“ ڈبا اس کے سامنے رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”کیوں؟ پسند نہیں آیا؟“ وہ تعجب تھی۔

”اللہ نہ میں مرد ہوں اور مجھے اپنی مردانگی پہ ناز ہے، یہ چوڑیاں عورتوں کے لئے بنی ہیں، انہی کے ہاتھ میں جتنی ہیں، شب بخیر۔“ وہ کمرے سے چلا گیا تھا اور وہ گوڈل کے کڑے کو دیکھتی رہ گئی۔

”ہونہہ، اسمارٹ بننے کا زیادہ شوق ہے۔“

اس نے کڑا اک طرف پھینک دیا، اس کے سرکل میں تو لڑکے یہ چیز شوق سے پہنتے تھے، لیکن وہ بول رہی تھی کہ وہ امروز ہے۔

☆ ☆ ☆

”عبید اللہ! کا چاند نظر آ گیا ہے، میرا خیال ہے قربانی کے لئے جانور لینے چلتے ہیں، ورنہ جیسے بیسے دن گزریں گے قیمتیں بڑھتی جائیں گی۔“ اسفر نے ڈنر کے بعد کہا تو امروز نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

”کل ڈنر کے بعد نکلتے ہیں پھر۔“ اسفر نے ذہن کر دیا۔

”پپا، چاچو جان میں بھی جاؤں گا۔“ احمر جو شوق سے ان کی گفتگو سن رہا تھا پر جوش ہو گیا، کتنے دنوں سے وہ باری باری سب سے پوچھ رہا تھا کہ جانور لینے کب جائیں گے۔

”بالکل میرا جانور ضرور جائے گا۔“ امروز نے فوراً اسے ساتھ لگا لیا۔

کے متعلق، نیٹ پہ بھی دیکھا ہے کراچی میں بڑی بڑی منڈی لگتی ہے۔“ مینا کے لئے بھی زور و شور سے حصہ لیا، امروز کا تو جی چاہا پہلی فرصت میں منع کر دے مگر اس سے پہلے ہی اسفر بول پڑا تھا۔

”ضرور چلنا، وہ یہہ تم بھی چلی چلو، ایکسی گھر میں بور ہو جاؤ گی۔“

”نہیں بھی مجھے منڈی کا ماحول پسند نہیں اسمیل سے وہ میننگ ہونے لگتی ہے اوپر سے ہر طرح کے لوگوں کی نظریں بہت عجیب لگتا ہے۔“ وہ یہہ نے صاف انکار کر دیا، امروز کو وہ یہہ کی سوچ سے مکمل اتفاق تھا، وہ یہہ نے دبے لفظوں میں مینا کے کو بھی روکنا چاہا مگر اس کی ضد پہ چپ رہ گئیں۔

سب منڈی جانے کو تیار تھے، احمر شائس فی شرٹ اور کیپ میں ہیرو بنا تیار کھڑا تھا، مینا کے حسب معمول جینز فی شرٹ میں ملبوس تھی، منڈی میں وہ اس صلیب میں جائے گی، یہ سوچ کر ہی اسے غصہ آنے لگا تھا اور وہی ہوا جو امروز کی سوچ تھی،

منڈی میں جانوروں کو چھوڑ کر سب اسے ہی دیکھنے لگے تھے، ارد گرد موجود جانوروں سے ڈر کر سریلی چیخ مار کر وہ جس طرح امروز کا بازو پکڑ لیتی تھی اس کی شرٹ کھینچ رہی تھی اس پہ وہ چراغ

پا ہوئے جا رہا تھا۔

”اف اس کی تو سینگیں بہت خطرناک ہے۔“ نیل اس کی طرف بڑھتا ہوا لئے قدم پیچھے ہٹی، وہ امروز سے ٹکرائی، اونچی ہیل سے اس کے جوتوں پہ چڑھ گئی، وہ جو پیچھے اس لئے تھا کہ اجنبی مردوں سے اس کا فاصلہ رہے نوک دار نیل اپنے جوتوں پہ محسوس ہوئی تو خوشنظریوں سے اسے گھور کر رہ گیا۔

”جب اتنا ڈرتی ہیں جانوروں سے تو یہاں آ کر تماشا گاہ لگنے کی کیا ضرورت تھی گھر پہ

میں بھی جاؤں گی، بہت سنا ہے، رونق



بیٹھ کر ہائے وائے کرتی رہیں۔“ ارد گرد موجود مردوں کی ہنسی اور نظریں مینائل پہ دیکھ کر سختی سے کہتے اس نے اپنی شرٹ سے اس کی مٹھی سے چھڑائی تھی، مرد جتنی غلیظ نظروں سے دیکھ رہے تھے، اس سے اس کی جی چاہ رہا تھا ان کی آنکھیں نکال دے مگر قصور جتنا ان مردوں کا تھا اس سے کہیں زیادہ دعوت نظارہ دیتی محترمہ کا بھی تھا، اس نے سر نظروں سے اس کی پشت کو گھورا تھا جو اس کی ڈانٹ سن کر آگے بڑھ کر گئی تھی اور وہ پیچھے چل رہا تھا، جانوروں سے زیادہ اس کی نظریں مینائل پہ اٹھنے والی نظروں پہ جمی تھیں، اسفر نے جانور پسند کر لیا تھا، اس نے جلد ہی مول کیا اور جانور لے کر گھر کی راہ لی کہ مزید رکنا تو یقیناً کوئی ہنگامہ ہو جاتا کہ اس کا خود پہ اختیار ختم ہو رہا تھا۔

☆☆☆

بزئس پارٹی اینڈ کر کے گھر آیا تو اسفر اور ودیہہ پریشان دکھائی دیئے۔  
”کیا ہوا، سب ٹھیک تو ہے؟“ اس نے کوٹ اتار کر صوفے پہ پھینکا۔  
”امر ابھی تک مینا گھر نہیں آئی۔“ ودیہہ نے انک انک کر بتایا، ناکی کی ناٹ کھولتے اس کے ہاتھ جم گئے تھے، بلا ارادہ نظر گھڑی کی سوئیوں پر پڑیں، جو رات کے دو بج رہی تھیں۔  
”کہاں گئی ہیں؟“ غصے کو پس پشت ڈال کر سوال کیا۔

”شیرانی صاحب کی بیٹیوں کے ساتھ کلب گئی تھی، ان کی بیٹیاں بھی ابھی نہیں لوٹیں، میں کہہ رہا ہوں جا کر دیکھ آتا ہوں مگر یہ مان ہی نہیں رہی۔“ اسفر نے بے چارگی سے کہا، چہرہ سنجیدہ ہو رہا تھا۔

”اف میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے۔“ ودیہہ

”آپ فکر مت کریں میں دیکھتا ہوں جا کے۔“ ودیہہ کو تسلی دے کر کلب کا ایڈریس لے کر آدھی طوفان کی طرح گاڑی دوڑا رہا تھا، جتنی تیزی سے گاڑی دوڑ رہی تھی، گنتی تیزی سے غصہ آ رہا تھا، گاڑی پارک کر کے اس نے اندر قدم رکھے تھے، ماڈرن سوسائٹی کے نام پہ بے حیائی دکھائی دی، قدم سے قدم ملا کر سب تھر کر رہے تھے، نظریں دوڑانے کے بعد اسے مینائل نظر آ گئی تھی، ڈانس کی حد پھلانگ کر اب لڑکا دست درازی پہ اتر آیا تھا، اس کی برداشت نے حد پھلانگ لی تھی، دوڑتے ہوئے وہ اس تک پہنچا اور بازو سے پکڑ کر مینائل کو کھینچ کر اس سے الگ کیا، وہ لڑکھائی تو اسے سہارا دینا پڑا، اس کا غصہ اشتعال میں بدل گیا تھا کہ اس نے شراب پی رکھی ہے، لڑکے نے امروز کا کار پکڑ لیا۔

”کون ہو تم میرے منہ سے نوالہ چھیننے والے، پہلے بھی کلب میں دیکھا نہیں۔“ وہ اس طرح گھور رہا تھا گویا کچا ہی چبا جائے گا۔  
”میں تمہارے نوالے کا وہ بڑی ہوں جو تم ناگل سکتے ہو اور نا ہی اگل سکتے ہو۔“ کار چھڑا کر اس نے مکہ اس کے جڑے میں رسید کیا، کلب کا میسرےج میں آ گیا۔

”امر۔“ مینائل نے اس کے کندھے پہ سر رکھا تو اس نے یوں جھٹکا جیسے پھونکنے ڈنک مارا ہو، بحالت مجبوری اس کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی تک لایا، وہ ہوش و خرد سے بے گانہ ہو چکی تھی، امروز نے اک نفرت بھری نظر اس پہ ڈالی تھی، ودیہہ اسے اس حال میں دیکھ کر دونوں سے نظر ملانے کے قابل نہیں تھی، دونوں اتنے اچھے تھے کہ انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا مگر ودیہہ جیسی شرم و حیا اور ایمان کا پیکر جیسے اپنی نظروں میں خود کڑھ گئی

☆☆☆

”آئی ایم سوری، رات جو ہوا اس میں میری غلطی نہیں تھی، مجھے دھوکے سے ڈرنک پلائی گئی۔“ صبح وہ ودیہہ کو صفائی پیش کر رہی تھی، سر الگ درد سے پچھا جا رہا تھا، ودیہہ نے کچھ نہیں کہا تھا مگر اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ ناراض ہے، ودیہہ نے اک نظر اس کے چہرے پہ ڈالی اور چائے کے مگ کے ساتھ ناشتہ بھی اس کے سامنے رکھ دیا۔

”چائے پی لو، شاید درد کم ہو جائے، مجھے نہیں علم کہ اس درد کو دور کیسے کرتے ہیں۔“ ودیہہ کے عام سے جملے نے اسے شرمندہ کر دیا۔  
”آپ میرا یقین کریں دیدی۔“

”میں تمہارا یقین بھی کر لوں تو کیا ہوگا، کوئی تمہیں زبردستی تو کلب نہیں لے گیا، تم وہاں بیٹھ کر شربت بھی پیو گی تو سب ڈرنک ہی سمجھیں گے، انسان اپنے ماحول سے جانا جاتا ہے، تم نے بہت شرمندہ کیا ہے مجھے اسفر اور امر کے سامنے، یہ تو امر تھا جو بروقت پہنچ گیا ورنہ جانے کیا ہو جاتا، جو لوگ دھوکے سے شراب پلا سکتے ہیں وہ کیا نہیں کر سکتے تھے، سوچا ہے اک لمحے کے لئے۔“ ودیہہ اک جتنی نگاہ ڈال کر بچن میں چلی گئی تھیں، وہ خاموشی سے بیٹھی ناشتہ کرتی رہی، ودیہہ کی ناراضگی کا احساس تھا، چائے پیتے اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے تھوڑا ٹھہر کر منالے گی سر کے درد کو قدرے سکون ملا تھا، گھر میں سناٹا تھا، صبح کے گیارہ بج رہے تھے، احمر اس وقت اسکول میں ہوتا تھا، اسفر، امر آفس میں، ودیہہ اس وقت تھوڑا آرام کرتی تھیں پھر لچ کی تیاری شروع کر دیتی تھیں کہ زیادہ اہتمام ڈرنمیں جو کرنا ہوتا تھا اس کے لئے وہ شام سے ہی لگ جاتی تھیں۔  
اسے بوریت ہونے لگی تو مگ خالی کر کے

اپنے کمرے میں جا کر آرام کرنے کے خیال سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میوزک سنتے ہوئے زیادہ ریلیکس فیل ہو گا۔“ امروز کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اک لمحے کو اس کے قدم رکے۔  
”اس کا میوزک کلیکشن بہت اچھا ہے، سی ڈی لے لیتی ہوں۔“ اس خیال سے اس نے حسب عادت اس کے کمرے کا دروازہ بنا اجازت کھولا اور داخل ہو گئی، مگر اسے اک دم ٹھنک کر رکنا پڑا، امروز لیپ ٹاپ سامنے رکھے نیم دراز انداز میں کام کر رہا تھا، اس وقت وہ بلیک ٹراؤزر اور بنیان میں قدرے ریلیکس موڈ میں تھا، دروازہ بے تکلفی سے کھلتے اور اندر داخل ہونے والی ہستی تو اس نے خشکیں بھری نظروں سے دیکھا تھا۔

”ارے تم موجود ہو، مجھے لگا نام پہ آفس چلے گئے ہو۔“ وہ بے تکلفی سے بیڈ پہ بیٹھ گئی، امروز نے سائیڈ پہ رکھی شرٹ اٹھا کر پہنا شروع کر دی۔

”کس سلسلے میں آئی ہیں؟“ وہ تکیھی چتو نوں سے اسے گھور رہا تھا۔  
”کچھ سی ڈی لے لینی تھی تمہاری اچھا ہوا تم مل گئے کل کے لئے کھینکس بھی بولنا تھا۔“ وہ حد درجہ لا پرواہی سے بول رہی تھی۔

”آپ کو پہلے ہی سمجھا ہا ہے، میں اپنی چیزیں شیئر نہیں کرتا۔“ اس نے ٹکڑا توڑ جواب دیا۔

”ہاں پتا ہے اس لئے میں تمہیں بنا بتائے ہی تمہاری چیزیں لے لیتی ہوں، پتا جو ہے چھوٹے دل کے ہو۔“ وہ کمال لا پرواہی سے سی ڈی کلیکشن کی طرف بڑھ گئی۔

”محترمہ! بڑی مہربانی ہوگی آپ میرے



کمرے سے نکل جائیں۔“ اس نے نہایت خشک لہجے میں کہتے لپ ٹاپ بند کر دیا، اس کا کام مکمل ہو چکا تھا، اب اسے آفس کے لئے نکلتا تھا۔

”بلیوی، خراب نہیں کروں گی سی ڈی، سن کر چپکے سے لا کر رکھ دوں گی جیسے تمہاری کتابیں لا کر رکھ دیتی ہوں۔“ وہ اپنا کارنامہ سنانے کے ساتھ اپنے ارادے بھی بتا رہی تھی، وہ جوتے پہن رہا تھا، اس کے لفظوں کی سختی کا اس پر کچھ اثر نہیں تھا، رات کے کسی عمل پر شرمندگی کی کوئی لکیر نہیں تھی، سی ڈی اسٹینڈ سے سی ڈی ڈیز اٹھا کر وہ دھپ سے اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی، وہ بے ساختہ سرک کر دور ہوا تھا، وہ اپنے کمرے میں اس کی موجودگی سے ہی پزل تھا، صاف لفظوں میں کہنے کے بعد بھی وہ ڈھنائی سے سی ڈی ڈیز کو الٹ پلٹ کر رہی تھی۔

”تمہارا فیورٹ سوئگ کون سا ہے؟“ وہ اک بار پھر جوش میں قریب آئی تو امروز نے اٹھ جانے میں ہی عافیت جانی، اس کی بڑی عجیب عادت تھی، پہلو بدلتے بدلتے وہ مقابل کے قریب تر ہو جاتی تھی، اس کے سوال کو نظر انداز کر کے وہ جھک کر لپ ٹاپ اور اپنی ضروری چیزیں سیل فون اٹھانے لگا۔

”تمہارا مسئلہ کیا ہے، سمجھتے کیا ہو تم خود کو، جب دیکھو اکڑ دکھاتے رہتے ہو۔“ مینا نکل واجد نے اس کی کلائی تھام لی تھی اس کے ہاتھ سے لپ ٹاپ چھوٹ کر کارپٹ پر گر گیا۔

”جواب دو، مجھے اکڑ دکھاؤ گے تو اسی طرح نقصان کروں گی تمہارا؟“ اس کی کئی گھنٹوں کی محنت لپ ٹاپ میں تھی، جو جانے اب آن بھی ہوتا یا نہیں اس پر مستزاد وہ اس کی کلائی کو جھٹکے دے رہی تھی، جتا رہی تھی، امروز نے جھٹکے سے

کلائی چھڑائی تھی اور اگلے ہی لمحے اس کے گلابی رخسار پر تھڑ جز دیا تھا، مینا نکل واجد بیڈ پر لڑھک سی گئی تھی۔

”تم عورت ذات کے نام پر اک دھبہ ہو، شرم آتی ہے تمہیں دیکھ کر اور یہ سوچ کر کہ تم بھابھی کی بہن ہو، جسے شرم و حیا چھو کر نہیں گزری، جو خود مردوں کے قرب کو برا نہیں سمجھتی، نظر انداز تو چھوٹا لفظ ہے میں تم جیسی کے سائے سے بھی دور رہنا چاہتا ہوں، مغربی ممالک کی تقلید کر کے کیا سوچتی ہو تم وہاں کی باسی ہو، ان کی نظر میں تیسرے درجے کی شیریں ہو، اپنا مذہب، روایات، تہذیب کو بھول کر تم جیسوں نے پہلے کون سی ترقی کی ہے، جو تم ان کی تقلید پہ مجھ سے داد چاہتی ہو، ہمارے مذہب نے کب اجازت دی ہے کہ فیشن کے نام پر یہ بے حیا لباس پہنو، جسے عزت و تقدس کے معنی بھی نہیں پتا۔“ نہایت ترش لہجے میں کہتے وہ اک تنفر بھری نظر اس پر ڈال کر اپنی چیزیں اٹھا کر کمرے سے نکل گیا، وہ ساکت بیٹھی رہ گئی۔

☆☆☆

”امر میں اندر آ جاؤ؟“ دروازے پہ کھڑی ودیہہ اجازت چاہ رہی تھی۔

”آپ کو اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے بھابھی آئیے۔“ وہ استقبال کے لئے اٹھ بیٹھا۔

”ڈسٹرپ تو نہیں کیا؟“ اندر آ کر استفسار کرنے لگی۔

”کم آن بھابھی، بیٹھیں۔“ پیرسمیٹ کر اس نے سی ڈی پلیئر آف کر دیا۔

”سونے لگے تھے؟“ کمرے میں لائٹس آف تھیں، صرف ٹیلی لپ آن تھا، اس نے اٹھ کر ساری لائٹس جلا دیں، اسے ودیہہ کی آمد بے وجہ نہیں لگ رہی تھی، یقیناً وہ کوئی خاص بات

کرنے آئی تھی، شاید مینا نکل نے شکایت لگا دی ہو، وہ سوچ کے رہ گیا، اسے اپنے کیے پر کوئی انوس نہیں تھا، ڈنر کی میز پر دونوں کا سامنا ہوا تھا، امروز نے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا، وہ بھی چپ چاپ ڈنر کر کے چلی گئی تھی اور اب ودیہہ سامنے تھی۔

”اتنا اندھیرا کرتے ہو، ڈر نہیں لگتا۔“

”کمرہ اندھیرا ہونے سے کچھ نہیں ہوتا بھابھی، من میں اجالا ہونا چاہیے۔“

”بجا کہا۔“ ودیہہ کا لہجہ رک رکا تھا جیسے وہ کوئی اہم بات کرنا چاہ رہی ہو، مگر کرنا پڑا ہی ہو۔

”امر تم سے اک بات کرنے آئی تھی۔“ انگلیوں کو دیماتے ہوئے کہا۔

”جی کہیں۔“ ودیہہ کا تذبذب اسے مشکوک کر رہا تھا۔

”میتا کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟“

”جی مطلب؟“ وہ نا بھجی سے ودیہہ کو دیکھنے لگا۔

”اصل میں ماما میتا کے لئے لڑکا دیکھ رہی ہیں انہوں نے مجھے بھی کہا کہ کوئی اچھا لڑکا نظر میں ہو تو بتاؤں، میں نے اسفر سے ذکر کیا کہ اگر کوئی اچھا لڑکا نظر میں ہے تو بتائیں تو، اسفر نے کہا کہ میں تمہاری رائے لے لوں، کیونکہ ان کی نظر میں تم سے اچھا بندہ تو کوئی نہیں اور مجھے بھی اسفر کی بات سے سو فیصد اتفاق ہے، آئے نو مینا تھوڑی بگڑی ہوئی ہے لیکن.....“ ودیہہ کی بات ادھوری رہ گئی تھی، امروز کے ماتھے پہ شگنوں کا جال بچھنے لگا تھا۔

”میں آپ کی بے حد عزت کرتا ہوں، صرف اس لئے نہیں کہ آپ میری بھابھی ہیں، بلکہ آپ کے وجود سے مجھے ماں اور بہن کی محبت

بھی ملی، بہت چھوٹا سا تھا جب ماما چل بسیں، باوا نے ہم دونوں بھائیوں کو ماں باپ دونوں کی محبت دی، لیکن ماں کے وجود کی الگ ہی اہمیت ہے، پھر باوا بھی چلے گئے تو بھائی نے مجھے ان کی کمی محسوس نہیں ہونے دی اور جب آپ اس گھر میں آئیں تو یقین کیجئے مجھے ایسا لگا میری ماں کو دوبارہ آپ کے روپ میں بھیج دیا گیا۔“

”آپ دونوں مجھے سولی پہ چڑھ جانے کو بھی کہیں گے تو بنا کچھ اپنا قصور پوچھتے چڑھ جاؤں گا، لیکن جہاں تک مینا کی بات ہے، میری طرف سے معذرت ہے، وہ مغربی طرز پہ چلنے والی بگڑی ہوئی لڑکی ہیں، مردوں سے میل جول، گھومنا پھرنا ان کے نزدیک محبوب نہیں، وہ بچی نہیں ہیں جو میں شادی کر کے ان کا نیچر بنا رہوں، ویسے بھی ان کی عادتیں اتنی پختہ ہو گئی ہیں کہ مشکل ہی ہے کہ وہ کبھی سدھریں، بہتہ ہوگا آپ انہیں امریکہ ہی بھیجوا دیں اور وہی شادی کر لیں۔“

”میں مشرقی ہوں، مشرقی شریک نہ رہی چاہتا ہوں، جو سرف میری ہو، زمانے بھر سے تعلق نارکتی ہو، میرے لئے سچے سنورے، اپنی طرح کا کوئی پیس ڈھونڈ لیں آپ۔“ آخر میں لہجہ شرارتی ہو گیا، ودیہہ کو اس سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی، اس کا مزاج جانتی جو تھی، وہ تو بات کر کے گونانا بھی نہیں چاہتی تھی، مگر اسفر کا اصرار تھا سو کرنے ہی بنی۔

”پھر حفیظ صاحب کی زینب کیسی ہے، جو پانچ گز کے چادر میں یونیورسٹی جاتی ہے۔“ ودیہہ نے ساتھ والے بنگلے کے کلین کا ذکر کیا۔

”بالکل نہیں، اگر آپ اسے یونیورسٹی میں دیکھ لیں تو سر پیٹ لیں گی، پانچ گز کا چادر لے کر نکلنے والی کے پاس یونیورسٹی پہنچنے تک آدھ گز کا



دوپہ بھی بمشکل ملے گا، ہاں ہر ہفتے اک نئے لڑکے کے ساتھ ضرور ملے گی۔“ اس کے لہجے میں حقارت تھی۔

”واقعی؟“ ودیہہ کا حیرت کم نہیں ہو رہا تھا۔

”جی..... مجھے ایسی لڑکی چاہیے جو اندر و باہر سے اک جیسی ہو۔“

”اللہ کرے جلد تمہاری منظور نظر مل جائے۔“ ودیہہ مسکراتی ہوئی اٹھ گئی تھیں، ودیہہ کے جانے کے بعد اس نے لائٹس آف کیں اور جگہ پر آکر لیٹ گیا، ذہن میں ودیہہ کی باتیں گردش کر رہی تھیں۔

”مینائل نووے۔“ اس نے ہکیہ منہ پر رکھ لیا۔

☆☆☆

”صبح بخیر!“ اس آواز کے ساتھ سب کی نگاہ بے اختیار آواز کی طرف اٹھ گئی اور جیسے واپس آنا بھول گئی، سوائے امروز کے۔

”ہائے آئی آپ کو کیا ہوا؟“ احمر نے بھی تبدیلی کو محسوس کیا۔

”کچھ نہیں ہوا، بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ چیئر گھسیٹ کے بیٹھ گئی۔

”مینائل ہم نہیں خواب تو نہیں دیکھ رہے تم اور اس ڈریس میں؟“ اسفر بھی کم حیران نہ تھا۔

بات کی حیرانگی کی تھی، مینائل واجد لائٹ اور ڈارک براؤن مینیشن کا سوٹ زیب تن کیے دوپٹے کو شانوں پہ سلیپے سے لئے ان کے درمیان تھی۔

”کیوں بری لگ رہی ہوں؟“ اس نے جھینپتے ہوئے پوچھا۔

”ماشاء اللہ بہت اچھی لگ رہی ہو، لیکن یہ ماجرا کیا ہے؟“ کپ اٹھاتے ہوئے اسفر نے

امروز کی طرف دیکھا جو لائق سا بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔

”آپ کی زوجہ محترمہ، ممما سے کل میری شکایت کر رہی تھیں، اس لئے میں نے سوچا کہ ان کی شکایت بھی دور کر دی جائے۔“ بریڈ پہ نیم لگاتے ہوئے وہ بظاہر نارمل لہجے میں لاپرواہی سے کہہ رہی تھی۔

”یہ سوٹ کس کا ہے، یہ تو شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ تمہارے پاس اک بھی نہیں ہوگا۔“ اسفر کی بات نے ودیہہ کو بھی مسکرانے پہ مجبور کر دیا۔

”بالکل بجا فرمایا آپ نے“ ”آئی“ کا سوٹ اڑایا ہے۔“ سب کے لئے دوسرا جھٹکا تھا۔

”ویسے آئی، آپ لگ بہت کیوٹ رہی ہیں، ہے نا چاچو جان۔“ ہمیشہ کی طرح احمر نے چاچو جانی کی تائید چاہی تو وہ شیشا گیا، اسفر اور ودیہہ مسکراہٹ دبائے اس کے جواب کے منتظر تھے۔

”بتائیں نا چاچو جانی، پہلے تو آپ میری بات نہ اتنا سوچتے تھے۔“ احمر نے برا ماننے ہوئے کہا۔

”میں نے دیکھا نہیں بیٹا!“ اس نے جان چھڑانا چاہی۔

”تو اب دیکھ لیں آئی کون سا دور بیٹھی ہیں۔“ احمر نے پٹ سے کہا۔

”احمر چپ کر کے ناشتہ کرو، وین آنے والی ہے اور اپنے ٹیل کو بھی کھانا دے آؤ، وہ بھی بھوکا ہوگا۔“ اس نے کمال چالاکی سے احمر کا دھیان ٹیل کی طرف مبذول کیا۔

”اوہ نو، میں تو بھول ہی گیا تھا ٹیل کو۔“ احمر جلدی جلدی ناشتہ کرنے لگا تاکہ ٹیل کو بھی کھانا دے سکے، اس نے اپنا ناشتہ مکمل کیا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا، مینائل واجد نے

زد دیدہ نظروں سے اس کی پشت کو دیکھا تھا۔

☆☆☆

مینائل واجد میں بڑی تبدیلی رونما ہو رہی تھیں جسے دیکھتے ہوئے جہاں سب حیرت زدہ تھے وہیں مینائل کو وہ سنسانا ہوا تھپڑ گال سہلانے پہ مجبور کر دیتا تھا، پہلے وہ خود ہی امروز سے باتیں کر لیتی تھی، اس کی کتابیں سی ڈیز لیپ ٹاپ سب بنا پوچھے استعمال کر لیتی تھی مگر اب ایسا نہیں کر سکتی تھی، امر تو پہلے ہی اس سے دوری رکھتا تھا مگر اس واقعے کے بعد سے اس نے تو اس کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا، وہ جتنے سخت لفظوں میں اس کی تذلیل کر گیا تھا وہ مینائل واجد کے دل میں نقش ہو گئے تھے، جو تھپڑ اسے امروز نے مارا وہ تھپڑ اگر اسے کسی بڑے نے اس کے ہیکٹے قدموں کو روکنے کے لئے بہت پہلے مارا ہوتا تو آج شاید کوئی ایسے یوں تحقیر بھری نظروں سے نا دیکھتا، اس نے پوری سچائی سے اپنے رنن کہن اور طور طریقوں پہ نظر ڈالی تھی، زمانہ ودیہہ کی مثالیں دیتا تھا اور اس نے جب اپنی پیاری بہن کے اطوار پہ نظر ڈالی تو اسے زمین و آسمان کے درمیان کا فرق سمجھ آ گیا، ودیہہ کی حیا شرم، ہر کام میں طاق، گھر ہستی میں ماہر، شوہر، بچہ، دیور سب کو اس کی مالا جپتے دیکھ کر اسے سمجھنے میں ذرا دیر نا لگی کہ خود کو تلاوت قرآن اور روزے بھی رکھتی تھی اس کی دنیا گھر اور اللہ کے ذکر پہ ختم تھی، دوستوں، احباب سے ملنا ملنا تھا، ہر کسی کے دکھ سکھ میں آتی جاتی تھی مگر بلا وجہ کی تفریق نہیں کرتی تھی، پہننے اوڑھنے میں اک وقار تھا، گھر سے باہر جاتے ہوئے اکثر حجاب کا استعمال کرتی تھی، حتیٰ امکان کو کشش کرتی تھی کہ نامحرم کا سامنا نا ہو اور ان ساری ادا پہ اسفر جس قدر محبت جتا تھا تھا، جس قدر فخر پہ جملہ ہوئی کی شان میں کہتا تھا ان سب

نے اسے بہت متاثر کیا تھا اور اب وہ جانے انجانے میں ودیہہ جیسی بننا چاہ رہی تھی۔

وہ ودیہہ کے ساتھ کچ کی تیاری میں مدد کرنے کی کوشش کر رہی تھی، آ تو کچھ نہیں رہا تھا مگر وہ کھڑی سب کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”سچی مینا تمہیں اس روپ میں دیکھ کر بے حد خوشی ہو رہی ہے۔“ لچ کو دم پہ چھوڑ کر ودیہہ اسے لئے لاؤنج میں آگئی تھی، وہ ہولے سے مسکرا دی۔

”سچ بتاؤ یہ تبدیلی کیونکر آئی؟“ ودیہہ کو ابھی تک اس بدلاؤ کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔

”امر کے تھپڑ کی وجہ سے۔“ اپنے ناخنوں کو دیکھتے وہ زیر لب مسکراتی، صاف و شفاف نیلر نیل پینٹ سے مبرا تھے، ورنہ تو ہر وقت نیل آرٹ کا شوق پورا کیے عجیب و غریب نقش بناتی رہتی تھی۔

”امر نے تمہیں تھپڑ مارا، کب؟“ ودیہہ کی آواز میں زمانے بھر کا خیر آ گیا۔

”جس صبح آپ مجھ سے رات نشے میں لوٹنے کے باعث ناراض تھیں۔“ وہ نیلر چٹخانے لگی۔

”لیکن کیوں مارا امر نے؟ وہ ایسا تو قطعاً نہیں ہے۔“ ودیہہ کو جیسے صدمہ پہنچا۔

”غلطی میری تھی آئی، میں اکثر اس کے کمرے سے اس کی چیزیں استعمال کرتی تھی بنا اجازت لئے، ہمیشہ لڑکوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا رہا تو بھی احساس نا ہوا کہ مرد سے کتنا فاصلہ رکھ کے بات کرنی چاہیے، لیکن امر میرے سرکل کا نہیں ہے، جو اس بات کو نظر انداز کرتا وہ سمجھ سے دور ہوتا تھا، بات کرتے تو مجھے اس کی اس حرکت پہ چڑھنے لگتی تھی کہ کیا مجھے چھوت کی بیماری ہے جو وہ پوچھتا ہے، میں انجانے میں اس کے قریب ہوتی تو اسے اچھا نہیں لگتا۔“ وہ جب سی ہو



گئی، ودیہ منہ کھولے سن رہی تھی۔

”اس کے چھڑنے احساس دلایا کہ میں کتنی بے وقوف تھی، وہ آپ کو بہت پسند کرتا ہے اور جب میں نے آپ کو حج کیا تو سمجھ آئی کہ آپ کیسے رہتی ہیں، دیور جیسے بچے، بھائی جھتی ہیں اس سے کتنے رکھ رکھاؤ سے ملتی ہیں تب ہی وہ آپ کی بہت عزت کرتا ہے اور عزت مجھ جیسی کی کون کرتا ہے آپ کی، مجھے بس گوشت سمجھ کر رال ٹکاتے رہتے ہیں، قصور ان لوگوں کا نہیں مجھ جیسی لڑکیوں کا ہے جو خود کو کھلا رکھ کر دعوتِ نظارہ دیتی ہیں، اسلام اس کے احکام سے دور، بس مسلمان ہونے پر فخر محسوس کرتی ہیں، لیکن مجھے ترم بھری زندگی نہیں چاہیے آپ کی، میں آپ کی طرح مثال بننا چاہتی ہوں۔“ وہ پوری سچائی سے تجزیہ پیش کر کے اس سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی، ودیہ کو اس پر بے حد پیار آ گیا۔

”صد شکر ہے تمہیں بھی زندگی گزارنے کا صحیح مفہوم تو سمجھ آ گیا۔“ ودیہ کو خوشی ہوئی۔

”آپ آپ امر سے کچھ نا پوچھیے گا۔“ اس نے جھپکتے ہوئے کہا، ودیہ اس کے انداز پر بے ساختہ مسکرا دی تھی، مینائل کے وجود میں آتی تبدیلی دیکھ کر جانے کیوں ودیہ کو لگنے لگا تھا امر اپنا ارادہ ترک کر دے گا۔

”السلام علیکم!“ وہ دونوں اپنی باتیں ہی کر رہی تھیں جب پڑوس کی ناظمہ آنٹی چلی آئیں، بچپن ساٹھ سالہ یہ خاتون بڑی اچھی طبیعت کی تھی۔

”کیسی ہیں آپ آنٹی؟“ ودیہ نے ان کو دیکھ کر پوچھا۔

”کرم ہے مالک کا بیٹا، تم کیسی ہو؟ اور بہن کیسی ہے تمہاری؟ معذرت بچے تمہارا نام بھول گئی،“ ناظمہ آنٹی، وہ دنوں سے بیمار تھیں۔

وہ مینائل سے اک بار پہلے بھی مل چکی تھیں، تب ان کی نگاہ میں اس کے لئے ناپسندیدگی صاف دیکھی جاسکتی تھی جو غالباً اس کے جینز اور شرٹ کے باعث تھی۔

”ہاں بھئی بنگلوز میں رہنے والے ہم لوگ خود کو ماڈرن اور ہائی کلاس کا ثابت کرنے کے لئے ایسی آدمی آدمی فیشن کرنے والی ہماری ہائی کلاس کی بچیاں بھول جاتی ہیں کہ لوڑ کلاس جس مٹی میں دفن ہو گا اسی میں ہم نے بھی ہوتا ہے، ہماری کون سی ہیروں کی کان میں تدفین ہوگی، مجھے تو اس وقت ان بنا دوپٹے میں پھرنے والی عورتوں پر حیا آتی ہے جب اذان کے وقت وہ ادھر ادھر دیکھتی ہیں۔“ اور ودیہ کسی قدر چپکلی پڑ گئی تھی کہ مینائل بھی اسے حلے میں ان کے سامنے برا جہان تھی،

اس نے چنداں اہمیت نہیں دی تھی ان کی بات پر لیکن انہی اسے سلیپ سے شلوار سوٹ میں ملبوس دیکھ کر ناظمہ آنٹی نے اچھا تاثر دیا تھا اس پر مینائل کے اندر تک خوشی دوڑ گئی تھی۔

”کیا لیں گی آنٹی، چائے یا شربت۔“ ودیہ کی اک یہ بھی خوبی تھی کہ ہر آئے گئے کے سامنے ٹرائی بھر کر ریفریجنٹ رکھتی تھی، گھر آئے مہمان کی آؤ بھگت نہایت خوش دل سے کرتی تھی۔

”کھانا پینا بھی ہوتا رہے گا بچے، تم کون سا پرائی ہو، تم سے تو فرمائش کر کے مانگ لوں گی، ابھی تو تم سے ضروری بات کرنے آئی ہوں۔“

ناظمہ آنٹی نے نہایت محبت بھرے انداز سے اسے جواب دیا تھا۔

”جی بالکل کریں، مینا آنٹی کے لئے شربت بنا لو۔“ ودیہ اسے ہدایت دے کر آنٹی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”ساتھ والے بنگلے کو چھوڑ کر تیسرا جو بنگلہ ہے، نفیس صاحب کا، کل انہوں نے مجھے بلایا تھا، تم جانتی تو ہوگی انہیں۔“ ناظمہ آنٹی نے بتا کر جانا چاہا۔

”جی جی آنٹی، جانتی ہوں نفیس صاحب اور ان کی فیملی کو اچھے لوگ ہیں۔“ ودیہ نے تائید کی۔

”ان کی بیگم نے مجھے بطور خاص تمہارے پاس بھیجا ہے کہ میں تم سے بات کروں، اصل میں وہ اپنی چھوٹی بیٹی جیا کے لئے امروز کا رشتہ چاہ رہی ہیں، ان کی پوری فیملی تو امروز بہت پسند ہے، لیکن وہ خود بات کرتے جھجک رہی تھیں، وہی فضول معاشرتی رکاوٹ کہ لڑکی والے کب پہل کرتے ہیں، اس لئے انہوں نے مجھے بھیجا ہے، صوم صلوٰۃ کی پابند، امروز سے اچھی جوڑی رہے گی، تو کیا جانتی ہو تم۔“ ناظمہ آنٹی نے دھیمے لہجے میں جیسے کوئی بم پھوڑ دیا تھا، ودیہ اک لمحے کو چپ سی ہو گئی، مینائل جو ان کے لئے شربت اور ریفریجنٹ کا انتظام کرنے کے لئے اٹھنے لگی تھی اک دم سے لڑکھڑا کر صوفے پر واپس بیٹھ گئی،

ودیہ نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا تھا۔

”آنٹی میں خود سے کوئی فیصلہ کیسے کر سکتی ہوں، میں اسفر اور اسپیشلی امر سے تذکرہ کرتی ہوں، وہ دونوں جو رائے دیتے ہیں پھر میں آپ کو مطلع کر دوں گی۔“ ودیہ نے خلوص سے انہیں جواب دیا تھا، بہن سے محبت اپنی جگہ تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ امروز اسے پہلے ہی ریجیکٹ کر چکا تھا۔

”ہاں یہ بھی بجا کہا تم نے، پھر تم دونوں سے بات کر لو اور مجھے بتا دو تا کہ میں تمہارا جواب بیگم نفیس تک پہنچا سکوں۔“ ناظمہ آنٹی مطمئن ہو گئی تھیں۔

”اچھا پھر میں چلتی ہوں۔“ ناظمہ آنٹی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”ایسے کیسے رکیں نا شربت تو پتی جاگس۔“ ودیہ نے اصرار کیا، مینائل تیزی سے لاؤنج سے نکل گئی تھی۔

☆☆☆

محبت تیرے انجام پہ رونا آیا  
جانے کیوں آج تیرے نام پہ رونا آیا  
ڈنر کی میز پہ ودیہ نے ناظمہ آنٹی کا مدعا پورے سیاق و سباق سے سنا دیا تھا، اک پل کو خاموشی طاری ہو گئی تھی، مینائل وادج پوری توجہ سے سنتی پلاؤ کھا رہی تھی۔

”رشتہ تو واقعی اچھا ہے، نفیس صاحب اور ان کی بچیوں کی بہت اچھی شہرت ہے، سب ان کے کردار کی گواہی دیتے ہیں، باقی فیصلہ تو امر کا ہوگا۔“ اسفر نے نہایت روائی سے چند جملے کہہ رہے تھے اور مینائل کو جیسے یہ جملے کانٹے کی طرح چبھنے لگے تھے۔

”کیا یہ عزت و تکریم والا جملہ کوئی مرد میرے لئے بول سکتا ہے؟“ وہ جانے کیوں خود اذیتی سے سوچنے لگی تھی، پلاؤ حلق میں پھنسنے لگا تو اس نے پانی کا گلاس تھام لیا، گلاس کی تلاش میں نظر دوڑاتے اس کی نظر بلا ارادہ امروز کی طرف اٹھ گئی تھیں وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا، اگلے ہی پل اس نے پانی کا گلاس بھر کر اس کی طرف بڑھادیا تھا۔

”بولو امر، تمہاری کیا رائے ہے، کم و بیش تمہاری آئیڈیل جیسی ہے۔“ ودیہ نے مسکرا کر اس کا مدعا جانا چاہا۔

”میرا جواب تو ہاں میں ہے، جیا اچھی لڑکی ہے لیکن آپ ابھی ناظمہ آنٹی کو کوئی جواب نا دیجئے گا میں اک بار تفصیل سے سوچنا چاہتا ہوں



اس بارے میں، لیکن مجھے یقین ہے کہ میرا جواب تب بھی ہاں میں ہی ملے گا آپ کو۔ وہ بے حد مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا، مینائل واجد سے بیٹھنا دوبھر ہو گیا تھا، ودیہہ کی بھی آخری آس دم توڑ گئی۔

”جیسی تمہاری مرضی۔“ اس نے خوش دلی سے کہہ کر بات ختم کر دی۔

”بھئی آج پلاؤ تو بہت مزے کا ہے، ودیہہ نے بتایا تم نے بنایا مینا۔“ اسفر پلاؤ انجوائے کرتے تعریف کر رہا تھا، درحقیقت اسے بھی مینائل سے ودیہہ کی نسبت بہن جیسی محبت تھی اسے خبر نہیں تھی کہ انجانے میں وہ مینائل کی دھمتی رگ پہ وار کر گیا ہے۔

”جی آئی سے کوکنگ سیکھ رہی ہوں، تاکہ واپس جاؤں تو مہما تھوڑی خوش تو ہوں کہ مجھے بھی کچھ آگیا ہے۔“ اس نے بھی دل پہ نہیں لیا تھا، اسفر نے براہ راست اس کی ذات پہ حملہ نہیں کیا تھا اس نے تو اک آزادانہ رائے دی تھی اور لڑکیوں کے متعلق ان کے کردار سے جڑی رائے کتنی اہمیت رکھتی ہے، یہ نائیٹ کلب اور لڑکوں کے ساتھ آزادانہ میل جول رکھنے والیاں نہیں جان سکتی ہیں جب تک کہ انہیں مینائل واجد کی طرح تماچے نا لگیں۔

☆☆☆

عید میں چند دن ہی رہ گئے تھے، چھٹی کا دن تھا جب سب محفل جمائے بیٹھے تھے۔

”ودیہہ! عید میں چند روز ہی رہ گئے ہیں، ہماری مینا کی پہلی عید ہے ہمارے ساتھ، اسے بہت اچھی شاپنگ کروانا۔“ اسفر خوش دلی سے ودیہہ کو ہدایت کر رہا تھا۔

”میں اب واپس جانے کی بارے میں سوچ رہی ہوں اسفر بھائی، آپ میری گھٹ

او کے کردار میں پلیز۔“ اس کے اچانک فیصلے پہ سب اک لمحے کو چپ سے ہو گئے تھے۔

”اتنا اچانک جانے کا فیصلہ کیوں، بورہو مٹی ہو کچھ برا لگا۔“ اسفر حیرانی سے دریافت کر رہا تھا، ودیہہ چپ سی تھی، امروز نے اک اچھٹی نگاہ اس پہ ڈالی تھی تو کھوٹی کھوٹی سی اپنی تھیلی پہ نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

”نہیں اسفر بھائی ایسا کچھ نہیں، اتنے دن ہو گئے آپ سب کے ساتھ، لوٹنا تو ہے ہی نا۔“ وہ پھیک مسکراہٹ سے گویا تھی۔

”بالکل لوٹنا ہے، لیکن اب عید سے پہلے جانے کا نام بھی نا لینا۔“ اسفر نے دھونس بھری محبت سے کہا تو وہ مدد طلب نظروں سے ودیہہ کو دیکھنے لگی۔

”اسفر ٹھیک کہہ رہے ہیں عید کے بعد چلی جانا۔“ اور وہ چپ سی ہو گئی تھی، اسی اثناء میں قریب رکھا لیڈ نمبر بجنے لگا تھا، امروز قریب تھا اسی نے کال ریسیور، سلام کے جواب بعد اس نے کچھ نہیں کہا تھا، ہاں اس کے منہ کا زاویہ ضرور بگڑا تھا۔

”آپ کی کال ہے۔“ ریسیور سے مینائل کی طرف اشارہ کر کے اس نے ریسیور سائیڈ پہ رکھ دیا۔

”کون ہے؟“ پہلے کی طرح بھاگ کر فون کی طرف لپکے والی کمال سکون سے بیٹھی رہی، وہ جواب طلب نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”وقاص احمد!“ چہرے کے آگے نیوز پیپر لا کر اس نے جواب دیا تھا۔

”کہہ دیں میں بات کرنا نہیں چاہتی۔“ اس کے کمال سکون سے کہنے پہ پہلے تو اسے ہلاکا غصہ آیا کہ وہ اس کا بی اے کب تھا جو وہ بیٹھی اسے ہدایت دے رہی تھی مگر ودیہہ کی نظر خود پہ

محسوس کر کے اس نے سائیڈ رکھا ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

”جی وہ آپ سے بات کرنا نہیں چاہتیں۔“ اس نے من و عن پیغام دے کر ریسیور رکھنا چاہا، مگر دوسری طرف سرعت سے اسے ٹھہرنے کو کہا جانے لگا۔

”ویٹ ویٹ کیوں بات نہیں کرنا چاہ رہی، اس نے تمام جگہ مجھے ہلاک کر دیا ہے، اس سے میرا قصور تو پوچھ لیں۔“ وقاص احمد دہائی دے رہا تھا، امروز کی نگاہ بے ساختہ اس پہ اٹھی تھی۔

”جب آپ کو ہر جگہ ہلاک کر دیا گیا ہے تو اتنے صاحب عقل تو آپ بھی ہوں گے کہ آپ جان چھوڑ دیں اور اب دوبارہ اس نمبر پہ کال مت کیجئے گے، میں پیغام رسانی کا کام انجام دینے کو یہاں نہیں بیٹھا ہوں، تاہی آپ کے سوالوں کے جوابات دینے کو۔“ نہایت خشک لب دلچھ میں کہتے اس نے زور دار آواز سے ریسیور کریڈل پہ رکھ دیا تھا، ودیہہ اور اسفر خاموشی سے سب دیکھ رہے تھے، مینائل اپنی جگہ خفیف سی ہو گئی تھی۔

”اب سے میری کوئی بھی کال آئے تو کہہ دیجئے گا میں واپس چلی گئی، تاکہ آپ لوگوں کو میرے جانے کے بعد کوئی تکلیف نا ہو۔“ وہ دھیمی آواز میں کہہ گئی تھی۔

”جی ہم آپ کے لئے جھوٹ بول کر اپنے اعمال سیاہ کریں، جنت میں تو آپ ہی ہمیں لے کر جائیں گی نا۔“ امروز کا جلا بھنا لہجہ اسے مزید عرق ندامت میں ڈبو گیا۔

”امرا!“ اسفر نے تینہی انداز میں کہا تھا، وہ سر جھٹک کر پھر سے صبح کا اخبار چہرے کے آگے تان گیا۔

اسی اثناء میں شیرانی صاحب کی بیٹیاں چلی آئی تھیں، کلب نا آنے اور کال نا پک کرنے پہ

گلہ کر رہی تھیں، ودیہہ احمر کو ہوم ورک کروا رہی تھی، اسفر اور امروز کی گفتگو کا رخ بزنس کی طرف ہو گیا تھا۔

”میں اب کلب نہیں آؤں گی مجھے دھوکا باز لوگوں سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا، بہتر ہوگا اب تم لوگ بھی مجھ سے رابطہ نا کرنا۔“ وہ اپنی بات کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی، شیرانی صاحب کی بیٹیاں منہ بناتی چلی گئی تھیں۔

☆☆☆

دل کی یہ ضد ہے کہ اب عید مناؤں میں بھی کوئی اس دل سے کہے دل نا جلانے میرا ودیہہ احمر شاپنگ کا کہہ کر اسے ساتھ لے گئی تھی اور اس کے نانا کرنے پہ بھی کئی جوڑے، جوتی اور میچنگ چیزیں اسے زبردستی دلا دی تھی، بیڈ پہ پڑافان لکر کا دیدہ زیب جوڑا جس پہ جا بجا ریڈ فلاور بنے ہوئے تھے، بے حد خوشنما دکھائی دے رہے تھے، میچنگ جوتی، جیولری، چوڑیاں، بکھری پڑی تھیں، وہ یاسیت سے انہیں دیکھتی بیڈ پہ بیٹھ گئی تھی، دل اتنا پریشان تھا کہ کسی کل چین نہیں آ رہا تھا، عید کے بعد وہ یہاں سے چلی جاتی، امروز کی جیا سے شادی ہو جانی اور وہ..... وہ کیا کرتی..... بے حد کرب سے آنکھیں میچتے اس نے بیڈ سے سر نکالیا تھا، آنسو بند پلکوں سے بننے لگے تھے، اس نے بڑی بے فکر مست ملنگ زندگی گزار رہی تھی، کبھی کسی بات کو دل پہ نہیں لیتی تھی، چٹکیوں میں ہنس کر اڑا دیتی تھی، کون اسے پسند کرتا ہے کون نا پسند اس نے کبھی یہ جاننے میں دلچسپی ہی نہیں لی مگر اب اسے اپنے لئے نا پسندیدگی کی اک نظر گڑھ جاتی تھی، امروز جس تحقیر بھری نظر سے اس دیکھتا تھا، اس کی موجودگی میں جس قدر بے زاری، نا پسندیدگی کے تاثرات اس کے چہرے پہ ہوتے تھے اس سے مینائل



واجد کا وجود جھلنے لگا تھا، اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کیسے اپنے بارے میں اس کی رائے، اس کے دیکھنے کا انداز بدل دے، چند روز بعد اسے یہاں سے چلے ہی تو جانا تھا، مگر جیسے وہ اپنا سب کچھ یہاں ہار کر جاتی، اپنا غرور، اپنی انا، اپنا زعم کچھ تو نہیں بچا تھا، اس کے پاس، کچھ ہاتھ لگا تھا تو تحقیر بھری نظریں۔

”چاند رات ہے آج، چلو مہندی لگلو الو پارل جا کے۔“ بچن میں صبح کے لئے لوازمات تیار کرتی ودیہہ نے اسے تیار ہونے کا اشارہ کیا۔

”پلیز آپی میرا کہیں جانے کا موڈ نہیں ہے۔“ وہ مسالے گرائنڈ کر رہی تھی، تاکہ صبح ان کاموں میں وقت کا ضیاع نا ہو۔

”اچھا میں ہی لگ دوں گی، بس بچن کا کام ختم ہونے والا ہے۔“ ودیہہ نے اک نظر اس کے اداس چہرے پر ڈالی، وہ اس کا غم سمجھ گئی تھیں مگر وہ بہن کی محبت میں خود غرض نہیں ہونا چاہتیں تھیں۔

بچن سے فارغ ہو کر دونوں لاؤنج میں چلی آئی تھیں، جائے گاگ اٹھائے ودیہہ مہندی کی کون بھی ساتھ لے آئی تھی، مینائل کے منع کرنے کے باوجود اس کی مہندی لگانے لگیں۔

”امرا! وہ تیل کی سیوا کر کے غالباً فارغ ہوا تھا، اس کا گزر لاؤنج سے ہوا تو ودیہہ نے بے ساختہ آواز دے دی۔

”جی بھابی۔“ وہ رک گیا تھا۔

”چائے کا موڈ ہے تو پی لو، مینا کے لئے بنائی تھی یہ پی نہیں رہی۔“

”اپنی بہن کے حصے کی چائے آپ پی لیں، مجھے اپنی والی دے دیں۔“ جانے وہ کیا جتنا چاہا رہا تھا، مینائل واجد کو غصہ آنے لگا۔

”دونوں ہی فریش چائے ہے، کوئی بھی گ

لے لو۔“ ودیہہ نے خوش دلی سے ٹرے اس کے سامنے کی، اس نے اک سرسری نگاہ مینائل واجد پر ڈالی وہ سر مزید اسے دیکھ کر جھکا گئی تھی، قریب آ کر وہ صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

”تم نے مجھے جواب نہیں دیا، میں کیا کہوں ناظمہ آئی سے کہ وہ مسز نفیس کو کیا کہیں۔“ ودیہہ نے اس معاملے کو بھی نبھانا چاہا۔

”ارے میں آپ کو بتانا بھول گیا، میں نے ناظمہ آئی کو جواب دے دیا ہے اتفاقاً کل آفس جاتے نظر آئی تھیں، انہوں نے تذکرہ کیا تو میں نے جواب دے دیا۔“ وہ کمال سکون سے چائے کی چسکیاں لیتے اپنا کارنامہ سن رہا تھا، مینائل واجد کو سانس لینا بھی گراں گزرنے لگا۔

”کیا جواب دیا؟“ ودیہہ کو بھی حیرانی ہوئی۔

”بتایا تو تھا آپ کو، بس اب آپ دیورانی لانے کی تیاری کریں اور اس کے لئے آپ کو نزدیک ہی جانا پڑے گا۔“ وہ شکستہ انداز میں کہہ رہا تھا، ودیہہ مسکرا دی تھی، آخری آس بھی دم توڑ گئی تھی۔

”امر، چھریاں تیز کروائی تھیں نا۔“ اسی دم اسفر بھی چلا آیا تھا اور اس نے شکر ادا کیا کہ موضوع گفتگو تو بدلا۔

”جی بھائی کروالی ہیں آپ بالکل فکر نا کریں۔“

”اور قصائی کو یاد سے اک بار پھر کال کر کے ذہن نشین کرو دو کہ وقت پہ آ کر ہمارا جانور پہلے کاٹے۔“

”وہ ٹائم پہ آجائے گا، میں نے کہہ دیا ہے اسے۔“ اس نے اطمینان دلایا۔

”بھئی ودیہہ بچی بہت مزے دار بنی چاہیے میرے کچھ دوست بھی آئیں گے۔“ اسفر

نے اب کے ودیہہ سے فرمائش کرنے کے ساتھ اطلاع دی۔

”پہلے کبھی کسی نے کھانے کی برائی کی، آپ کی عادت ہے ایسے ہی پریشان ہونے کی، سب باتوں سے بے فکر رہیں، قربانی امر ہی کرتا ہے ہر سال وہ تو قصائی آ کر بونیاں کر دیتا ہے، باقی بچن کا کام میں اور مینا دیکھ لیں گے۔“ اس نے مکمل یقین دہانی کروائی تو اسفر کو سکون نصیب ہوا۔

”چلو اسی بات پہ اپنے حصے کی چائے پلا دو۔“ اسفر نے اس کے سامنے پڑاگ اٹھا لیا تو ودیہہ مسکرا کر گھورنے لگی۔

☆☆☆

صبح عید کا سورج طلوع ہو چکا تھا، آنکھ اک پل کو نا لگی تھی تا، مرد حضرات اور امر نماز عید کے لئے روانہ ہوئے تو انہوں نے بھی جلدی جلدی خود کو سوار کر بچن کی راہ لی۔

نماز کے بعد مرد حضرات گھر لوٹ کر آئے تو تب تک دونوں ناشتہ لگا چکی تھیں۔

”عید مبارک۔“ اس نے ہولے سے کہا تھا اور اک یار پھر تنقیدی نظروں سے میز کا جائزہ لے رہی تھی، عید کے جوڑے میں مناسب میک اپ کیے وہ بہت دلکش لگ رہی تھی اور جب سے اس نے مشرقی لباس زیب تن کرنا شروع کیا تھا مزید حسین لگنے لگی تھی، وہ پٹا سر پہ تھا مگر ہیز کٹ کی کچھ ٹیش بار بار آف و باٹ دوپٹے کے ہالے سے جھلک دکھانے لگتی تھیں، امروز نے اک نگاہ اس کے سراپے پہ ڈالی تھی اور صوفے پہ بیٹھ گیا، جہاں ودیہہ اسفر سے عیدی کا تقاضا کرنی لگھ رہی تھی۔

”مجھے نہیں پتا مجھے عیدی چاہیے۔“ وہ بچوں کی طرح اسفر کے سامنے منہ کر کے بیٹھ گیا۔

امریٹیل کی محبت میں لگا ہوا تھا۔

”بھئی عید قرباں میں کون عیدی دیتا ہے، گوشت ملے گا جتنا چاہو لے لینا، نکلے، بوٹی، پسندے جو بنانا چاہو بنالو۔“ اسفر اپنی جیب کو سختی سے پکڑے اسے ڈاج دے رہا تھا، ودیہہ کا ہاتھ بار بار جیب کی طرف جو جا رہا تھا۔

”ہاں سب کچھ بناؤں اور آپ کو کھلا کر ویٹ بڑھاؤں، مجھے کیا ملے گا جواب میں، عید بس عید ہوتی ہے، مجھے عیدی چاہیے بس۔“ ودیہہ اب روٹنے کا پروگرام بنا رہی تھی اور جب وہ منہ بنا کر رخ پھیر گئی تو اسفر نے خاموشی سے اپنا والٹ اس کی ہتھکی پر رکھ دیا۔

”اب خالی والٹ ہی دوں گی واپس۔“

ودیہہ نے صاف ہری جھنڈی دکھائی، اسفر بے چارگی سے سر پہ ہاتھ رکھ کے رہ گیا، وہ دونوں دچکی سے ان کی محبت بھری نوک جھونک سے محفوظ ہو رہے تھے، بلا ارادہ اس کی نظر امروز سے مل گئی تھیں، اگلے ہی پل اس نے نگاہ پھیر کر کرسی سنبھال لی تھی، وہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا، ناشتے سے فراغت کے بعد قصائی آ گیا تھا، امروز نے قربانی کی تھی، پھر سارا دن بونیاں بنانے میں لگ گیا، وہ ودیہہ کے ساتھ بیچنے کے ساتھ دوسرے آئیٹم بنانے میں جت گئی تھی۔

☆☆☆

عید کا پہلا دن روایتی گہما گہمی، گوشت بانٹنے کے سلسلے کے ساتھ اختتام پذیر ہو گیا تھا، دوسرے دن بھی گھر آئے مہمانوں کی تواضع پارچوں، کوفتے، کباب اور فرانی گوشت سے جاری تھی، صبح سے لگی ودیہہ کی کمر جواب دے گئی تو وہ ذرا آرام کرنے کو لیٹ گئی، کچھ طبیعت بھی ناساز محسوس ہو رہی تھی، تب ہی امروز ودیہہ کے



”بھابھی!“ وہ کچن کی دہلیز پہ ہی رک گیا تھا، اندر کا منظر حیران کن جو تھا، مینائل واجد تندی سے گول گول شامی کباب بنارہی تھی، دوپٹہ بے فکری سے میز پہ رکھ دیا تھا مگر امروز کو دیکھ کر اس نے دوپٹا اٹھا کر شانوں پہ ڈال کر اسے بے ساختہ دیکھا تھا وہ بھی اس کی کارگزاری پہ جیسے سنبھلا تھا۔

”معذرت، مجھے خبر نہیں تھی آپ یہاں ہیں، بھابھی کو ڈھونڈ رہا تھا۔“ وہ پلٹنے لگا تھا۔

”آپ اپنے کمرے میں ہیں۔“ اس نے اطلاع دی۔

”اوکے۔“ وہ کچن سے نکل رہا تھا جب اس کی پکار پہ رک گیا۔

”سینے آپ کو ڈسٹرب مت کیجئے گا۔“ اس سے پہلے کہ وہ اس کے سینے اور آپ جناب پہ حقیر کا اظہار کرتا اس کی تنبیہ پہ اسے دیکھنے لگا، عید کا دوسرا روز تھا بلوکلر کے سوٹ میں ہلکا سا میک اپ۔

”خدا کا سرکتا دوپٹہ بار بار شانوں پہ سنبھالتی وہ کچھ الگ لگ رہی تھی۔“

”کیا ہوا بھابھی کو؟“ اس کے لہجے میں فکر مندی تھی۔

”صبح سے ٹہر چرھا، اب ٹہر پھر تیز ہو گیا تو دوا دے کر بمشکل سلا کر آئی ہوں، بے آرامی اور کام کی زیادتی کی وجہ سے تھک گئی ہیں، چند گھنٹے سکون سے سو جائیں ورنہ پھر لگ جائیں گی کچھ نا کچھ بنانے میں، آپ کو کوئی کام ہے آپ سے۔“

”ہوں۔“ اس نے بتاتے ہوئے بے ساختہ اپنا سیل فون نکال کر کال کرنا چاہی تھی۔

”سینے۔“ اس کی دلچسپ پکار پہ امروز بے ساختہ اسے دیکھنے پہ مجبور ہو گیا۔

”کتنے لوگ ہیں اور کیا کیا بنوانا ہے، بتا دیں۔“ اب وہ کباب فریز کر کے سک میں ہاتھ دھورہی تھی۔

”بھابھی کی طبیعت ٹھیک نہیں، پھر کبھی سہی۔“ اس نے ٹالا۔

”آپ کی فکرنا کریں، سو کر اٹھیں گی تو انشاء اللہ فریش ہوں گی، تھکن اور بے آرامی کی وجہ سے حرارت ہے، بنے گا کیا ڈر میں یہ بتا دیں۔“ وہ تفصیل بنا کر پوچھ رہی تھی۔

”بنائے گا کون؟“ اتنے دنوں کے بعد ان کے درمیان یہ طویل گفتگو ہو رہی تھی۔

”میں بتا دوں گی۔“ اس نے اپنی خدمت پیش کی۔

”آپ؟“ وہ حیرت زدہ تھا۔

”آپ سے بہت کچھ سیکھنے کی کوشش کی ہے، بریانی اور کڑا اسی بنا لیتی ہوں، کباب اور کوئٹے پہلے ہی فریز کیے ہوئے ہیں، دم کا گوشت بنا لوں گی، ابھی میریٹ کر کے رکھ دوں گی تو جلدی بن جائے گا، سلاڈ رائیٹ بھی بن جائے گا، مزید کچھ بنانا ہے تو بتا دیں، بیٹھے میں کچھ بنا لوں یا آکسکریم ٹھیک رہے گی۔“ وہ رٹوٹوٹے کی طرح بول رہی تھی امروز کئی ٹائپے تک کچھ بول نہ سکا۔

”ٹھیک ہے مینو۔“ وہ سکھڑا کی طرح تفصیلات بتا کر اس کی رائے کی خواہاں تھی۔

”نہیں ٹھیک ہے، لیکن آپ کو زحمت ہو گی۔“ اسے شاید اس کی باتوں پہ بھروسہ نہیں ہو رہا تھا، ججہ ججہ آٹھ دن نہیں ہوئے تھے اسے کچن میں گھسے اور وہ دعوت کا اہتمام کرنے کو اٹھ

کھڑی ہوئی تھی، لیکن امروز کو بار بار اسے منع کرنا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا، اس نے باہر سے سب اریج کر لینے کی بات بھی گئی تھی مگر اس نے منع کر دیا تھا۔

”اگر گھر میں دعوت رکھ کر باہر کا کھانا ہی کھانا ہے تو اس سے بہتر ہے آپ انہیں باہر ہی ریزوٹ پہ مدعو کر لیتے، آپ کو بھی اچھا نہیں لگے گا، انہیں باہر کے کھانے گھر میں آئیں، پسند نہیں۔“ اور وہ اس کی جامع دلیل پہ چپ رہ گیا تھا۔

وہ اپنے دوستوں کے معدے کی خرابی کا سوچ کر ہی پریشان ہو گیا تھا لیکن جب رات کو بیف بریانی، کڑا اسی، دم کا گوشت، شامی کباب، کوئٹے رائیٹ سلاڈ کے ساتھ جب اس نے بیٹھے میں کسٹری بھی سرد کر کے اسے میز لگنے کی نوید دی تو وہ ڈرتے ڈرتے میز پہ نظر دوڑانے لگا مگر اس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”کوئی کمی لگ رہی ہے تو بتا دیں۔“ کوئلڈ ڈرنک سلیقے سے رکھتی وہ تنقیدی نظروں سے میز کا جائزہ لیتی استفسار کر رہی تھی۔

”نیٹ کے بعد ہی کوئی رائے دے سکوں گا۔“ اس نے نپا تلا لہجہ اختیار کیا، مینائل واجد کو تعریفی جملوں کی آس تھی بھی نہیں، وہ بس مہمانوں کے سامنے عزت رہ جانے کی دعا کر رہی تھی اور جب اس نے ڈرنک کے بعد میز سینیٹا شروع کیا تو وہ خالی ٹرے اور خالی ڈوٹے خود بول پڑے تھے کہ سب نے رچ کے کھایا تھا۔

”بہت مزے کی بنی تھیں تمام چیزیں، سب نے بہت تعریف کی۔“ وہ اس کے ساتھ میز سینیٹا میں مدد کرنے لگا۔

”شکر ہے اللہ کا۔“ اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا، امروز نے چونک کر اسے دیکھا تھا،

اس کے لئے اس کے وجود کی تبدیلی بہت حیران کن تھی۔

”آپ رہنے دیں میں کر لوں گی۔“ وہ میز سینیٹے سے روک رہی تھی۔

”بھابھی نے کھانا کھالیا؟“ اسے وہ یہ کہ فکر لگی ہوئی تھی۔

”نہیں ابھی تک سوئی ہوئی ہیں، میں جا رہی ہوں ان کا کھانا لے کر ان کے کمرے میں۔“ اسفر اور احمر شہر سے باہر گئے ہوئے تھے، اس لئے مینائل نے اپنا اور وہ یہ کہ کھانا ساتھ ہی نکال لیا تھا۔

”خیال رکھیے گا بھابھی کا، چائے بنائیں تو میرے لئے بھی زحمت کر لیجئے گا۔“ وہ پیغام دے کر چلا گیا تھا، مینائل واجد نے اس کی پشت کو نظر اٹھا کر دیکھا تھا، ورنہ اس کے سامنے تو نظر ارد گرد ہی دوڑتی رہتی تھی کہ کہیں وہ اس کی آنکھوں سے دل کا حال نہ پڑھ لے۔

امروز جیسا مرد اس کی زندگی میں پہلی بار آیا تھا، لڑکوں سے دوستی کر رہی تھی مگر ان میں سے کوئی بھی اس جیسا نہ تھا، سب ہی اس کی خوبصورتی اور ادا پہ واہ واہ کرتے تھے اک امروز ہی تھا جو اس سے نا صرف بدکتا تھا بلکہ اس کی بے تکلفی پہ رچ کے ذلیل کرنے کے ساتھ اک عدد ڈھپنر بھی رسید کر چکا تھا اور اسی اک تماچے نے اس کی زندگی بدل دی تھی، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس تماچے کے بعد اسے امروز سے نفرت ہو جاتی وہ اسے اپنا دشمن سمجھنے لگتی مگر جو تبدیلی رونما ہوئی وہ یکسر الگ تھی، وہ اس کی احسان مند تھی جو اسے راہ راست پہ لے آیا، ماما، وہ یہ کہ نے کتنی جتن کی تھی مگر وہ سب کی باتیں ٹال جاتی تھی، لیکن اب وہ بدل رہی تھی، جانے انجانے میں ویسی ہی بننا چاہتی تھی جیسی امروز کی آئیڈیل تھی۔



”کیسی طبیعت ہے بھابی؟“ ودیہہ اگلی صبح بے حد فرشتی تھی۔

”اللہ کا شکر ہے اب بالکل ٹھیک ہوں، مینا نے زبردستی آرام کروا کر احسان کیا مجھے یہ۔“ ودیہہ تشکر بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ”شکر ہے آپ اکیٹو ہوئیں، کل تو آپ کی بہن صاحبہ نے لاج رکھ لی، حالانکہ میں بہت ڈرا ہوا تھا کہ اگر کسی دوست کا پیٹ خراب ہوا تو سب میری کلاس لیں گے، لیکن ابھی تک ایسی کوئی نیوز نہیں ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے ودیہہ سے شرارتا کہہ رہا تھا ودیہہ ہنس پڑی تھی، مینا نکل واجد نے خاموش نظریں اٹھا کر اس کے مسکراتے چہرے کی طرف دیکھا تھا، اس کا تذکرہ کرتے آج پہلی بار اس کے لبوں پہ ہنسی آئی تھی ورنہ تو اکثر ماتھے پر لکیریں پڑ جاتی تھیں، لب بھینچ جاتے تھے۔

”بڑی اچھی شاگرد ہے میری، بہت جلدی سیکھ گئی ہے سب۔“ ودیہہ نے محبت سے بہن کو دیکھا۔

”آج کی دعوت کا پلان بتائیں گھر پر اریخ کرنا ہے سب یا میں باہر آرڈر کروں۔“ وہ استقبہامیہ نظروں سے ودیہہ کو دیکھ رہا تھا۔

”آج کون لوگ انوائٹڈ ہیں؟“ ودیہہ کو حیرانی ہوئی۔

”میں نے نفیس صاحبہ کی فیملی کو انوائٹ کر لیا ہے، جیا بھی پہلی بار گھر آئے گی تو، میں چاہتا ہوں سب بہت اچھا اریخ ہو، ان فیکٹ میں نے ریڈ کارپٹ تک منگوا لیا ہے ریشمن پہ بچھانے کے لئے۔“ وہ بہت پرجوش ہو کر کہہ رہا تھا، مینا نکل واجد کے اندر چہن سے کچھ ٹوٹا تھا۔

”نفیس صاحبہ..... جیا..... میں سمجھی

نہیں..... اور بالا ہی بالاتم نے انوائٹ کر لیا۔“ ودیہہ کا تجر کم نہیں ہو رہا تھا۔

”شاید آپ کو برا لگا، لیکن بھابی میری ناظمہ آئی سے بات ہوتی رہتی ہے، نفیس صاحبہ کوئی رسم کرنا چاہ رہے تھے میں نے انہیں انوائٹ کر لیا، کہ پہلے ہم جائیں پھر وہ آئیں اس سے بہتر نہیں کہ ہم انہیں ہی انوائٹ کر لیں، جیا بھی آئے گی، جس نے نہیں دیکھا ہے اسے وہ بھی دیکھ لے۔“ امروز نے درزیدہ نظروں سے کولڈ ڈرنک کا گھونٹ لیتی مینا نکل واجد کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھا تھا۔

”اسفر بھی نہیں ہیں، اتنا اچانک سب۔“

ودیہہ کو کچھ عجیب لگا۔

پہلے ہر بات وہ اس سے مشورہ کر کے کرتا تھا اور اب متوقع سسرال سے خود ہی ذیل کر کے اسے سن رہا تھا۔

”بھابی بھی تھوڑی دیر میں آ جائیں گے،

آپ بے فکر رہیں بھابی ہی میری سسرال سے ذیل کر رہے ہیں۔“ اس نے ودیہہ کا تردد دور کیا۔

”اسفر بھی انوالو ہیں؟“ اسے حیرانی ہوئی۔

”جی، بھابی کی رضا سے ہی میں نے سسرالیوں کو مدعو کیا ہے، آپ بس اچھے سے تیار ہو جائیں گا اور تھوڑی دیر بعد میرے ساتھ چل کر اگلی پسند کر لیجئے گا رہن کے لئے۔“ ودیہہ چپ سی ہو گئی تھی، مینا نکل واجد تو پہلے ہی اس کے سامنے چپ رہتی تھی مگر ابھی تو اپنی ہمت نا تھی قدموں میں کہ وہ اٹھ کر اس منظر اور ان دل شکن باتوں سے دور چلی جاتی، امروز مسکرا مسکرا کر شام کی پلاننگ سناتا رہا تھا اور وہ دونوں سننے پہ مجبور تھیں، ودیہہ کو مینا نکل کے لئے بے حد دکھ محسوس ہو رہا تھا۔

کبھی سوچا بھی ہے تم نے کہ اک ضدی سی لڑکی

نا جانے کیوں

تیرے ہر حکم کی تعمیل کرتی ہے

گھر میں اک افراتفری کی فضا قائم ہو گئی

تھی، ودیہہ بہن کے لئے دکھی تھی مگر دیور کی خوشی

کے لئے اسے سارے انتظامات دیکھنا پڑ رہے

تھے، مینا نکل صبر کے ساتھ بیٹھی رہی تھی، لیکن جب

اس کی برداشت جواب دے گئی تو وہ اپنے

کمرے میں آ گئی، لچ کرنے سے منع کر کے وہ

اپنے کمرے میں بند رہی، اسفر اور احمر لوٹ آئے

تھے، ان کی آواز سن کر بھی وہ کمرے سے باہر

نہیں نکلی تھی، زندگی ہمیں ہمیشہ وہی نہیں دیتی جس

کی ہم خواہش کرتے ہیں، یہ تو زندگی یہ منحصر ہے

کہ کس کے ماتھے پہ تاج سجادے اور کس کے

ماتھے پہ کالک لگا دے، وہ خود کو خوش قسمت

گردانتی رہی تھی مگر اک اس مقام پہ آ کر اسے تہی

دامنی کا احساس ہو رہا تھا، اک شخص کے نہیں

ہونے سے اسے اپنی پوری زندگی ویران لگنے لگی

تھی، وہ اب مزید یہاں رک کر اپنا رہا سہا بھرم

نہیں کھونا چاہتی تھی تب ہی اس نے آن لائن

ٹکٹ کروائی تھی رات دو بجے اس کی فلائٹ تھی

اور اب وہ بیگ رکے اپنے کپڑے پیک کر رہی

تھی، اس گھر میں آ کر اسے حقیقی گھر کا مفہوم سمجھ

آیا تھا، جس کے درو دیوار سے محبت، عزت پھوٹی

تھی، لیکن وہ مسافر تھی چاہ کر بھی اس کی مکین نہیں

بن سکتی تھی۔

پینٹنگ کرتے آنکھیں برس رہی تھیں جنہیں

وہ بے دردی سے بار بار رگڑ رہی تھی، اسی اثناء

میں دروازے پہ دستک ہوئی تھی، وہ بولنے کے

قابل بھی نا رہی تھی تب ہی خاموش نظروں سے

بند دروازے کو دیکھتی رہی، دستک دینے والے ہاتھ بھی جان گئے تھے دروازہ کھولنے کی زحمت نہیں کی جائے گی تب ہی دروازہ وا کر دیا تھا۔

کچھ لمبے منتظر رہ کر آنے والے نے بے حد حیرانگی سے کمرے میں بکھرے جا بجا کپڑے کے ڈھیر اور دیگر چیزوں کو دیکھا تھا، بیڈ پہ بیگ رکھے اسے پینٹنگ کرتے بے حد حیرانی سے دیکھ کر اس نے نظریں مینا نکل واجد کی بھیگی پلکوں والی نظروں پہ جمادیں، اسے بھی توقع نہیں تھی کہ امروز اس کی دلہیز پہ کھڑا ملے گا نظریں ملنے پہ اس نے بے ساختہ نظریں پھیر لی تھیں اور کپڑے تہہ کر کے بیگ میں سیٹ کرنے لگی۔

”یہ سب کیا ہے؟“ وہ اندر چلا آیا تھا۔

”پینٹنگ کر رہی ہوں۔“ اس کی آواز پھنسی پھنسی نکلی تھی۔

”اندھا نہیں ہوں، وہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے، لیکن روکیوں رہی ہیں؟“ وہ سخت لہجے میں استفسار کر رہا تھا۔

”لاہور واپس جا رہی ہوں، آن لائن ٹکٹ کروالی ہے، رات دو بجے کی۔“ اس کی طرف دیکھے بناب وہ اٹھ کر ڈرائیونگ سے اپنی پرفیومز کی بوتلیں اٹھا رہی تھی۔

”کس سے پوچھ کر آپ نے اتنی رات کو بٹنگ کروائی، مینا نکل واجد میں کئی بار آپ کو باور کروا چکا ہوں کہ مجھے ایسی آزادانہ لڑکیاں نا پسند ہیں نا ہمارے گھر میں ایسی حرکتیں ہوتی ہیں، یہاں آپ ہم سب کی ذمہ داری پہ موجود ہیں، آپ کی فیملی کو ہم جواب دہ ہوں گے، خدا خواستہ اگر کچھ برا ہو جاتا ہے تو، کوئی نہیں جائیں گی آپ، میں ٹکٹ کینسل کروا دیتا ہوں۔“ وہ حسب عادت اس کی آزادانہ فطرت پہ اک بار پھر برس پڑا تھا۔



”میں بے منت کر چکی ہوں۔“ وہ اپنا نقصان یاد دلانے لگی۔

”مجھ سے لے لیجئے گا، اپنے نقصان کا ازالہ کر لیجئے گا، اکاؤنٹ نمبر دیں ابھی ٹرانسفر کرواتا ہوں پیسے۔“ وہ بے حد چڑ گیا۔

”جانا تو ہے نا، آج جاؤں یا کل؟“ اسے اس کا حق جتنا اچھا لگا۔

”بالکل آپ نے جانا ہے، ہم ساری زندگی آپ کو روکنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے، آئی سمجھ۔“ وہ در پردہ جتا گیا کہ وہ کوئی خوش فہمی کو دل میں جہ تادے۔

”مجھے بھابھی نے بھیجا تھا کہ آپ کو بلا لاؤں، میرے سرسالی آنے ہی والے ہیں، آپ بھی تیار ہو کر آ جائیں اور ذرا ڈھنگ سے تیار ہوئے گا تا کہ ہماری سبلی تا، میری ہونے والی بیوی بھی موجود ہوگی۔“ وہ جیسے اس پر پیٹرول چھڑک گیا تھا، میناںکل واجد نے اک سلگتی نظر اس پر ڈالی تھی۔

”آپ کے سرسالی آرہے ہیں، آپ ان کی آؤ بھگت کریں میں نے کسی کو انٹرین کرنے کا ٹھیکہ نہیں لیا ہوا، میں نہیں آؤں گی باہر۔“ اس نے تروخ کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”یہ نخرے یہ تورا اپنے گھر جا کر دکھائیے گا، میں کبھی اجازت نہیں دوں گا کہ آپ کی وجہ سے ہماری سبلی ہو، آپ نہیں آئی تو بلا وجہ باتیں بنیں گی کہ شاید آپ کو میری خوشی سے صدمہ پہنچا ہے اور میں اپنے سرسالی اور جیا کے سامنے کوئی اسکینڈل پہلے دن سے افورڈ نہیں کر سکتا۔“ وہ سختی سے باور کراتے اس کے بیگ کی طرف بڑھ گیا تھا، ان میں سے کپڑے نکال کر بیڈ پر رکھنے لگا، جیسے انہیں جانچ رہا ہو۔

”یہ ڈریس پہن کر جلدی تیار ہو کر آ

جائیں۔“ پنک کھرکا سوٹ اس کے سامنے رکھ کر دھونس سے کہہ رہا تھا۔

”میں آپ کی پابند نہیں؟“ وہ جل ہی تو گئی۔

”دس منٹ ہیں آپ کے پاس میرے مطابق تیار ہو کر نا آئیں تو اسی حلیے میں سرسالیوں سے ملو اؤں گا آپ کو، اتنا تو آپ مجھے جان گئی ہیں کہ میں اپنا کہا پورا کرتا ہوں۔“ وہ مسکراتی ہوئی نظر ڈال کر چلا بنا اور وہ چلبلا گئی۔

☆☆☆

”عظیم و شان شہنشاہ ہے نا، حکم کرے گا اور میں اس کی تعمیل کو اٹھ کھڑی ہوؤں گی۔“ وہ کمرے میں ٹہل رہی تھی، سوٹ کا گولہ بنا کر دیوار پر دے مارا تھا۔

”دیکھتی ہوں کیسے نہیں جانے دیتا ہے میں بھی جا کے دکھاؤں گی۔“ اس کے اندر پھر سے اپنی سی کرنے والی میناںکل واجد سر اٹھانے لگی تھی، ٹہل ٹہل کر تھک گئی تو دونوں پیٹھ لٹکا کر بیڈ پر بیٹھ گئی اسی اثناء میں دستک ہوئی تھی امروز کا خیال کر کے وہ چپکی بیٹھی رہی نظریں دروازے پر جمی تھیں۔

”تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔“ اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ یہ کہہ کر بے حد چونک گئی، وہ یہ نہک سک سے درست ڈیزائن سوٹ پہنے میک اپ کے لئے تیار کھڑی تھی، وہ یہ کہ تیار اور دھنکے چہرے کو اس نے گلہ آمیز نظروں سے دیکھا تھا۔

”میں نہیں آؤں گی باہر، مجھے کوئی دلچسپی نہیں آپ کے دیور کے سرسالی سے ملنے میں۔“ وہ کشن کو دیکھ کر کھنکھاتی انداز میں فیصلہ سنا گئی۔

”پلیز اچھی بہن نہیں ہو، مہمان آچکے ہیں، میں اس کی پاگل ہو رہی ہوں، آ کر تھوڑی مدد کر

دو۔“ وہ یہہ نے لجاجت سے کہا تو بہن کی پریشانی محسوس کر کے وہ اٹھنے کو تیار ہو گئی۔

”ٹھیک ہے میں آپ کی مدد کے لئے چلتی ہوں کچن میں، لیکن مہمانوں کے سامنے نہیں آؤں گی۔“ اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”اچھا مت آنا، کپڑے تو چنچ کر لو، بالفرض سامنا ہو گیا تو اچھا محسوس نہیں ہوگا، میری بہن عید کے تیسرے روز سر جھاڑ منہ پہاڑ پھر رہی ہے۔“ وہ یہہ اسے کی طرح رام کرنا چاہ رہی تھی۔

”پلیز آپنی اصرار مت کریں، میں نے ویسے بھی تھوڑی دیر میں انٹرپورٹ کے لئے نکلنا ہے۔“ وہ بے زار بیٹھی تھی بھلے اس نے وہ یہہ تو کیا خود سے بھی اپنے دلی جذبات بیان نہیں کیے تھے، لیکن اسے وہ یہہ سے اس توقع نہیں تھی کہ وہ دیور کے سرسالیوں کی آمد یہ کھلی کھلی پڑے گی۔

”ہاں بتایا امر نے، ہم اور ایسی بے وقوفیاں کر کر کے مجھے بس شرمندہ کرنے کے نت نئے طریقے ڈھونڈا کرو۔“ وہ یہہ نے فحاشی سے اسے دیکھا۔

”پہلی جاؤں گی جلد آپ کے گھر سے تب آپ کو کوئی شرمندگی نہیں ہوگی۔“ وہ نہ خٹے پن سے بولی، وہ یہہ سر کپڑے رکھ گئی، وہ ہر بات کا الٹا اثر ہی لیتی تھی۔

”امرا! دروازے سے امروز گزرا تو وہ یہہ بے ساختہ اسے پکار بیٹھی۔

”جی!“ وہ دلہیز سے ہوتا کمرے میں آ کھڑا ہوا۔

”تم تو کہہ رہے تھے یہ تیار ہو رہی ہے یہ تو ابھی تک جانے کی رٹ لگائے بیٹھی ہے۔“ وہ یہہ نے امروز سے شکایت کی، میناںکل بے حد تحیر سے وہ یہہ کے انداز کو دیکھ رہی تھی، اسے وہ اپنی بہن کم اور امروز کی زیادہ لگ رہی تھی، جس طرح

اس کی شکایت لگا رہی تھی، امروز نے اپنا سلیکٹ کیا ہوا سوٹ گولے کی صورت کا ریپٹ یہ پڑا دیکھا، وہ کشن گود پر رکھے بے زار بیٹھی ہوئی تھی۔

”آپ جا کر مہمانوں کو دیکھیں میں آتا ہوں۔“ امروز نے وہ یہہ کو روانہ کیا، وہ یہہ کے پیچھے وہ بھی نکلنے لگی تھی تا کہ کچن میں اس کی مدد کر سکے مگر اسے رکنا پڑا تھا، امروز نے اس کا بازو پکڑ لیا تھا، اس نے بے حد چونک کر اپنے بازو پہ موجود اس کے ہاتھ کو دیکھا تھا۔

”تیار ہونے کا کہہ کر گیا تھا میں۔“ وہ اک اک لفظ یہ زور دے کر بول رہا تھا، جتنی سختی لفظوں میں آ رہی تھی اتنی سختی سے بازو پہ انگلیاں گاڑھ رکھی تھیں۔

”اور میں نے کہہ دیا تھا تیار نہیں ہوں گی۔“ اس نے بھی ہٹ دھرمی سے کہا۔

”شرافت سے سوٹ اٹھائیں اور چنچ کر کے دس منٹ میں تیار ہو جائیں، میں یہیں موجود ہوں۔“ وہ آرام سے کرسی پہ بیٹھ چکا تھا، میناںکل واجد نے غصہناک نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”گو۔“ تحکم بھرے لہجے پہ میناںکل واجد جھٹکے سے سوٹ اٹھا کر ڈرینگ روم کی طرف بڑھ گئی تھی، وہ اپنی وجہ سے وہ یہہ کو مزید شرمندہ نہیں کر سکتی تھی، اوپر سے امروز سر پہ سوار تھا۔

چنچ کر کے آئی تو وہ بدستور کمرے میں موجود تھا۔

”جو بھی ڈینٹ پینٹ کرنا ہے، پانچ منٹ میں کر لیں، تا کہ کوئی دھلے منہ پہ خوف سے چھینٹنا مارنے لگے۔“ وہ پنک جوڑے میں برآمد ہوئی تو وہ دلچسپی سے دیکھنے لگا، پنک جوڑے میں روٹی روٹی خود بھی پنک ہو رہی تھی، اس کے حوت کر نہ میناںکل واجد نے گھبرا کر کہا۔



وہاٹ کرتے پا جامہ میں وہ بے حد وجہ لگ رہا تھا۔

”آپ کے سرالیوں نے مجھے پسند کرنا ہے۔“ وہ چلبلا کر لیکویڈ فاؤنڈیشن کے ڈراپ چہرے پہ نقطوں کی صورت لگا کر اسے چہرے پہ مکس کرنے لگی۔

”ایسا ہی سمجھ لیں۔“ وہ قریب چلا آیا تھا اور اس کی جیولری باکس میں جھانکنے لگا، بلشر کے بعد اس نے لائسنر اور مسکارا لگا کر نیچرل کلر کی لب اسٹک لگا کر فارغ ہوئی تو تب تک وہ جیولری اس کے سامنے رکھ چکا تھا۔

”دیکھ لیں یہ میچنگ ٹھیک ہے، نہیں تو اپنی مرضی سے نکال لیں۔“ اس نے جیولری سامنے کی۔

”یہ ہی ٹھیک ہے۔“ وہ بے زاری سے ایئر رنکڑاٹھا کر پہننے لگی۔

”ہو گئی آپ کے سررالی کے شایان شان تیار، اب تو آپ کی سبکی نہیں ہوگی یا، چلیں۔“ وہ سخت تیوروں سے اسے دیکھ رہی تھی، بیڈ سے دوپٹا اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا جس کے آنچل اور کناروں پہ پتک پٹیاں لگی ہوئی تھیں، دوپٹے اس کے ہاتھ سے لے کر دونوں شانوں پہ ڈالتے اس نے سینڈل پیروں میں ڈالی اور کمرے سے نکل گئی، امروز اس کے ہم قدم تھا۔

☆☆☆

ہال ایریا میں پہنچ کر لوگوں کی گہما گہمی نے اس تیز رفتاری کو بریک لگا دیا۔

”لیس مینا بھی آگئی۔“ وہ یہہ ہی اس تک آئی تھی اور اسے ساتھ لے کر لوگوں کی طرف بڑھ گئی تھی، وہ اجنبی لوگوں پہ نظریں دوڑا رہی تھی مگر ممما، بابا ماموں اور اپنے لوگوں کو دیکھ کر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”ممما!“ وہ تحیر سے ان کے گلے لگ گئی تھی۔

”ماٹا اللہ، میری بیٹی تو بہت اچھی لگ رہی ہے پیاری سی گڑیا۔“ ممما اسے دیکھ کر بے حد خوش ہو رہی تھیں۔

”بڑی کھنڈ بھی ہو گئی ہے۔“ وہ یہہ نے خوش دلی سے تعریفی کلمات کہے۔

”مجھے خبر تھی، تم اسے ضرور سدھار دوں گی۔“ ممما کو اسے اس روپ میں دیکھ کر بے حد خوشی ہو رہی تھی۔

”اس کے لئے آپ امر کو تھینکس کہیں ممما۔“ وہ یہہ مسکرا کر ماں کے شانے پہ جھول گئی، ماموں سے باتیں کرتا امروز انہیں ہی دیکھ رہا تھا، اس کے کان بھی ادھر ہی لگے تھے، مینائل واجد نے بھی اک نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا، وہ بے حد خوش لگ رہا تھا، مینائل کے دل میں کمک سی ہونے لگی، ممما اور باقی سب کی سر پرانگ آمد نے حیران کر دیا تھا۔

”آپ سب اچانک۔“ اس نے حیرت کو زبان دی۔

”اسفر، بطور خاص لینے آیا تھا، کیسے نا آتے۔“ ممما ہنس رہی تھیں اس نے وہ یہہ کو دیکھا۔

”مجھ پہ بھی ممما کے آنے کے بعد حقیقت کھلی۔“ وہ یہہ معنی خیزی سے مسکرا دی۔

”امر کے سررالی نظر نہیں آ رہے؟“ اس نے طائرانہ نگاہ ڈال کر وہ یہہ سے استفسار کیا، لیکن وہ یہہ اسفر کی پکار پہ چل دی تھی۔

”کہاں ہیں آپ کے سررالی جن سے ملوانے کے لئے آپ بے چین تھے۔“ امروز قریب آیا تو اس نے سہلکتے ہوئے سوال کیا۔

”یہ رہی میری سررالی جن سے آپ بڑی

محبت سے مل رہی تھیں۔“ وہ اسے بھرپور نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا، ادھ کھلے بال بائیں شانے پہ ڈالے وہ منہ کھولے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”میں سمجھی نہیں۔“ وہ سراپا سوال تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا وہ یہہ نے اسے پکڑ کر صوفے پہ بٹھا دیا تھا۔

”چلو بھی شروع کرو۔“ وہ بہت اچنبھے سے سب سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی، آنکھیں حیرت سے پھٹنے کو تیار ہو گئیں جب امروز اس کے پہلو میں آ کر بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”سررالیوں سے تو واقفیت ہو گئی ہی، لیکن میری ہونے والی بیوی کو تو اچھی طرح جانتی ہوں گی۔“ رنگ پہناتے وہ دھیمی آواز میں سرگوشی کر گیا تھا، اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”حیرت زدہ ہونے کے لئے عمر بڑی ہے ابھی امر کو رنگ پہناؤ۔“ وہ یہہ نے ممما سے لے کر رنگ اسے تھما لی۔

”آئی!“ وہ تحیر سے منمننا کر رہ گئی۔

”چلو شاہاش۔“ اس کی سوالیہ نظروں کو قابل اعتنا جان کر وہ یہہ نے رنگ اسے تھما لی۔

”پہنا بھی دیں، کیا ساری زندگی ہاتھ بڑھائے بیٹھا رہوں۔“ امروز نے اک بار پھر سرگوشی کی تو اس نے خاموشی سے رنگ پہنا دی، مبارک باد کا شور ساج گیا۔

”کیسا لگا سر پرانز۔“ اسفر اسے شونی سے چھیڑ رہا تھا، احمر ادھر ادھر بھاگ رہا تھا، اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا، پر تکلف کھانا ہوا تھا، سب ہی خوش گوار موڈ میں خوش باش تھے، وہ یہہ سب کو لے کر لاؤنج کی طرف بڑھ گئی تھی، اسے خبر تھی مینائل کے اندر بہت سے سوال اودھم مچا رہے ہوں گے اور اسے جواب جاننے کا پورا

موقع ملنا چاہیے تھا۔

ہال میں اب صرف وہ دونوں رہ گئے تھے، آگے کی زمین چٹنی تھی جس پہ گھاس اور کٹی پیئر استادہ تھے، ہلکی ہلکی بارش بھی شروع ہو چکی تھی جو دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار ہونے لگی تھی، ہرے بھرے درخت کھڑے تھے، امروز بھی ستون سے لگ کر سینے پہ ہاتھ باندھ کر باہر کا منظر دیکھنے لگا تھا، پھر اک نظر اس پہ ڈالی۔

”کیا ہے یہ سب؟“ وہ اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

”باقاعدہ سب کی موجودگی میں منگنی کی ہے اب بھی پوچھ رہی ہو۔“ وہ ہنسا۔

”اکی نفرت، اتنی بے زاری کا اظہار کرنے کے بعد کیوں ہوا یہ سب، میں یہ ہی تو جانا چاہتی ہوں، محبت تو بھی ہو نہیں سکتی آپ کو مجھ سے، ہر وقت مجھ میں خامیاں جو نظر آتی ہیں۔“ وہ غصی بھری نظروں سے اسے جانچ رہی تھی، وہ بھرپور انداز سے مسکرا دیا۔

”مجھے محبت بھلے نارسی لیکن تم تو محبت کرتی ہونا مجھ سے؟“ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا، اس کی نظروں کا سامنا کرنے کی تاب نالا کر وہ برستی پوندوں کو دیکھنے لگی تھی، چہرے پہ فحالت کے رنگ بکھر گئے تھے۔

”کوئی نہیں۔“ اس نے ہولے سے جھٹلایا تھا، وہ پھر مسکرا دیا۔

”اگر آپ نے آپ سے کوئی بات کی ہے یا آپ کو کسی طور مجبوراً یہ رشتہ کرنا پڑا ہے تو آپ کو زبردستی یہ رشتہ نہیں کرنا چاہیے توڑ دیں اسے، آپ جیسا سے ہی شادی کریں جو آپ کو سوٹ کرتی ہے اور جس کے کردار میں بھی کوئی جھول نہیں، آپ اس پہ آنکھیں بند کر کے یقین کر سکتے ہیں جب کہ میں.....“ انگلی میں موجود کچھ دیر قبل



پہنی جانے والی رنگ کو گھماتے ہوئے وہ نہایت سنجیدگی سے کہہ رہی تھی، آخر میں لہجہ رندہ گیا تھا۔

”میں چاہوں بھی تو اپنا کیریکٹر سرٹیفکیٹ کبھی آپ کو دکھا کر آپ کی نظر میں معتبر نہیں ہو سکوں گی، بہتر یہ ہی ہے شریک سفر اسے بنا لیں جس سے مکمل بھروسہ ہو، آپ جیسا ہے شادی اور منگنی کریں اور ہر رنگ اسے ہی پہنائیں۔“

مینائل واجد نے رنگ اتار کر اس کی طرف کیا تھا، امروز کوئی ثانیہ نہایت سنجیدگی سے اس کے لفظوں کو توڑتا رہا پھر اس کی ہتھیلی میں موجود رنگ اٹھالیا، لمبی سانس خارج کرتے مینائل واجد نے اک بار پھر نگاہ باہر کے خوبصورت منظر پر جمادیں، دل کر لانے لگا تھا، نگاہیں جھلملانے لگی تھیں اسے یہ سب دیکھنے کی کارستانی لگ رہی تھی، ورنہ وہ جانتی نہیں تھی کہ وہ اس سے کس حد تک نفرت کرتا تھا، وہ اس منظر سے ہٹنا چاہ رہی تھی، تب ہی پلٹنے کے لئے اس نے قدم آگے بڑھائے تھے مگر اس کا بازو پکڑ کر اسے سامنے کھینچ لیا گیا تھا۔

تمہاری ذات سے آگے دکھائی کچھ نہیں دیتا محبت مشورہ کب ہے جو سارے شہر سے کر لیں اس نے دھیمے سے سرگوشی کی تھی، اس کے قدم لڑکھڑاسے گئے۔

”ناہی مجھ پہ کسی کا زور چلتا ہے اور ناہی میں نے کوئی ترس ٹانپ چیز کھا کر تمہیں زندگی میں شامل کیا ہے، سمجھیں۔“ اک اک لفظ پہ زور دے کر اس نے بازو چھوڑ کر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

سے رنگ اس کی انگلی میں پہنا دی تھی، وہ کچھ بولنے کے قابل نہ رہی تھی، یوں بھی اس کے غصے کے آگے اب ڈر لگنے لگا تھا۔

”یہ سچ ہے کہ تم جس روپ میں میرے سامنے آئیں مجھے اچھا نہیں لگا، تمہارے رنگ ڈھنگ، تمہاری آزادی میں بہت ہاتھ تمہاری ناگہمی اور ماحول کا اثر تھا، لیکن جب اک تھپڑ لگا کر وہی لڑکی سدھرنے لگی تو مجھے نوٹس کرنا پڑا، میرے لئے خود کو بدلنے والی، مجھ سے محبت کرنے لگی تھی، یہ احساس ہی خوش کن تھا، تمہاری تبدیلی مجھے میرے دل میں موجود تمہارے بارے میں رائے کو بدل رہی تھی، تم بری نہیں تھیں فطرتاً اور جب تمہیں سبق ملا تو تم نے راہ بدل لی تمہیں مصنوعی اور فطری چیزوں کی پہچان ہو گئی، عورت کا تقدس اس کا مقام سمجھ آ گیا تو مجھے ہی تم اچھی لگنے لگیں کہ میری تم سے کون سی خاندانی دشمنی تھی۔“ وہ خاموشی سے اسے سن رہی تھی، امروز نے اس کے دونوں بازو تھام کر مقابل کھڑا کیا ہوا تھا۔

”جب چناؤ الا قصہ شروع ہوا تو تمہاری بے کلی مجھ سے کیا عکس سے چھپی تارہ سکی، میں نے بھائی کو کہہ دیا کہ وہ ناظم آگنی کو منع کر دیں اور یہ بات وہ یہہ بھابھی سے شیرنا کریں، پھر میں نے بھائی کو راز دار بنایا، بھائی نے تمہاری ماما، پاپا سے بات کی، ان سب میں ہم نے وہ یہہ بھابھی کو بھی لاعلم رکھا، تم دونوں بہنوں کی شکل دیکھ دیکھ کر ہم انجوائے کرتے تھے، پھر بھائی ممالوگوں کو خود لینے چلے گئے، آج کی تقریب بھی ہم نے پہلے ہی پلان کر رکھی تھی، ممالوگوں سے بھی راز داری کی درخواست کی، صرف تم دونوں لاعلم رہیں۔“ وہ مزے سے اپنا اور اسفر کا کارنامہ سنا

”تو جیانا نہ صرف مجھے چلانے ستانے کو چل رہا تھا۔“ وہ خفگی سے گھور رہی تھی۔

”اور نہیں تو کیا؟“ وہ مسکرا دیا۔

”کتنے چیخ رہی ہیں آپ؟“

”وہ تو ہوں اور کچھ۔“ مینائل نے اپنے بازو اس کی گرفت سے آزاد کرائے۔

”اور جو میں انکار کر دوں پھر۔“ وہ جانچتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”کر کے دکھاؤ، اک تھپڑ سے سدھارا ہے دوسرے سے جان لے لوں گا۔“ اس کی آنکھیں پھر سے پھل گئیں۔

”ہاؤ مین، کوئی بات نہیں مانوں گی تو آپ مجھ پہ ہاتھ اٹھائیں گے، مسٹر اگر اک تھپڑ برداشت کر گئی تو یہ نا سمجھیں چپ بیٹھ کر مار سہوں گی۔“ وہ اپنے ازلی روپ میں لوٹ آئی۔

”اچھا کیا کرو گی؟“ اس نے مزالیا۔

”اریسٹ کروا کر جیل کروادوں گی، وومن رائٹس کا پتا ہے مجھے۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”ایکلی رہ لو گی؟“ اس کی دھیمی سرگوشی میں وہ چب ہی ہو گئی تھی۔

”شاید نہیں۔“ اس نے ہولے سے اعتراف کیا تھا۔

”سوری۔“ معذرت کی گئی۔

”کس لئے؟“ اس نے ذرا کی ذرا نظر اٹھائی۔

”اس تھپڑ کے لئے۔“ وہ لب دبا گیا۔

”وہ تھپڑ ضروری تھا مجھ جیسی عاقبت نا اندیش لڑکی کے لئے، جو آزادی اور تقدس کا مفہوم سمجھ نہیں پاتیں، ان تمام لڑکیوں کو اک عدد تھپڑ کی اشد ضرورت ہے جو مغربی رنگ میں رنگی نا مغربی بنی ہیں نا مشرقی کہلائی ہیں، بس بے حیائی کا سمپل بن کر صنف نازک کی حرمت و

اپنی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیں

ابن انشاء

☆ اردو کی آخری کتاب

☆ خمار گندم

☆ دنیا گول ہے

☆ آوارہ گرد کی ڈائری

☆ ابن بطوطہ کے تعاقب میں

☆ چلتے ہو تو چین کو چلے

☆ نگرانی پھر اسافر

☆ خط انشائی کے

☆ بستی کے اک کوپے میں

☆ چاند نگر

☆ دل و خشی

☆ آپ سے کیا پردہ

☆ ڈاکٹر مولوی عبدالحق

☆ قواعد اردو

☆ انتخاب کلام میر

☆ ڈاکٹر سید عبداللہ

☆ طیف نثر

☆ طیف غزل

☆ طیف اقبال

لاہور ایڈیڈ، چوک اردو بازار، لاہور

فون نمبرز 7321690-7310797



# دلکش چاند

نائلہ طارق



منہ بنالیا، وہ ہنس پڑا، اس کے انداز پہ پیار آنے لگا۔

”جو چیز بھی لینی ہے لے لو، مجھ سمیت میری تمام چیزیں تمہاری ہیں۔“ وہ محبت بھری سرگوشی کر گیا۔

”بچی۔“ وہ بدگمان تھی۔  
”بچی۔“ وہ اسی کے انداز میں بول گیا۔  
”پہلے تو کہتے تھے میں اپنی کتابیں کسی کو نہیں دیتا۔“ اس نے منہ بسور کر یاد دلایا، وہ اپنا مکالمہ اس کے لبوں سے سن کر بے ساختہ ہنس پڑا۔

”ہاں تو پہلے کہا تھا نا، اب تو اوپن آفر ہے۔“

”اب کیوں ہے؟“ وہ ابرواچکا کے دیکھ رہی تھی۔

”تم نہیں جانتیں؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے دل آویز انداز سے مسکرایا، اس کی پلکیں لرزنے لگی تھیں۔

”نہیں۔“ ہولے سے اعتراف کر کے اس نے مسکراتے ہوئے برستی بوندوں پہ نظریں جما دی تھیں۔

”میں ایسی کئی عیدیں اور بارشیں تمہارے ساتھ دیکھنے کا خواہش مند ہوں۔“ اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا تھا، مینائل واجد نے اک نظر اسے دیکھا تھا پھر اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو اور پھر ہولے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا تھا۔

”میں بھی۔“ دھیرے سے اقرار ہوا تھا، بوندوں کے شور میں عید کی ساعتیں اور محبت بھری فضا کا رنگ کچھ اور گھبر گیا تھا۔

☆☆☆

تقدس کا مذاق اڑاتی رہتی ہیں۔“

”چادر اور چار دیواریوں سے دور عریانیت کو فروغ دے کر ماڈرن کہلائی جاتی ہیں، ان سب کی زندگی میں اک امروز آئے چاہیے جو ان کے ڈگمگاتے قدم کو روک سکے، لیکن بہت ایسی بد نصیب لڑکیاں ہیں جو سب کچھ لٹا کر تہی دامن رہ جاتی ہیں لیکن صد شکر کہ مجھے خسارے سے پہلے عقل آگئی اور اس کے لئے میں آپ کی شکر گزار ہوں۔“ وہ نہایت عملیت کا مظاہرہ کرتی سچائی سے معاشرتی حقائق بیان کر گئی تھی، آخر میں وہ تشکر بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی، وہ مسکرا دیا۔

”اور جو میں واقعی جیا سے شادی کر لیتا پھر کیا کر تیں یہاں سے جا کے؟“ وہ اس کے سنجیدہ اور دلگرفتہ تاثرات کو زائل کرنا چاہ رہا تھا، تب ہی چھیڑنے لگا۔

”ہاں نہیں، زندگی شاید اسی نہج پہ رک جاتی، محبت تو کبھی ختم نا ہوتی آپ سے، بس صبر کر لیتی کہ ہر چیز نصیب میں نہیں ہوتی۔“ وہ مسکرا دی تھی، اک سکون نے اس کے وجود کا گھیراؤ کر لیا تھا۔

”آپ تو خوش رہتے نا جیا کے ساتھ؟“  
”کیا خاک خوش رہتا تھا میں نے۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”کیوں؟“ اسے حیرانی ہوئی۔  
”دن دہاڑے جو چورنی میرے ناول، سی ڈیز، لیپ ٹاپ چوری کرتی رہتی تھی میرا چین سکون بھی چرا کے چل دیتی میں نے خاک خوش ہونا تھا، ویسے شکر ہے کافی دنوں سے میرے کمرے میں کوئی تازہ واردات رونما نہیں ہوئی۔“ وہ ہنسا۔

”باتیں جلی کٹی تھوڑی سنی تھی۔“ اس نے



ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کے تعاقب میں ہے، پوری رفتار سے دوڑتی وہ گھر کے پچھلے حصے میں آئی تھی، کچا طویل وعریض صحن پور کرنی دو مختصر کمروں کی بیرونی دیوار تک وہ پہنچ کر ہی رکی تھی، سر پر دوپٹہ درست کرتی وہ پھولی بے ترتیب سانسوں کو سنبھالتی دے قدموں کھڑکی کے قریب ہوئی تھی، ذرا جو اندر کا جائزہ لیا تو وہ دشن جاں بالکل سامنے سر جھکائے بیٹھا نظر آیا، سرعت سے دیوار سے لگتی وہ بڑھتی دھڑکنوں کو اپنے کانوں میں خود سن سکتی تھی، یہ بڑھتی دھڑکنیں اور بے ترتیب سانسیں تو اس بت بے نیازی کا ایک آمد سے ملنے والی خوشی اور انبساط کا شاخسانہ تھیں، محبوب کو بس ایک نگاہ دیکھ کر دوبارہ جی اٹھنے کی کیفیت بھی کتنی پر کیف ہوتی ہے، فراق میں سلگتے دن رات اور کھٹی سانسوں کی اذیت بھی دیدار کے کیف و سرور میں بھول جاتی ہے، جانے کتنے دن بعد اس کے مردہ وجود میں زندگی بیدار ہوئی تھی، شاید چھ ماہ بعد، بند آنکھوں کے ساتھ دل پر ہاتھ رکھے وہ گہری سانسوں کے درمیان یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی، چھ ماہ کے بے شمار دن رات کی ان گنت ساعتیں اس نے انتظار کے کانٹوں پر چلتے گزاری تھیں، اس بار تو اس کے انتظار نے جسم سے لہو چھوڑ لیا تھا، ایسی بھی کیا مصروفیت تھی کہ مرنے جیسے کی بھی خبر تک نہ لی، وہ دل ہی دل میں بے اختیار اس سے شکوہ کر گئی تھی۔

”ولی! تمہاری ماں نے ضرور تمہارے لئے کوئی لڑکی پسند کر لی ہے اس لئے تو تمہیں شادی کے لئے راضی کر لینے پر بے اندر ہے۔“ اندر سے ابھرتی نانی کی آواز اس کے دل کی دھڑکنوں سے بہت شدت سے ٹکرائی تھی۔

”جی ہاں دادی۔“ جواباً ابھرتی گھبر مدم

آواز پر اس کا دل ڈوبا تھا۔

”اچھی بات ہے، اپنے شوہر اور بچوں کے جھنجھٹ میں اسے یہ تو یاد رہا کہ تم بھی اس کی اولاد ہو، ماں لو ماں کی بات، تمہارا گھر بس جائے گا تو مجھے سکون رہے گا کہ کوئی ہے تمہارے ساتھ تمہارا خیال رکھنے کے لئے، برس روزگار ہو چکے ہو، بیوی کی ذمہ داری اٹھا سکتے ہو، تنہا زندگی گزارنا اگر عورت کے لئے مشکل ہے تو مرد کے لئے بھی آسان نہیں ہے۔“ سانس روک کے وہ نانی کی آواز سن رہی تھی، اسے اپنے جسم سے روح کھینچتی محسوس ہو رہی تھی۔

”دادی! آپ نے اطر دیکھ کر بارے میں کیا سوچا ہے؟“ اندر سے ابھرتی گھبر آواز اسے ساکت و جامد کر گئی تھی، اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ولی نے اس کا نام لیا ہے۔

”میں اس بے چاری کمریوں جلی کے بارے میں کیا سوچوں گی، اس کے باپ کے گناہ نے تو بہت پہلے ہی اس کی قسمت میں زمانے کی ٹھوکریں لکھ ڈالی تھیں، میرے سوچنے سے اس کی قسمت بدل تو نہیں جائے گی، جس طرح دن رات تمہارے لئے دعائیں کرتی، اس کے لئے بھی کر لیتی ہوں اور سب دیکھتی رہتی ہوں اسے سب کی نفرتوں کے درمیان زندگی کا بوجھ ڈھوٹے۔“ نانی کی کرب میں ڈوبی آواز اس کے دل کو ٹھکی میں جکڑ رہی تھی۔

”جاؤ اپنے تایا، چچا سے مل کر جلدی واپس آؤ، میں تمہارے ساتھ کھانا کھاؤں گی، اتنے دن بعد چہرہ نظر آیا ہے تمہارا، بس میرے سامنے بیٹھے رہنا جب تک ہو یہاں۔“ نانی کے شفیق لہجے کو سنتی وہ باہر دیوار سے لگی اب بھی ساکت تھی، سچ ہی تو ہے، یہ وقت تو اس کے لئے بھی قیمتی اور عید جیسا ہوتا تھا کہ جس میں وہ چاند کی طرح اس کے

آگن میں اپنی روشنیاں بکھیرنے کے لئے طلوع ہوتا تھا، اس مختصر وقت میں ملنے والی راحت اور خوش گمانی میں اس کے دوبارہ آنے کا ٹھنک انتظار کسی نہ کسی طرح کٹ جاتا تھا، کمرے سے باہر آتا وہ ایک مل کو ٹھنک کر اس کی طرف متوجہ ہوا تھا جو دیوار سے لگی کھڑی تھی، اگلے ہی پل وہ نگاہ چراتا آگے بڑھ گیا تھا۔

”تم چاہے آخری سانس تک مجھ سے نگاہ چرائے رکھو، لا تعلق رہو مگر میں جانتی ہوں کہ تم وہ سب بھی نہیں کر سکتے جو تمہاری ماں چاہتی ہے، اپنی عمر سے جو کچھ تو میری آنکھوں میں اپنے لئے دیکھتے رہے ہو وہ ایک اہل حقیقت ہے تم اس حقیقت سے نگاہ نہیں چا سکتے، میرے خاموش جذبوں کی شدت تمہارے گرد کھڑی سرد مہری کی دیواروں میں دراڑیں ڈال چکی ہے، تمہیں یہ قبول کرنا ہوگا، مجھے نظر انداز کرنے کے باوجود کہیں نہ کہیں ایک خاموش عہد تم مجھ سے کر چکے ہو، مجھے یقین ہے اپنی دعاؤں، اپنے جذبوں پر کہ تم اس عہد کو نہیں توڑ سکتے، بے شک ساری دنیا مجھ سے نفرت کرتی رہے مگر تم یہ کام بھی نہ کر سکتے۔“ بے آواز بہتے آنسوؤں کے درمیان دل کی دیواروں سے ٹکرائی وہ اپنی چیخوں کو سستی اب بھی ساکت تھی۔

☆☆☆

رات گئے دونوں ماموؤں کے پورن کا کام ختم کر کے وہ پچھلے صحن میں آئی تو اندر سے آتی نانی اور ولی کی آوازوں پر کمرے میں داخل نہ ہو سکی تھی، بہت دن بعد نانی کو ولی سے باتیں کرنے کا موقع میسر آیا تھا، وہ ان دونوں کے درمیان حائل نہیں ہونا چاہتی تھی سو کمرے کی بیرونی دیوار سے ٹیک لگا کر کچے صحن میں ہی بیٹھ گئی، نانی اور ولی کی گفتگو اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی،

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیں

ابن انشاء

☆ اردو کی آخری کتاب.....

☆ خمار گندم.....

☆ دنیا گول ہے.....

☆ آوارہ گرد کی ڈائری.....

☆ ابن بطوطہ کے تعاقب میں.....

☆ چلتے ہو تو چین کو چلئے.....

☆ نگرانی نگرانی پھر اسافر.....

☆ خط انشائی کے.....

☆ بستی کے اک کوچے میں.....

☆ پانڈنگر.....

☆ دل و حش.....

☆ آپ سے کیا پردہ.....

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

☆ تو اندر اردو.....

☆ انتخاب کلام میر.....

ڈاکٹر سید عبداللہ

☆ طیف نثر.....

☆ طیف غزل.....

☆ طیف اقبال.....

لاہور اکیڈمی، چوک اردو بازار، لاہور

فون نمبرز 7310797-7321690



گیمبر لب و لہجہ کے اتار چڑھاؤ کو دل میں محسوس کرتی وہ دانیس چانب خور درو جھاڑیوں اور گھٹی بیلوں سے بھرے گھن کے اس بے ترتیب حصے کو دیکھ رہی تھی، دل دوسوں اور اندیشوں میں گھرا اسے ادھ موا کر رہا تھا، جانے کتنا وقت گزرنے کے بعد اسے اندر پھیلی گہری خاموشی کا احساس ہوا تھا شاید ولی سونے کے لئے ساتھ والے کمرے میں جا چکا تھا، کھڑکی سے جھانک کر اس نے اپنے خیال کی تصدیق کی تھی اور پھر کمرے میں آگئی، دروازہ بند کر کے اس نے لائٹ بھی بند کر دی، تخت پر کھل اوڑھے لیٹیں نانی شاید سو چکی تھیں، ان کے پیروں کے پاس بیٹھی وہ عجیب عجیب سوچوں میں گھری رہی، محسوس کا احساس بڑھنے پر وہ جیسے مرا تپے سے نکلتی اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں کھنکنے والی درمیانی کھڑکی کے نزدیک چلی آئی تھی، صحن کی طرف سے آئی ادھورے چاند کی مدھم روشنی میں وہ پلنگ پر دوسری طرف کروٹ لئے دراز نظر آیا تھا، اطروبہ کے بڑھتے اضطراب نے اسے اکسایا تھا کہ اس کے پاس جائے اور اسے جھنجھوڑ کر جگا دے، اس پر چیخے اسے احساس دلا کہ پوچھے کہ آخر کب تک وہ اسے نارسائی کی آگ میں سلکتا دیکھتا رہے گا، کب تک لبوں پر فضل ڈالے وہ اسے نفرت کی بھٹی میں جلتا دیکھتا خاموش تماشا بنی بنا رہے گا؟ آخر کب تک وہ اس زندان سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس کے سہارے کی منتظر رہے؟ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ تھک چکی ہے، ایک وہی تو ہے جو اس کی آخری امید رہ گیا ہے، جانے کب تک وہ اپنی بے بسی اور جذبول کی بے قدری پر نوحہ خوانی کرتی رہی تھی، ایک وہی تو تھا جو اس کی گھٹن زدہ، تاریک زندگی کے عقوبت خانے کا واحد روزن تھا، وہی اس کے لئے بند کر

دیا گیا تو کس طرح اس کے لئے سانس لینا ممکن رہے گا۔

☆☆☆

دلہیز پر کھڑی وہ بہت ضبط کے ساتھ چور نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی جوانی سے الوداعی کلمات کہتا جانے کی اجازت طلب کر رہا تھا، اطروبہ نے چاہا تھا کہ آج سارا خوف، جھجک بھلا کر اس کا راستہ روک لے، اسے اپنے سانس لینے وجود کے ہونے کا احساس دلانے مگر ایسی جرات کا مظاہرہ کرنا اس کے بس میں نہ تھا، جبکہ ولی اس کے جھکے چہرے پر ایک خاموش نگاہ ڈالتا برابر سے نکلتا چلا گیا تھا، دھندلائی آنکھوں سے وہ اس کی پشت کو دیکھتی رہی تھی جس نے پلٹ کر دیکھنا بھی کبھی گوارا نہیں کیا تھا، دور ہوتا آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اور وہ آج بھی اس کی خوشبو قید کرنے کی کوشش میں ہمیشہ کی طرح ناکام اور نامراد کھڑی رہ گئی۔

صحن میں پھیلے ہولناک سنائے اور تاریکی میں جانے کس شے پر اس کی نظریں ساکت تھیں، جس بڑھتا ہی جا رہا تھا، صبح سے رات کرنا پہلے ہی کٹھن تھا، اب تو ہر آتی رات اس کے لئے ناقابل برداشت حد تک بھاری ہوتی جا رہی تھی، خاموش اور یکطرفہ محبت کا راستہ توار کی دھار سے کم نہیں ہوتا، اپنے لہو لہان پیروں اور زمنوں سے چور وجود کے ساتھ وہ بس اس رستے پر چلی جا رہی تھی، زندگی تو اس کی ہمیشہ سے ٹھہری ہوئی تھی مگر وہ چل رہی تھی، جب تک چلتے رہنے کی اس میں سکت تھی، چلنا تو تھا کہ واپس پلٹنا اب ناممکن تھا۔

”اطروبہ!“ نانی کی ریکار پر اس کے پتھر ائے وجود میں حرکت ہوئی تھی، کھڑکی سے ہنسی وہ ان کے قریب آ بیٹھی تھی۔

”آپ اب تک سوئی نہیں؟“ نانی کو اٹھ کر بیٹھتے دیکھتی وہ بولی تھی۔

”تمہاری بے چیمیاں مجھے کیسے سکون سے سونے دے سکتی ہیں؟ تم مجھ سے کبھی کچھ نہیں کہتیں مگر میں اس سب سے انجان کیسے رہ سکتی ہوں جو تمہارے دل میں ہے، تمہاری ماں بھی ایسی ہی تھی گہرے سمندر کی طرح خاموش، میرے بس میں اگر کچھ ہوتا تو تمہاری ماں کی طرح تمہیں بھی یہاں گھٹ گھٹ کر زندگی گزارتے نہ دیکھ رہی ہوتی، کیا نصیب ہے میرا، پہلے اولاد کا غم اور اب اولاد کی اولاد کا غم، اب تو دعائیں مانگنے کی بھی ہمت جواب دیتی جا رہی ہے۔“ نانی کے کرب ناک لہجے پر وہ بس ایک ٹک ان کے جھریوں زدہ چہرے پر بہتی آنسوؤں کی لکیر کو دیکھ رہی تھی۔

”مجھے آج بھی اس دن کی اذیت سانس نہیں لینے دیتی جس دن تمہارے ماموں کی شادی کے موقع پر اس گھر میں قیامت برپا ہو گئی تھی، اس خوشی کے وقت میں تمہارے باپ کے ہاتھوں چلنے والی گولیوں میں سے ایک گولی کا نشانہ میرا بیٹا بن گیا، دس سال کی عمر میں ولی یتیم ہو گیا، اس کی ماں نے جوانی میں ہی بیوگی کی چادر اوڑھ لی، تمہارا باپ خونزدہ ہو کر ایسا بھاگا کہ پھر کبھی پلٹ کر نہ آیا، اس کے انتظار میں میری بیٹی اس گھر کی دلہیز پر بیٹھی رہ گئی، اپنوں کی نفرت جھیلی گھٹ گھٹ کر چند سالوں میں ہی منوں مٹی تلے جا چھپی، وہ اپنے شوہر کے جرم کا بوجھ زیادہ دیر تک نہ اٹھا سکی تھی، میرا سہنہ تو پہلے ہی دو جوان اولادوں کی موت سے پھٹتی ہو چکا تھا مگر مجھے تمہارے لئے زندہ رہنا تھا، ولی کی ماں آج بھی ہم سب سے نفرت کرتی ہے، اس نے تو دوسری شادی کر کے گھر پھر بسا لیا پر ولی در بدر ہو گیا، وہ

ایک حادثہ تھا جس میں میرے بیٹے کی جان گئی، مگر اس کی وجہ سے جو زندگیاں برباد ہوئیں اس کا ذمہ دار دنیا تمہارے باپ کی ہی ٹھہرائی رہے گی اور تم اس کی بیٹی ہو، یہ سچ کبھی تمہارا چچا نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ تمہارے ارد گرد سب کم ظرف اور تنگ نظر لوگ ہیں وہ سانحہ نہ ہوتا تو حالات یہ نہ ہوتے، تم اور ولی ایسی تنہا اور در بدری کی زندگی نہ گزار رہے ہوتے، میری تو یہ دلی خواہش تھی کہ تم میرے ولی کی دہن بنا کر اس گھر سے رخصت ہوئیں اور میں سکون سے آنکھیں بند کر لیتی مگر، تمہارے باپ کا گناہ تمہاری خوشیوں کے راستے میں حائل ہے، ولی کبھی یہ نہیں بھول سکے گا کہ تم اس کے باپ کے قاتل کی بیٹی ہو، وہ کبھی اس سچ سے چچھا نہیں چھڑا سکے گا کہ تمہارے باپ کی وجہ سے اسے اپنی ماں سے بھی دور ہونا پڑا تھا اور اس کی ماں کیسے یہ برداشت کر سکے گی کہ اس کے بیٹے کو باپ کے سائے سے محروم کرنے والے بیٹے کو، باپ کے سائے سے محروم کرنے والے شخص کی بیٹی اس کے ہی بیٹے کی بیوی بن جائے۔“ نانی کا کر بناک لہجہ اس کے ضبط کو ختم کر رہا تھا، دل کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑنے کی حد پر تھا۔

”نانی! کیا یہ سب ولی نے آپ سے کہا؟ کیا وہ بھی مجھ سے اپنی ماں کی طرح نفرت کرتے ہیں؟ کیا وہ بھی مجھے اپنا مجرم سمجھتے ہیں؟“ ڈبڈبائی نظروں سے نانی کے چپختے تاثرات دیکھتی وہ گھٹے لہجے میں بشکل پوچھ کی تھی، اس سے نگاہ ملانے بغیر نانی نے بس اثبات میں سر ہلا کر اس کے دل میں جیسے کند چھری اتار دی تھی، دل میں اٹھتی درد کی لہریں اسے قبر کی تاریکیوں میں دھکیل گئی تھیں، نانی کے کمزور شانے پر سر رکھے وہ تڑپ تڑپ کر رو دی تھی، اس کی اذیت ناک کراہیں پتھر دل کو



بھی ریزہ ریزہ کر دینے والی تھیں۔

☆☆☆

چپ کی مہر تو ہمیشہ ہی اس کے لبوں پر لگی تھی مگر اب تو سناٹوں کی چادر اس نے سر سے پیر تک اوڑھ لی تھی، کسی مشین کی طرح دونوں ماموؤں کے گھروں کے کام کے دوران وہ نانی کی خبر گیری بھی کرتی رہتی، وہی تو اس کی نمکسار اور تنہائیوں کی ساتھی تھیں مگر وہ جانتی تھی کہ دن بدن گرتی صحت کی وجہ سے نانی کے لئے بھی اس کا ساتھ اب بھاتے رہنا مشکل ہو رہا ہے، وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ نانی کے بعد وہ یہاں کب تک سانس لے گی، دن بس گزر رہے تھے، نہ کسی کے آنے کا اب انتظار تھا، نہ کسی یاد کا چراغ راتوں میں جلتا تھا، تنہائی کا کرب نہایت اذیت ناک تھا، اندر سے وہ ڈھل رہی تھی، وجود، اندھی کھائی میں دھیرے دھیرے اترتا جا رہا تھا، کئی دن، کئی چپ چپ گزر گئیں، بس ایک ذرا پھلچل اس رات ہوئی تھی جب نانی نے آخری بار اس سے چند باتیں کی تھیں۔

”میں نے تمہارے دونوں ماموؤں سے بات کی ہے، ان دونوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور تمہیں اپنی بہو بنا کر اس گھر میں رکھے گا، وہ دونوں بھی بس اپنی بیویوں کی وجہ سے مجبور ہیں۔“

”مجھے اب اور کسی بھیک کی ضرورت نہیں ہے نانی، ان کے گھر کی نوکرائی کی حیثیت بھی مجھ سے زیادہ ہے، میرے لئے اللہ کا سہارا ہی کافی ہے، اللہ نے زمین پر بھیجا ہے وہی میرے لئے کافی ہے آپ اور پریشان نہ ہوں، بس آپ کا سایہ میرے سر پر سلامت رہے، بس آپ میرا ساتھ مت چھوڑے گا۔“ لرزتے لہجے میں بولی وہ ان کا برف جیسا سرد اور نحیف ہاتھ تھامے خوفزدہ

نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی جواب نانی بس نیم وا آنکھوں سے چپ چاپ اس کے زرد چہرے کو دیکھتی رہی تھیں، اطروہ کو ان کی آنکھوں میں زندگی کی کوئی رقع نظر نہ آئی تھی، اس رات جب نانی نے آنکھیں بند کیں تو پھر نہ کھولیں، گھر کے ایک کونے میں ماں کو ڈال کر بھول جانے والے بیٹے دنیا داری کی خاطر ماں کے مردہ وجود کو اٹھا کر اپنے گھر کے قیمتی قالین اور بیش قیمت فانوس سے سجے کمرے میں لے گئے کہ بس چند گھنٹوں کی ہی تو بات تھی پھر ماں کے مردہ وجود سے بھی ان سب کو نجات مل جاتی تھی، اطروہ کے لئے تو اب ہر طرف اندھیرا تھا، نانی کے آخری دیدار کے لئے کون کون آیا اسے کچھ خبر نہ تھی، ولی کو کس نے اطلاع دی، یا وہ اپنی دادی کو آخری آرام گاہ تک پہنچانے آیا بھی تھا یا نہیں اسے کچھ پتا نہ تھا، کسی کے آنے جانے سے سروکار نہ رہا تھا، جب اسے ہوش آیا تب بھی وہ بڑے ماموں کے کچن میں جھوٹے برتن دھو رہی تھی۔

☆☆☆

گہری تاریکی میں کچے گھن کے فرش پر اس کا لاغر وجود بے بس و حرکت اور ساکت تھا، اس کی نیم وا آنکھیں تاریک آسمان پر تھیں جہاں کوئی ستارہ تک نہ شمار رہا تھا، خورد و رہاڑیوں اور جنگلی بیلوں سے اٹنے جسے سے جھینگروں کی آوازیں ابھرتیں اس وحشت زدہ ہولناک رات کو مزید بھانک بھانک رہی تھیں، وہ جانتی تھی کہ اس کی روح کا بھی جسم سے تعلق ٹوٹنے والا ہے، جب تک وہ خود کو زندگی کی طرف کھینچ سکتی تھی اس نے کھینچا تھا مگر پھر ہاتھ پیر شل ہو گئے، وجود نے، اعضا نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا، خدشہ میں کروانے والوں نے بھی اسے ایک ناکارہ اور بیکار شے تسلیم کر کے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا، ساتھ

کام کرنے والی ملازمہ کو خیال آ جاتا تو وہ کھانا پانی کا پوچھنے آ جاتی مگر اطروہ تو زندہ رکھنے والی ہر شے سے بے نیاز ہو چکی تھی۔

کچے فرش پر جت بکھرا اس کا وجود حرکت کرنے کے قابل نہ تھا، ہڈیاں جڑ رہی تھیں، حلق میں کانٹے چھب رہے تھے، جان کی کی حالت میں گزرتی یہ کوئی پہلی رات تو نہیں تھی، ایسی کڑی راتوں سے تو بھری پڑی تھی اس کی زندگی، کڑے وقت کی راتیں بھی بڑی بے رحم اور سفاک ہوتی ہیں، ختم ہی نہیں ہوتیں، سورج طلوع ہونے کے بعد بھی یہ طاری رہتی ہیں۔

تاریک آسمان سے پرستی تیز بوندیں بھی اس کی غفلت کو نہیں توڑ رہی تھیں، یکا یک بجلی کی چکا چوند اور گھن گھرج کے درمیان برستی تیز بارش میں اسے اپنا لاغر وجود ہر بوجھ سے آزاد ہوتا ہوا میں معلق ہوتا محسوس ہو رہا تھا، جل تھل نے اس کے پیاسی روح کو بھی سیراب کر ڈالا تھا، عجیب کیف و سرور کا عالم تھا، کوئی ان دیکھی طاقت اسے ہوا میں اڑائے ساتھ لئے جا رہی تھی، وہ چاہتی تھی کہ یہ کیفیت کبھی ختم نہ ہو اور وہ بس یونہی اڑتی کسی اور جہان میں پہنچ جائے مگر یکدم کیف و سرور کی اس کیفیت میں ایک بھاری دھاڑی آواز مدخلت کرنے لگی تھی۔

”ساری زندگی اس سے بیگار لیتے رہے استعمال کرتے رہے، اسے لاوارث سمجھ کر، اب وہ آپ سب کے کسی کام کی نہیں رہی تو چھوڑ دیا اسے مرنے کے لئے جس طرح اس کی ماں کو مرنے کے لئے چھوڑ دیا تھا، جس طرح دادی کو چھوڑ دیا تھا، اپنی سگی بہن کی اولاد کے ساتھ یہ سلوک کرنے کے بعد آپ دونوں بھائی قیامت کے دن کس طرح سامنا کریں گے اپنی بہن کا، ایک یتیم لڑکی کا حق کھاتے رہے ہوا سے مرنا دکھ

رہے ہو، سب کے سب کس منہ سے اللہ کے سامنے جائیں گے، اب تک میں صرف دادی کی وجہ سے خاموش رہا مگر مزید خاموش نہیں رہوں گا، جس حالت میں اطروہ کو میں ساتھ لے جا رہا ہوں اس میں اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں قسم کھاتا ہوں کہ اس گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا، یہ گھر دادا کی جائیداد ہے اس جائیداد میں میرے باپ کا حصہ بھی ہے اور اطروہ کی ماں کا بھی، اب مجھے جلد از جلد دونوں حصے چاہئیں، اب میرا وکیل آ کر آپ سے بات کرے گا، کیونکہ اب اس گھر میں آ کر میں مزید اپنے لئے ذلت نہیں سیٹھ سکتا۔“ مسلسل گرجتی دھاڑی یہ آواز اسے اونچائی سے نیچے لار رہی تھی، یہ آواز آخر بند کیوں نہیں ہو جاتی، گہری تاریکیوں میں کہیں ڈوبتے ہوئے اس کا دل ناگواری سے چیخا تھا۔

☆☆☆

ایسا لگ رہا تھا جیسے صدیوں بعد اس نے آنکھیں کھولی ہیں، کئی دہائیوں کے بعد ذہن جاگا ہے مگر دل، دماغ سب کچھ خالی خالی تھا، ارد گرد نظر آتیں، سفید دیواریں، بے بستہ خاموش ماحول سب کچھ اس کے لئے اجنبی تھا، خود پر نگاہ کی تو سرخ کھل وجود پر پھیلا تھا، اس کی آنکھیں قریب ہی گھڑے اسٹینڈ پر لگی ہائل پر ٹھہر گئیں، بوند بوند گرتا سیال اس کے ہاتھ میں لگی سرخ کے ذریعے جسم میں داخل ہو رہا تھا، پتھر کی طرح سخت اکڑی گردن کو حرکت دے کر اس نے دائیں جانب دیکھا تو دیکھتی رہ گئی، قریب ہی کرسی پر براجمان شخص کو پہچاننے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی تھی، اس کی سرخ آنکھوں اور ستے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ کئی گھنٹوں سے جاگ رہا ہے، یا کئی دنوں سے پلک جھپکائے بغیر اس کی آنکھوں میں دھلکا شاید وہ اب بھی بے یقین تھا کہ اطروہ کی



آنکھیں کھلی ہوئی ہیں پھر شاید اسے یقین آگیا تھا تب ہی تو اتنی دیر تک خاموشی سے اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ یکدم بیڈ کے مزید نزدیک ہوا تھا اور دھیرے سے اس کا سر ہاتھ اپنی پر حدت گرفت میں لے لیا تھا مگر اطردہ کے اعصاب اور حساسیت پر جمی برف کو اس کے لمس نے نہیں ہچکچایا تھا، اس کا قرب بھی کوئی اثر نہ کر سکا تھا، پہلی بار اتنا قریب ہے وہ اس کے چہرے کو خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”تم ٹھیک ہو، کہیں کوئی تکلیف تو نہیں؟“ بغور اس کے زرد چہرے کو دیکھتا وہ پوچھ رہا تھا جواباً وہ بس ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

”جانتی ہوں تم چار دن سے اس ہسپتال میں ہو، ان چار دنوں میں اب میں تمہیں یوں ہوش و حواس میں دیکھ رہا ہوں، ورنہ تو اب تک تم نیم بے ہوشی میں ہی تھیں مگر تم یہاں ایک بل بھی تنہا نہیں تھیں، میں مسلسل تمہارے ساتھ ہوں، اللہ کا شکر ہے کہ پہلے سے اب بہت بہتر ہو۔“ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے وہ دھیمے لہجے میں بولتا جا رہا تھا۔

”اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں کبھی خود کو معاف نہ کر پاتا، بھول جاؤ گزرے وقت کو، اب تمہیں اپنی ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا ہے، ایک ایسی زندگی جس میں کوئی محرومی کوئی دکھ کوئی اذیت تمہارے قریب میں نہیں آنے دوں گا، تم جس طرح جاہوگی اپنی مرضی سے اپنی زندگی گزارو گی، کوئی روک ٹوک کوئی پابندی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی تم پر، بہت صعوبتیں اٹھائیں تم نے بھی اور میں نے بھی، بہت پی لیا، ہم نے تنہائی کا زہر مگر اب ایسا نہیں ہوگا، ہمیں اب اپنے حصے کی تمام خوشیاں حاصل کرنی ہیں، میں نے سوچ لیا ہے، تم سے نکاح میں اسی دن کر لوں گا جس

دن تم ہسپتال سے ڈسچارج ہوگی تاکہ پھر تمہیں میرے ساتھ ایک چھت تلے رہتے ہوئے کوئی تذبذب نہ ہو اور نہ ہی کسی اور کو اعتراض کرنے کا حق ہو۔“ دھیرے دھیرے وہ اور بھی جانے کیا کچھ بولتا جا رہا تھا، اطردہ کو سب سنائی دے رہا تھا، سب سمجھ بھی آ رہا تھا، کسی خواب و خیال کا گماں نہ تھا، مگر نہ اس کی دھڑکنیں کسی خوشی سے بے ترتیب ہوئی تھیں، نہ حیا غالب ہوتی اس کی سانسوں کو روک رہی تھی، اس کے سپاٹ چہرے پر کوئی رنگ کوئی تاثر نہ ابھرا تھا۔

☆☆☆

اس پر چھائے سکوت اور برف جیسی خاموشی کو دلی کی تیمارداری قربت اور دلجوئی بھی نہ ختم کر سکی تھی، اس دن بعد اطردہ نے صبح ہی صبح دلی کے ساتھ آنے والے دو انجینی چروں کو دیکھا، اجبد، دلی کا دوست تھا اور تانیہ اجبد کی بیوی تھی، بہت اپنائیت اور محبت سے وہ اطردہ سے ملی تھی۔ ”تمہیں ڈاکٹر نے گھر جانے کی اجازت دے دی ہے، بڑی محنت کی ہے میں نے تمہارا اور دلی بھائی کا گھر سجانے میں، خوشی اس بات کی ہے کہ تم جیسی پیاری بڑوں مجھے مل رہی ہے اور اس سے بھی بڑھ کر خوشی اس بات کی ہے کہ آج کا دن تمہارے اور دلی بھائی کے لئے بہت اہم ہے، میں اور اجبد تو شدت سے اس دن کا انتظار کر رہے تھے۔“ ہسپتال سے گھر پہنچنے تک سارا راستہ اطردہ بس تانیہ کو سنتی رہی تھی، شاید تانیہ بہت زیادہ باتیں کرنے کی عادی تھی، وہ ایک پرسکون علاقہ تھا جس کی ایک عمارت کے ایک فلیٹ میں وہ تانیہ کے ساتھ داخل ہوئی تھی، تین کمروں پر مشتمل یہ فلیٹ کشادہ، ہوادار اور روشن تھا، اندازہ ہو رہا تھا کہ نئے رنگ و روغن کے ساتھ اس فلیٹ کو ترتیب دیا گیا ہے۔

”اجبد اور دلی بھائی بہت گہرے دوست ہیں، دونوں نے ایک ساتھ بہت اسٹرگل کیا ہے، ایک ہی جگہ جاب بھی کرتے رہے اور اب دونوں مل کر ایک نوڈیکری چلا رہے ہیں، فیکٹری بہت اچھی طرح سیٹ ہو چکی ہے، اب یہ دونوں مزید ایک فیکٹری شروع کرنے کی پلاننگ کر رہے ہیں، اجبد کا تو کوئی کام دلی بھائی کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، میرے بغیر وہ گزارا کر سکتے ہیں مگر دلی بھائی کے بغیر نہیں، اجبد نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ دلی بھائی شادی کے بعد رہیں گے بھی ہمارے گھر کے قریب تاکہ دونوں حضرات کی بیویاں بھی ہم آہنگی کے ساتھ رہیں، دلی بھائی بہت ڈسٹرب تھے، اپنی دادی کی وفات کے بعد، تمہاری طرف سے بھی بہت فکر مند تھے مگر فوری طور پر تمہیں یہاں لے کر بھی نہیں آ سکتے تھے، سب سے بڑا مسئلہ رہائش کا تھا، گھر کے سلسلے میں بھاگ دوڑ ہو رہی تھی کہ اتفاق سے میرے فلیٹ کے ساتھ والا فلیٹ خالی ہونے کا مجھے پتہ چلا اور گھر کا مسئلہ حل ہو گیا، فلیٹ خالی ہونے میں اور پھر اسے سیٹ کرنے میں ذرا زیادہ وقت لگ گیا ورنہ تو دلی بھائی بہت پہلے تمہیں ساتھ لے آتے۔“ مسلسل بولتے تفصیلات اسے بتاتے ہوئے تانیہ نے اسے فلیٹ دکھایا وہ بلبوسات اور دیگر چیزیں اس نے اطردہ کو دکھائیں جو اطردہ کے لئے ہی خریدنے میں اس نے دلی کا ساتھ دیا تھا، اپنی بے دلی اور کچھ طبیعت کے باعث وہ تانیہ کی گرجوئی کا جواب گرجوئی سے تو نہ دے سکی تھی مگر تانیہ کا ساتھ اسے برا نہیں لگ رہا تھا اس کا بے تحاشا بولنا اطردہ کو بیزار کر رہا تھا۔

غسل کے بعد اس نے تانیہ کا ہی منتخب کیا ہوا کاشن کا خوبصورت اور آرام دہ لباس زیب تن کیا تھا۔

بڑی محبت سے تانیہ نے اس کے بال ہمیر ڈرائر لگا کر خشک کیے، جب تک وہ اطردہ کے بالوں میں برش پھیرتی رہی مسلسل اس کے خوبصورت اور لمبے بالوں کی تعریف کرتی رہی تھی، تانیہ نے ہی اس کے لئے پرہیزی کھانا تیار کیا اور ظہر کی نماز کے بعد اس کے ساتھ ہی بیچ کیا اور اپنے سامنے ڈاکٹر کی تجویز کی گئی دوائیں کھلائیں، دلی جانے کہاں تھا، نہ اس نے تانیہ سے پوچھا نہ ہی تانیہ کو بتانے کا خیال آیا، وہ اب تنہا اور کمزوری محسوس کر رہی تھی، دوائیں کھانے کے بعد اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو رہی تھیں۔

”اطردہ! بس آدھا گھنٹہ مجھے دو پھر آرام سے سو جانا، میری مہندی لگانے کی اسپینڈ بہت تیز ہے، مہندی کا رنگ بھی وہ تین گھنٹوں میں نکھر آئے گا۔“

”مہندی کیوں؟“ ابھی نظروں سے اس نے تانیہ کو دیکھا۔

”کیونکہ اب اتنے کم وقت میں کم از کم مہندی کا تو اہتمام کیا جاسکتا ہے، کہیں سے تو لگے کہ تم ذہن ہو، خیر نکاح عصر کے بعد ہے، اتنا وقت مل جائے گا کہ میں تمہارے پیروں پر بھی مہندی لگا دوں گی تم بھلے ہی میٹھی نیند سو جانا۔“ تانیہ مسکراتے ہوئے بولی جواباً وہ بس خاموش رہی تھی۔

☆☆☆

زندگی کے ہر تاریک راستے پر اس کے ہی خیال کے دیپ روشن ہوتے رہے تھے، وہی ہر گھٹن موڑ پر امید کے جگنوؤں سے راہیں منور کرتا رہا تھا، یہ سب نہ قیاس تھا نہ خیال تھا نہ گماں، جو کچھ ہو چکا تھا وہ سب ایک اہل حقیقت تھا، جسے چھوٹا بھی کسی خواب جیسا تھا آج وہ ایک مضبوط



رشتے میں اسے بندھ کر اس کا ہو چکا تھا مگر سب کچھ یوں نہ ہوا جیسا اس نے سوچا تھا، ایک بار پھر اس پر ترس کیا گیا، رحم کیا گیا اور سب کچھ اس کے خالی کشکول میں ڈال دیا گیا، اعزاز کی صورت میں تو کچھ نہ ملا تھا، یہی اذیت تو اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی کہ ملنے والی اس بھیک سے منہ پھیر کر وہ کہیں جا بھی نہیں سکتی تھی، ٹھکرائے جانے کی اذیت نے پہلے ہی اسے ادھ موڑ کر ڈالا تھا، اب خیرات میں ملنے والے تعلق کا پوچھ بچھ بھی ساری زندگی اٹھانا ہوگا، تانیہ پریشان ہو اٹھی اسے چپ کر داتے، تسلی دیتے، دیتے مگر اس کے آنسو ٹھہم ہی نہ رہے تھے، ایسے موقع پر رونا فطری سی بات تھی مگر اطروب کا رونا اور زار و قطار رونا تانیہ کے لئے غیر معمولی بن گیا تھا، گھر میں ابھی ولی کے کچھ دوست موجود تھے، بہانے سے تانیہ نے ولی کو پکن میں بلا کر تشویش کا اظہار کیا تھا۔

”آپ نے اچھے سے اس کی مرضی تو معلوم کی تھی ناں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اچانک اس سب کے لئے وہ ذہنی طور پر تیار نہ ہو؟ وہ اسی طرح روتی رہی تو خدا خواستہ پھر کہیں طبیعت خراب نہ ہو جائے، ایک تو آپ نے بہت غلت کا مظاہرہ کیا ہے۔“ ولی کے پرسکون تاثرات پر تانیہ کچھ جھجھلائی تھی۔

”بھابھی! یہ غلت آپ کی نظر میں ہو سکتی ہے، میرے لئے یا اطروب کے لئے ہرگز نہیں، آپ پریشان مت ہوں، اسے صرف دادی کی جدائی کا صدمہ ہے، وہ ہمیشہ سے ان کے بہت قریب رہی تھی، اسے وقت لگے گا یہ بدلا رخ قبول کرنے کے لئے پر ایسا دیا کچھ نہیں جیسا آپ سوچ رہی ہیں۔“ ولی کے پر یقین لہجے پر

☆☆☆

دروازے پر ہوتی آہٹ نے اسے گھٹنوں سے سر اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا، سر پر دوپٹہ ٹھیک کرتی وہ اس کی جانب نظر اٹھا کر شاید دیکھنا ہی نہیں چاہتی تھی جو سامنے آ کر کا تھا، پشت پر ہاتھ باندھے وہ چند لمحوں تک اطروب کے سستے ہوئے چہرے اور گریہ و زاری سے بے تحاشا سوچی آنکھوں کو دیکھتا رہا تھا۔

”تم نے بھابھی کے بہت اصرار کرنے کے باوجود کھانا کھانے سے انکار کر دیا، میں تمہارے جذبات سمجھ سکتا ہوں مگر اس طرح کھانا پینا ترک کر دینا تمہارے لئے مناسب نہیں ہے یہ تم بھی جانتی ہو کہ ابھی تمہاری صحت بالکل ٹھیک نہیں ہے۔“ اس کے نرم لہجے پر وہ بس چپ چاپ نظر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔

”مجھے اندازہ ہے کہ دادی کی جدائی کا صدمہ اب بھی تازہ ہے، بہت جلدی میں تمہاری زندگی میں سب کچھ بدل گیا ہے، کوئی اور مسئلہ ہے اگر تو وہ تم مجھے بتا سکتی ہو۔“ بغور اسے دیکھتا وہ بول رہا تھا مگر جواب نہ دار۔

”مجھے بتاؤ اطروب! کیا بات ہے، کیا تم خوش نہیں ہو؟“

”خوش ہوں میں، ہمیشہ سب کچھ بھیک اور خیرات کی شکل میں مجھے ملتا رہا ہے، یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے تو خوش ہوں میں، اپنے باپ کے قاتل کی جس اولاد کے لئے آپ کے دل میں جگہ تھی نہ زندگی میں، جس سے آپ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے تھے سوائے نفرت کے، اب اس پر رحم اور ترس کھا کر آپ نے اسے اپنا نام دے دیا، جسے کبھی ٹھکرا دیا تھا، آج اسے اپنا کر آپ نے بہت ثواب حاصل کر لیا ہے۔“ اس کے لرزاتے

”یہ سب تم کیا کہہ رہی ہو؟ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم مجھے ان سب میں شامل کر دو گی جن کو دادی نے بھی ہمیشہ مجھ پر فوقیت دی، میرے کون سے عمل نے کب تمہیں یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ میں تم سے نفرت کرتا ہوں، ٹھکراتا ہوں، صرف اس لئے کہ تم میرے باپ کے قاتل کی بیٹی ہو؟“ سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

”عقل و شعور آنے کے بعد بھی میں نے کبھی تم سے نفرت نہیں کی نہ ہی تمہارے ماں باپ سے، میرے باپ کی موت ایک حادثہ تھی مگر تم تو اپنے جیتے جاگتے باپ سے محروم ہو گئی تھیں پھر سو تیسے باپ نے مجھے میری ماں سے دور کر دیا اور تمہیں تمہاری ماں سے دور قدرت نے کر دیا، مجھے آج بھی صرف تمہارے لئے تمہارے باپ پر غصہ ہے، سخت افسوس ہے کہ وہ اگر بھاگتے نہیں تو کم از کم تمہاری زندگی محرومیوں اور صعوبتوں میں نہ گزرتی دادی کے گھر میں، جب جب میں دادی کے گھر جاتا، ہر بار دل پر بوجھ لے کر وہاں سے آتا کیونکہ مجھے اپنا آپ تمہارا مجرم لگتا تھا، میں جانتا تھا کہ تم ایسی بے قدری کی مستحق نہیں تھیں جو بے قدری دادی کے گھر میں تمہاری ہو رہی تھی، پچھو آج سلامت ہو تمہیں تمہارے سر پر اگر ان کے دونوں بھائی ان کو سہارا دیتے، ان کے شوہر کی غلطی کی وجہ سے ان کو اپنی نظروں سے نہ گراتے، دادی اپنے بیٹوں کے سامنے تمہارے حق کے لئے نہ خود گھڑی ہوئیں نہ انہوں نے مجھے آواز بلند کرنے کی اجازت دی، میں نے اپنی تنہائی اپنی محرومیوں کو بھلا کر دن رات مشقت شروع کر دی تا کہ تمہارا اور دادی کا سہارا بن سکوں، اپنی ماں کی ناراضگی اور مخالفت کے باوجود میں اگر دادی کے پاس جاتا رہا تو اس کی

ایک بڑی وجہ تم بھی رہی تھیں، میں نے کئی بار دادی سے کہا کہ میں ان کو اور تم کو اپنے ساتھ ایک گھر میں رکھنا چاہتا ہوں، میرے ساتھ وہ اگر جانے پر راضی ہو جاتیں تو کم از کم تمہیں تو اس جہنم سے نجات مل جاتی مگر دادی اپنے شوہر کا وہ گھر چھوڑ جانے کو تمہارے لئے بھی کبھی تیار نہ ہوئیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس گھر پر ان کے بیٹے بہوؤں قابض ہیں جو آخری عمر کے حصے میں نہ دادی کی خدمت کر سکے نہ ان کو عزت دے سکے۔“ سر اٹھائے اترے چہرے کے ساتھ اطروب بہ سانس رو کے اسے دیکھ رہی تھی جو رکے بغیر جذباتی انداز میں بولتا جا رہا تھا۔

”میں جانتا ہوں دادی کو مجھ سے بہت محبت تھی، میں ان کے محروم بیٹے کی نشانی تھا مگر انہوں نے مجھ پر فوقیت ہمیشہ اپنے دونوں بیٹوں اور ان کی اولادوں کو دی، دادی نے بھی مجھ پر بھروسہ نہیں کیا، نہ اپنے لئے نہ تمہارے لئے، میں بہت اچھی طرح واقف تھا تمہارے جذباتوں سے، مجھے یا تمہیں آنے سامنے بیٹھ کر بھی اقرار یا اظہار کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کیونکہ ہمارے درمیان جو کچھ تھا وہ لفظوں کا محتاج نہیں تھا، تمہیں وعدوں اور سنہرے خوابوں کے آسے پر رکھنے سے بہتر مجھے یہی لگا کہ میں اپنے عمل سے یہ ثابت کر دوں کہ میں تمہارے ساتھ اپنی ایک الگ دنیا بنانا چاہتا ہوں جس میں ہمارے ارد گرد صرف خوشیاں ہوں گی، کوئی دکھ کوئی محرومی میں تمہارے نزدیک نہیں آنے دوں گا اور جب مجھے لگا کہ میں تمہیں ایک اچھی زندگی دینے کے قابل ہو گیا ہوں تو میں نے تمہارے لئے دادی سے بات کی مگر ان کے انکار کی وجہ اور اندیشے مجھے کبھی سمجھ نہیں آئے، تم کہتی ہو کہ میں نے تمہیں ٹھکرایا مگر سچ تو یہ ہے کہ ٹھکرایا مجھے گیا ایک بار



نہیں بار بار، دادی کی یہ خواہش تھی کہ تم ان کے بیٹوں میں سے کسی کی بہو بن کر ان کے ہی گھر میں رہو، ان کو سوائے میرے اپنے باقی سارے پوتے تمہارے قابل لگتے تھے، بہت کوشش کی میں نے اصرار بحث تک کی، بہت ناراض بھی رہا اس لئے کئی کئی مہینے ان کو اپنی شکل نہیں دکھاتا تھا کہ بھی تو وہ موم ہوں گی، کہتے ہیں اپنا مارتا بھی ہے تو چھاؤں میں ڈالتا ہے، حیف صد حیف ایسی چھاؤں پر، یہ تو تم بھی جانتی ہو کہ تمہارے ارد گرد جو اپنے تھے ان کی اپنائیت سے تو غیر بھی شرما جائیں، دادی نے مجھے مایوس ضرور کیا تھا مگر میں یہ بھی جانتا تھا کہ جو وہ چاہتی ہیں وہ ممکن نہیں، سب سے زیادہ یقین مجھے تم پر تھا کہ تم مجھ پر کسی کو فوقیت نہیں دو گی، اسی یقین کے سہارے میں تمہیں اس گھر سے لے کر چلا آیا، مجھے لگا تھا جو کچھ میں تمہارے لئے کر رہا ہوں وہ صرف میری نہیں تمہاری چاہت بھی ہے، میں اب تک یہ سوچ کر خوش تھا، کہ میں آخر کار تمہیں تمہارے گھر میں لے آیا ہوں، تم اسی انسان کے ساتھ اپنی زندگی گزارو گی جو تمہاری خواہش تھا، مگر اب مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ میں کتنی بڑی غلط فہمی کا شکار تھا، جو کچھ میں کر چکا ہوں اس سب میں تمہاری مرضی تمہاری خوشی شامل نہیں، یہ میرے لئے ذوب مرنے کا مقام ہے۔“ سخت تاسف زدہ لہجے میں اس کی جانب دیکھے بغیر بول کر وہ پھر رکا نہیں تھا تیز قدموں سے کمرے سے نکل گیا تھا، بند دروازے کو ساکت نظروں سے دیکھی وہ سناٹے میں بیٹھی رہ گئی تھی، یہ سب کیا کچھ کہہ گیا تھا وہ، اسے بھی گمان بھی نہ گزرا تھا کہ ولی دور رہ کر بھی اس کے شب و روز کی اذیتوں سے اس حد تک واقف تھا، اس حد تک اس کے لئے فکر مند تھا کہ دادی کے ساتھ اسے بھی اپنے ساتھ اپنی ذمہ

داری بنا کر ایک گھر کی خوشی دینا چاہتا تھا، اسے تو وہ ہمیشہ انجان اور سرد مہر نظر آیا مگر کبھی شک بھی نہ ہوا کہ وہ اپنی شدت سے اس کے لئے حساس تھا، واقف تھا اس کے جذباتوں سے ان کی گہرائیوں سے، یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے وہ یہ شکایت بھی دل میں نہ رکھتا تھا کہ اس کے باپ کی وجہ سے وہ اپنے باپ کی شفقت سے محروم ہوا تھا، اس کے طرف اور اپنی تنگ نظری پر ندامت سے اس کے آنسو رکنے کو تیار نہ تھے، دل میں پچھتاؤ بھڑک رہے تھے، کاش وہ جلد بازی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے خاموش رہتی، اس کے غلوں اور چاہت پر شک کا اظہار نہ کرتی، اب وہ کس طرح اس کا سامنا کر سکے گی، ایک مخلص انسان کے دل کو نہیں پہنچا کر جانے وہ اب کیسے اس سے نظر ملا سکے گی۔

☆☆☆

دوسری صبح تانیہ آئی تو وہ بیدار تھی، گیت ولی نے ہی کھولا تھا، ناشتے پر وہ تانیہ کے اصرار پر بمشکل رکا تھا، جانے اسے کون سے کام کرنے تھے مگر اطرو وہ اس کے گریز کو سمجھ سکتی تھی، اس لئے اس کی موجودگی ٹھیک طرح سے تانیہ سے بھی بات نہیں کر سکتی تھی۔

”اطرو وہ! بس دو دن ہیں تمہارے پاس، بالکل فٹ ہو جاؤ کیونکہ پھر رمضان المبارک کا چاند نظر آ جائے گا، اس بار تمہارے ساتھ بہت اچھی طرح رمضان گزارنا ہے کیونکہ اس پورے مہینے میں اجد اور ولی کو تو فیکٹری کے کام فرصت نہیں لینے دیں گے۔“ اسے تاکید کر کے تانیہ ولی، سے کوئی بات کرنے لگی تھی، جبکہ رمضان المبارک کی آمد کا سن کر اطرو وہ کے دل میں نانی کی یادیں پھر تازہ ہوتیں اسے یقین کرنے لگی تھیں۔

اگلے دو دن اطرو وہ نے آرام کرتے ہوئے

بارے میں بس وہی زیادہ اس کے سامنے بول نہیں پاتی تھی، ایک دیواری ایسے اپنے اور ولی کے درمیان حائل محسوس ہوتی تھی، جسے اس کی جھجک توڑ نہ سکی تھی۔

☆☆☆

گیلری سے اس نے باہر پھیلی چاند رات کی رونقوں کو دیکھا تھا اور پھر کڑھنے کے لئے واپس کمرے میں آ بیٹھی تھی، پہلا عشرہ مکمل ہوتے ہی تانیہ نے اپنے لئے عید کی تیاریاں شروع کر دی تھیں، شاپنگ کے لئے تانیہ اسے ہی اپنے ہمراہ لے جاتی رہی تھی، پہلی بار تانیہ کے ساتھ بازار جانے کے بارے میں اس نے ولی کو بتا کر جانے کی اجازت چاہی تو اجازت کے ساتھ ولی نے اچھی خاصی رقم بھی اس کے ہاتھ میں تھادی۔

”میں نے اس لئے آپ کو یہ نہیں بتایا تھا، مجھے یہ پیسے نہیں چاہیے تھے، کیونکہ مجھے ابھی کچھ نہیں خریدنا۔“ بے طرح شرمندہ ہو کر اس نے رقم ولی کو واپس دینی چاہی تھی۔

”کیوں تمہیں عید کی شاپنگ نہیں کرنی؟ مجھے تو پہلے ہی یہ کام کرنا چاہیے تھا۔“

”پر میں ابھی کچھ خریدنا نہیں چاہتی، جب کچھ لینا ہوا تو آپ کو بتا دوں گی۔“ وہ تذبذب سے بولی تھی، سچ تو یہ تھا کہ وہ ولی کے ساتھ عید کی شاپنگ کرنا چاہتی تھی، اس کے ساتھ باہر جانے کا یہ ایک ہی موقع اسے نظر آ رہا تھا پھر صاف طور پر وہ اپنی خواہش کا اظہار نہ کر سکی تھی۔

”ٹھیک ہے، ویسے چاند رات کے قریب، قریب مجھے کام سے فراغت مل جائے گی پھر تم میرے ساتھ ہی چلنا، یہ رقم اپنے پاس ہی رکھو، بھابھی کے ساتھ جاؤ گی کوئی چیز پسند آگئی تو آسانی سے خرید سکو گی۔“ بغیر بولے خواہش پوری ہو رہی تھی، وہ خوش تھی، تانیہ کے ہمراہ وہ

تانیہ کی سنگت میں ہی گزارے، اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود تانیہ اسے پانی تک خود اٹھ کر نہ پینے دیتی تھی، اس کے غلوں و محبت کی وہ دل سے معترف تھی، ان دونوں میں ولی صبح سے نکلا رات تک ہی واپس گھر آتا لیکن ناراضگی کے باوجود وہ اس سے اس کی طبیعت کے بارے میں دریافت ضرور کرتا رہا، اپنا خیال رکھنے اور کھانا، دوائیں وقت پر کھانے کی تاکید بھی کرتا رہا، جس دن رمضان کا چاند نظر آتا تھا، اسی شام وہ اسے ہسپتال چیک اپ کروانے بھی لے گیا، تانیہ بھی ساتھ ہی گئی تھی، اجد اور تانیہ نے ولی کی موجودگی میں خاص طور پر اسے تاکید کر دی تھی کہ اسے پورے رمضان سحر اور افطار کے لئے بھی کچن میں قدم رکھنے کی ضرورت نہیں اور پھر ایسا ہی ہوا تھا، تانیہ سحر کا اہتمام کر کے اس کے گھر لے آتی پھر سب ساتھ سحر کرتے، افطار کے وقت اطرو وہ، تانیہ کے گھر پر ہی ہوتی، فیکٹری سے اجد کے ہمراہ ولی بھی وہیں آ جاتا، افطار کے بعد وہ دونوں جلد ہی واپس فیکٹری لوٹ جاتے پھر رات گئے ہی واپس ہوتی تھی، تانیہ نے اسے بتایا کہ رمضان کے دنوں میں فیکٹری میں کام بڑھ جاتا ہے، اطرو وہ کو کوئی مسئلہ نہیں تھا، ولی کی غیر موجودگی میں اسے بلا جھجک یہاں ایڈجسٹ ہونے کا موقع مل رہا تھا، اس کی زندگی میں آنے والا رمضان کا یہ پہلا مہینہ تھا کہ جس میں وہ بہت خوش تھی، خوب عبادت کرنے کا اپنے وقت مل رہا تھا، یہ بابرکت ساعتیں قسمت سے اس کی تمام ناراضگیاں دور کر رہی تھیں، تانیہ کی صحبت میں اس کی شخصیت کھل کر نکھر رہی تھی، ایسا نہیں تھا کہ ولی نے اس سے بس لیا دیا سا ہی تعلق رکھا تھا، ضرورت کے علاوہ بھی وہ اس سے بات کر لیتا تھا، بھی نانی کے بارے میں، بھی اپنی ماں کے



جب جب شاپنگ کے لئے گئی اپنے لئے تو اس نے کچھ خاص نہیں خریدا البتہ تانیہ کی مدد سے ولی کے لئے اس نے عید کی تیاری خوب کی تھی، ولی یہ بات جانتا تھا اور تانیہ کے سامنے اس نے خوشی کا اظہار بھی کیا تھا۔

☆☆☆

ولی کے ساتھ باہر جانے کا اسے انتظار ہی رہا اور آج تو عید کا چاند بھی نظر آ گیا تھا، کال پیل کی آواز پر وہ دست روی سے گیٹ تک پہنچی تھی، ولی نے حیرت سے اسے دیکھا تھا جس نے نہ ہر بار معمول کی طرح نہ اسے سلام کیا، نہ اس کے اندر آنے کا انتظار کیا بس گیٹ کھولتے ہی پلٹ کر تیزی سے کمرے کی طرف چلی گئی۔

اس کی غیر معمولی سنجیدگی اور خاموشی سے ولی بہت حد تک واقف تھا، سو اس کے پیچھے ہی کمرے میں چلا آیا۔

”عید کا چاند مبارک اطروہ، تم شاید بھابھی کے ساتھ چوڑیاں وغیرہ پہننے کے لئے جانے والی تھیں، گئی کیوں نہیں؟“ کھڑکی کے پاس کھڑی وہ باہر جانے کی تلاش کر رہی تھی، اس کے متوجہ نہ ہونے پر ولی نے پوچھا تھا۔

”مجھے نہیں ضرورت چوڑیوں کی۔“ اس کی جانب دیکھ بغیر وہ لرزے لہجے میں بولی تھی۔

”اطروہ! اکل عید کا دن ہے۔“ ولی نے یاد دلایا تھا۔

”یہ دن کبھی میرے لئے نہیں تھا جو مجھے اس کی فکر ہو۔“ آنکھوں کی بڑھتی نمی چھپائے وہ اس کے سامنے سے ہٹ جانا چاہتی مگر ولی سرعت سے اس کا ہاتھ گرفت میں لیتا اسے روک گیا تھا۔

”تو پھر ہاتھوں پر مہندی بھی کیوں لگا رکھی ہے؟“ ولی نے بغور اس کے شدت ضبط سے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھا تھا۔

”بھابھی نے زبردستی لگا دی ورنہ مجھے اس کی بھی ضرورت نہیں تھی۔“ جھکی نظروں کے ساتھ بھرائے لہجے میں بولتے ہوئے اطروہ نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے نکالنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

”اطروہ! تمہارے یہی احتراز مجھے ہمیشہ کسی بھی پیش قدمی سے روکتے رہے مگر اب تمہارا دامن بچا لینا ممکن نہیں، میں سب جانتا ہوں اور یہ بھی تمہیں کسی چیز کی نہ سہی مگر میری ضرورت ہے۔“ اس کے مدہم گھبر لہجے پر اطروہ نے سرخ ڈبڈبائی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”ضرورت آپ کو میری نہیں، میں اس گھر میں تانیہ بھابھی کی ذمہ داری نہیں ہوں اور آپ کے پاس میرے لئے کوئی وقت نہیں، آپ کو تو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ مجھے آپ کے ساتھ عید کی شاپنگ کے لئے جانا تھا، میں جانتی ہوں کہ میں نے اس گھر میں آتے ہی آپ کے دل کو تکلیف پہنچائی تھی مگر وہ سب میں نے پوئی نہیں کہا تھا، تانیہ نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کسی بھی صورت مجھے قبول نہیں کر سکتے، میرے باپ کی وجہ سے آپ بھی مجھ سے نفرت کرتے ہیں، یہ سب سن کر میں کس طرح آپ پر بوجھ بن کر اس گھر میں بخوشی رہ سکتی تھی؟“

”اطروہ! دادی نے تم سے جو کچھ بھی کہا تھا، اس کی کوئی حقیقت نہیں مگر شکایت مجھے تم سے ہے کہ تم نے اتنی آسانی سے ان سب باتوں پر یقین کر لیا تھا۔“ ولی کے گہرے سنجیدہ لہجے پر وہ بس سر جھکائے مسلسل بہتے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں تھی۔

”اور اس غصے کا اظہار تم پہلے نہیں کر سکتی تھیں؟ میں انتظار ہی کرتا رہ گیا کہ تم میرے پاس آؤ گی، فرمائش کرو گی ساتھ باہر جانے کی، کسی

طور تو اپنا حق جتاؤ گی لیکن تم میرا اور میں تمہارا انتظار کرتا رہا، شاید میں تم سے زیادہ احمق ہوں۔“ دھیرے سے اس کا چہرہ اپنی جانب اٹھاتا وہ مسکرایا تھا۔

”تانیہ نے مجھ سے وہ سب باتیں کیوں کیں؟ جن باتوں کا آپ سے کوئی تعلق نہیں تھا، کیوں ان باتوں کو آپ سے جوڑا تھا؟“ وہ گلوگیر لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

”وہ یقیناً تم سے اپنی محبت کی وجہ سے مجبور ہوئی ہوں گی اطروہ، وہ تمہیں اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں کر سکتی تھیں، وہ اگر تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیتیں تو تم ان سے، ان کے گھر سے اور شہر سے بھی دور ہو جاتیں، تم سے جدا ہونے کی سکت نہ ہو گی ان میں اور نہ ہی اپنے گھر سے دور ہونا خود انہیں گوارا تھا، میں جانتا ہوں کہ تمہارے اور میرے درمیان پینتے خاموش جذبوں سے بھی وہ مکمل آگاہ تھیں، تم سے محبت میں انہوں نے غلط بیانی کر ڈالی تھی لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دادی نے آخری دم تک تمہیں اس گھر میں ایک اچھا مقام دینے کی کوشش کی ہو گی، جو وقت گزر چکا ہے اس کے بارے میں سوچ کر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا، بس اب یہ یاد رکھو کہ کل پہلی بار ہمارے لئے ایک مکمل اور بھرپور عید کا دن آرہا ہے، گزرے کل کی اذیتوں میں آنے والے کل کی خوشیوں کو گنونا نہیں چاہیے۔“ نری سے بولتے ولی نے اس کے آنسو پوروں میں سیٹے تھے۔

”آپ مجھ سے ناراض تو نہیں؟“ وہ بمشکل دھیمے لہجے میں بولی تھی۔

”بالکل نہیں حالانکہ ہونا چاہیے کیونکہ تم جس قدر خشک اور بے وقوف مجھ سے تھیں اس سے کئی درجے زیادہ بزدل بیوی بھی ثابت ہوئی۔“

## اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیں

ابن انشاء

اردو کی آخری کتاب

خمار گندم

دنیا گول ہے

آوارہ گرد کی ڈائری

ابن بطوطہ کے نقاب میں

چلتے ہو تو چین کو چلئے

غمری غمری پھر مسافر

خط انشائی کے

بستی کے اک کوپے میں

چاندگر

دل وحشی

آپ سے کیا پردہ

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

قواعد اردو

انتخاب کلام میر

ڈاکٹر سید عبداللہ

طیف نثر

طیف غزل

طیف اقبال

لاہور اکیڈمی، چوک اردو بازار، لاہور

فون نمبرز: 7321690-7310797



# ارباب کھوٹا دل

نازیہ جہانگیر



رکا تھا۔

”ایک خوشخبری سنو، امی نے تمہارے لئے شادی کا خاص تحفہ بھیجا ہے اور بہت جلد وہ تم سے ملنے بھی آئیں گی۔“ ولی کے یہ اچانک جملے اسے حیرت و خوشی کے گنگ کر گئے تھے، مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتا وہ کمرے سے جا چکا تھا، غلٹ میں سینڈلز پہنتے ہوئے اطرو بہ کے پیر زمین پر نہیں تھے، یہاں آکر اسے پہلی بار یہ یقین ہوا تھا کہ ولی ہنستا بھی جانتا ہے اور بہت باتیں کرنا بھی، خود وہ بھی تو اپنے اندر ایک نئی بدلی ہوئی اطرو بہ کو جاگتا دیکھ رہی تھی، کڑی صعبیتوں سے گزرنے کے باوجود محبت کے الوہی پھلتے پھولتے مسکتے شاداب جذبے نے ان دونوں کو بچر نہیں ہونے دیا تھا، زندگی کی تمام رعنائیوں سے بھرپور تھے وہ دونوں، ولی کی مضبوط گرفت میں اپنے ہاتھ پر اس کے پر جدت لمس کو محسوس کرتی وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی، پہلی بار چاند رات کی رونقوں کو ولی کے ہمراہ چلتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھنا بہت خوبصورت لگ رہا تھا، پیچھے پلٹ کر وہ اب دیکھنا چاہتی بھی نہیں تھی، بالآخر گھورانہ چہروں میں اسے روشنیوں کا منبع مل ہی گیا تھا، زندگی کے سمندر میں ڈولتی اس کی بے پتواری کتنی کو اس شخص کی ذات کا کنار مل ہی گیا تھا، جو ہمیشہ سے اس کے لئے کیٹا تھا، یگانہ تھا، وہ جانتی تھی کہ عید کا یہ چاند اس کی زندگی، اس کے دل کے دیار میں بھی طلوع ہوا ہے اور اب اس چاند کو پوری آب و تاب سے جگمگاتے رہنا تھا۔

☆☆☆

ہو۔“ وہ خستہ لہجے میں بولا تھا۔

”اور اپنے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“ اطرو بہ نے خفت سے پوچھا تھا۔  
”میں کون سا تیس مار خاں تھا، میں بھی تمہارے ہی جیسا رہا ہوں۔“ ولی کے اس اعتراف پر وہ حیرت سے اسے دیکھتی پئی تھی۔  
”ہنس رہی ہو مجھ پر، کم از کم محبت میں ثابت قدم تو رہا میں، تمہاری طرح ہر طرف سے مایوس تو نہیں تھا۔“ بولتے ہوئے ولی نے ہلکی سی چیت اس کے سر پر لگائی تھی۔

”آئندہ کوئی غلط فہمی دل میں چھپا کر نہیں رکھنا، ایسے کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہارے لئے میرے پاس وقت نہ ہو؟ سچ یہ ہے کہ میں تم پر مسلط ہوئے بغیر تمہیں وقت دے رہا تھا تاکہ تم ہمارے اس تعلق کو اور اس نئے رخ کو ذہنی طور پر قبول کر لو ورنہ جس سے محبت ہو اور وہ دسترس میں بھی ہو تو کون ذی ہوش اس سے غافل رہ سکتا ہے، میں کس طرح خود پر جبر کرتا رہا ہوں، یہ تم مجھ سے پوچھو بلکہ پوچھنا ہی پڑے گا مگر ابھی سوال، جواب میں تمہاری چاند رات نہ گزر جائے سو یہ معاملہ بعد کے لئے اٹھا رکھو اور اطمینان رکھو جس طرح تم میری عید کی فکر میں رہیں اسی طرح میں بھی غافل نہیں رہا تھا، تمہاری عید کے لئے ساری شاپنگ میں نے خود کی ہے، پہلی بار یہ کام کیا ہے، کوئی تجربہ نہیں لیکن مجھے امید ہے کہ تمہیں سب کچھ پسند آئے گا۔“

”واقعی؟ کیا کیا لیا ہے آپ نے میرے لئے مجھے ابھی سب دیکھنا ہے۔“ اطرو بہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔

”ضرور دیکھنا مگر باہر سے واپس آ کر، دو منٹ میں تمہارے پاس جلدی آؤ، میں باہر انتظار کر رہا ہوں۔“ اسے ہدایت دیتا وہ جاتے جاتے



”افضال اور فاطمہ بھابھی آرہے ہیں۔“ وہ کچھ دیر پہلے ہی بازار سے رمضان شریف کے لئے سودا سلف لے کر لوٹی تھی، سارا سامان برآمدے میں بچے تخت پر رکھ کر نئے سرے سے چیک کر رہی تھی جب اندر سے حسام نے نکلے ہوئے اسے اطلاع دی۔

”واقعی..... کب؟“ وہ بے طرح سے خوش ہوئی اور کافی جوش کے عالم میں حسام سے پوچھا۔

”اسی ہفتے کسی بھی دن۔“

”یعنی وہ رمضان شریف سے پہلے پہلے پہنچیں گے؟“

”ہاں۔“

”یہ تو بہت خوشی کی بات ہے، فاطمہ بھابھی کو ویسے بھی پاکستان دیکھنے کا بہت شوق ہے اور اوپر سے بابرکت مہینہ مل رہا ہے جس کی انہیں عرصے سے خواہش تھی کہ وہ تو روزے ادھر آکر رکھیں۔“

”انہیں ابھی سمجھ نہیں، ادھر کی گرمی پڑی تو روزے رکھنا بھول جائیں گی۔“

”اللہ نہ کرے جو ایسا ہو، اللہ ان کی خواہش پوری کر رہا ہے تو ان کے ارادے بھی مضبوط کرے گا۔“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا تو حسام نے سر جھٹک دیا۔

”وہ تو بعد کی بات ہے اور اب تم یہ چھوڑو اور جلدی سے میرے لئے روٹی ڈال دو، مجھے بچوں کو لینے جانا ہے۔“

”صرف پانچ منٹ پلیر، میں یہ ساری چیزیں سمیٹ لوں۔“ وہ جلدی جلدی شاہپرز اٹھانے لگی تو اچانک اس کے ہاتھ پہ حسام کا بھاری ہاتھ آن پڑا۔

”میرے لئے کہا ہے کہ جلدی جلدی چھوڑ دو۔“

”پھر انہیں پھیلایا کیوں نہیں؟“ حسام نے بہت سختی سے اس کی بات کاٹی تھی وہ چپ سی ہو گئی، اب ساس کے سامنے شوہر کو کیا بتاتی کہ ساس صاحبہ نے خود اس سے یہ بات لی تھی کہ وہ ان کے کپڑے استری کر دے اتنے میں وہ کپڑے چھت پہ ڈال آتی ہیں۔

”جلو اٹھو۔“

اس کا مطلب ہے یہیں چھوڑ دو۔“ اپنے لہجے کو خاصا سخت بنا کر اس نے گھر کتے ہوئے اس سے کہا تو شاہپرز بڑا اس کا ہاتھ آہستہ سے ہٹ گیا۔

”جی۔“ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اندر چلی گئی۔

”تیری بیوی کدھر گئی ہے؟“ ایک طرف سے اس کی ماں ہاتھ میں گیلے کپڑوں کی بالٹی اٹھائے چلی آئی تھی۔

”باورچی خانے میں ہے، میرے لئے روٹی بنانے لگی ہے۔“

”ارے کیسی عورت ہے یہ، کتنی دیر ہو گئی میں اس سے کہہ رہی ہوں میرے یہ کپڑے اوپر چھت پہ ڈال آؤ مگر محال ہے جو میری بات یہ سنتی ہو۔“ اس کی ماں نے خاصے جھنجھلائے انداز میں کہا تو وہ فوراً سیدھا ہو بیٹھا۔

”شمرہ شمرہ۔“ چلا کر اس نے اسے آواز دی تھی۔

”جی۔“ وہ ہاتھ میں آٹے کا پیڑا پکڑے بھاگتے ہوئے باہر آئی تھی۔

”تم نے امی جی کے دھلے کپڑے چھت پہ کیوں نہیں ڈالے۔“ بے حد سختی سے حسام نے اس سے پوچھا تو وہ ساس کے ہاتھ میں موجود دھلے کپڑوں کی بالٹی دیکھ کر سارا معاملہ سمجھ گئی۔

”میں نے بازار سے لوٹتے ہی سب کپڑے دھو دیئے تھے حسام۔“

”پھر انہیں پھیلایا کیوں نہیں؟“ حسام نے بہت سختی سے اس کی بات کاٹی تھی وہ چپ سی ہو گئی، اب ساس کے سامنے شوہر کو کیا بتاتی کہ ساس صاحبہ نے خود اس سے یہ بات لی تھی کہ وہ ان کے کپڑے استری کر دے اتنے میں وہ کپڑے چھت پہ ڈال آتی ہیں۔

”آؤ۔“

”مگر حسام میں آپ کے لئے روٹی.....“

”جو کام کہا ہے، وہ کرو۔“ حسام نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں کہا تھا اسے، وہ سر ہلا کر اندر آنے کا پیڑا رکھنے چلی گئی۔

”آتے ہوئے میرے لئے تازہ جوس لیتی آنا، لائٹ چلی گئی تو جوس نہیں نکل پائے گا۔“ پیچھے سے ساس صاحبہ نے آؤر دے دیا تھا، وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔

”جوس بنا کر لوٹی تو حسام اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔“

”میرا کھانا کہاں ہے۔“

”لا رہی ہوں۔“ تخت کے پاس پڑی بالٹی دیکھتی وہ وہیں سے واپس پلٹی اور حسام کے لئے روٹی ڈالنے لگی۔

”سلا دساتھ لازمی بنانا۔“ باہر سے حسام کی آواز آئی تھی۔

”میرے لئے پودینے کی چٹنی بھی بنا لینا، عجب دل متلا رہا ہے۔“ ساس صاحبہ کا نیا حکم سن کر وہ سلا د بناتے ہی ساتھ چٹنی بھی بنانے لگی گئی۔

”دونوں ہاں بیٹے کو کھانا دے کر وہ بالٹی اٹھانے ہی لگی تھی جب حسام کے ہاتھ سے شیشے کا گلاس چھوٹ کر نیچے جا گرا۔“

”جاؤ اندر سے دوسرا گلاس لاؤ اور یہ کالچ اٹھا دو امی جی اکثر بغیر جوتیوں کے چلتی ہیں۔“ ایک ساتھ دو حکم جاری ہوئے تھے، وہ سر ہلاتی اندر سے دوسرا گلاس لے کر آئی اور کالچ اٹھانے لگ گئی، ایک بار پک کالچ اس کی انگلی میں چبھ گیا تو انگلی سے خون کا نواریہ چھوٹ پڑا۔

”کوئی بھی کام تم سے ٹھیک سے نہیں ہو جاتا، دھیان سے نہیں کر سکتی تم۔“ حسام نے اس کی انگلی سے خون بہتا دیکھا تو غصے میں آ گیا، وہ بنا بولے انگلی کو انگلیوں سے دبائی سب کالچ اٹھا کر سائینڈ پھینک کر رکھ آئی۔

”اب جلدی سے جائے بنا دو، مجھے نکلنا ہے۔“ وہ بالٹی کی طرف اچھی بڑھی بھی نہیں تھی جب حسام نے برتن سمیٹ کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، وہ سر ہلاتی برتن لئے کچن میں چلی آئی۔

”اے شمرہ چار پانچ دنوں میں روزے شروع ہو جائیں گے تم جو آج بیسن لائی ہو اسے ابھی سے چیک کر لو اور میرے اور حسام کے لئے کچھ پکڑوے بنا دو، دونوں ماں بیٹا چائے کے ساتھ چکھ لیں گے۔“ ساس کی اگلی بات نے اس کی زخمی انگلی میں درد سا بھر دیا تو بے اختیار وہ درد آنکھوں کے راستے باہر آ گیا۔

”اتنا شیشہ لگا نہیں جتنا تم رو کے آرہی ہو۔“ پکڑوں کی پلیٹ پکڑتے ہوئے حسام نے اس کی روٹی روٹی آنکھیں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بنا بولے ان کے سامنے چائے کے کپ رکھنے لگی۔

”زیادہ نازک مزاج بننے کی ضرورت نہیں، میرے بھائی بھادوچ آرہے ہیں، ان کی خدمت میں کوئی کسی بھی قسم کی کمی نہیں آئی چاہیے۔“

”جی۔“

”اور یہ کپڑے ابھی تک یہیں پڑے سوکھ رہے ہیں تم نے ابھی تک یہ چھت پہ ڈالے کیوں نہیں؟“ پورا پکڑا منہ میں ڈال کر حسام نے غصے سے اسے ٹھوکر مارا تھا۔

”یاد نہیں رہی۔“ وہ بولی تو لہجہ خواہ خواہ گلو گیر ہو گیا۔

”اپنی یادداشت ٹھیک رکھا کرو، کسی دن مجھے نہ ٹھیک کرنی پڑ جائے۔“ وہ بالٹی اٹھا کر میز ہیوں کی طرف بڑھ رہی تھی جب پیچھے سے حسام نے

”جی۔“

”اور یہ کپڑے ابھی تک یہیں پڑے سوکھ رہے ہیں تم نے ابھی تک یہ چھت پہ ڈالے کیوں نہیں؟“ پورا پکڑا منہ میں ڈال کر حسام نے غصے سے اسے ٹھوکر مارا تھا۔

”یاد نہیں رہی۔“ وہ بولی تو لہجہ خواہ خواہ گلو گیر ہو گیا۔

”اپنی یادداشت ٹھیک رکھا کرو، کسی دن مجھے نہ ٹھیک کرنی پڑ جائے۔“ وہ بالٹی اٹھا کر میز ہیوں کی طرف بڑھ رہی تھی جب پیچھے سے حسام نے



بہا، اس کی آنکھوں میں پھر سے مرچیں سی  
بھرنے لگیں۔

”بہت کام چور ہوتی جا رہی ہے یہ۔“  
ساس کی آواز با آسانی اسے سنائی دی تھی۔

☆☆☆

افضل بھائی اور فاطمہ بھابھی اپنے دو عدد  
بچوں کے ساتھ پاکستان لوئے تو انہیں صرف  
ایک دن خالی ملا، جب شمرہ نے کھل کر ان کی  
خدمت کی کیونکہ اگلے ہی دن روزے شروع ہو  
گئے تھے، فاطمہ اتنی پھرتی اور تیزی سے کام کرتی  
شمرہ کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

”شمرہ تم کیسے کر لیتی ہو یہ سب، اوپر سے  
اتنی گرمی اور روزہ بھی ہے تمہارا اور تم بریکفٹ بھی  
ہو۔“

”یہ تو کچھ نہیں بھابھی، روزے ہیں نا تو  
کافی وقت مل جاتا ہے فراغت کا۔“ وہ سادگی  
سے بولی تو فاطمہ کی ساری آنکھیں کھل گئیں۔

”کیا مطلب؟ میں تو جب سے آئی ہوں  
تمہیں کام کام اور بس کام ہی کرتا دیکھ رہی  
ہوں۔“

”یہ آپ کی نظر میں کام ہوگا، ہمارے لئے  
تو یہ کچھ بھی نہیں۔“ باہر سے آتے حسام نے ہنس  
کر کہا تھا۔

”شمرہ تم فروٹ چاٹ بنا رہی ہوتا؟“  
”جی۔“

”چنا چاٹ بھی بنا لیتا، افضل بھائی اور امی  
جی کو بہت پسند ہے۔“

”جی اچھا۔“

”حسام بھائی رہنے دیں، اتنی گرم ہے کیسے  
کرے گی یہ سب۔“

”ارے کچھ نہیں ہوتا بھابھی، کام سے کون  
مرتا ہے بھلا۔“ حسام نے فاطمہ کی بات چٹکیوں

میں اڑائی۔

”پھر بھی، روزہ رکھ کر اتنے کام نہیں  
ہوتے۔“

”آپ دیکھئے گا شام تک یہ سب کر لے  
گی۔“ حسام نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا تو  
فاطمہ ابا لے کے لئے سفید بنے رکھی شمرہ کو دیکھنے  
لگی جو سینے سے شرابور ہوئی دھکتی ہوئی آگ کے  
پاس بیٹھی تھی۔

”بھابھی آپ باہر آ جائیں اندر بہت گرمی  
ہے۔“ حسام نے فاطمہ کی فکر کرنی چاہی تھی مگر  
فاطمہ شمرہ کو دیکھ رہی تھی، جو بے حد تیزی سے  
صاف آلوؤں کو پانی میں دھوتی جا رہی تھی اور  
دوسرے چولہے پہ آلو ابا لے کے لئے رکھ دیئے  
تھے۔

☆☆☆

روزوں کا پہلا عشرہ بہت سخت ثابت ہوا تھا،  
گرمی حد سے سوا اور جس کی بھر مار تھی، کسی زری  
روح کو اندر جین تھا نہ باہر، ایسے میں ساتھ  
روزے بھی رکھنا بہت مشکل ہو رہا تھا جی ان کی  
ساس نے روزے رکھنا چھوڑ دیئے بیماری کا بہانہ  
مل گیا، بلڈ پریشر ہو جاتا تھا، دوسرے روزے  
بے ہوش ہوتے ہوتے بچیں، پھر بیڑوں نے بعد  
میں کہا انہوں نے پہلے ہی روزے چھوڑ دیئے۔

امریکہ پلٹ افضل بھائی بھی پاکستان کی  
گرمی دیکھ کر بے حال ہو گئے، انہیں چھی یہاں  
روزے رکھنا بہت مشکل لگ رہے تھے، مگر فاطمہ  
ان روزوں پہ بہت خوش دکھائی دے رہی تھی کہ وہ  
ہمیشہ سے ٹھنڈے روزے رکھتی آئی تھی، اب

ایسے روزے رکھ کر ایسے دلی تسکین مل رہی تھی  
لیکن ایک بے چینی سی تھی کہ اتنے گرم موسم میں  
شمرہ روزے بھی رکھ رہی تھی اور اتنے بندوں کی  
خدمت بھی کر رہی تھی، سارا دن وہ ساس کے

ساتھ ساتھ اپنے تین بچوں اور ساتھ ان کے دو  
بچوں کے لئے کچھ نہ کچھ بناتی رہتی اور کھاتی  
رہتی مگر وہ دیکھ رہی تھی کہ ایسے میں بھی نہ حسام  
خوش تھا نہ اس کی ماں، وہ حیران تھی کہ ایسا کیوں  
ہے؟ جیسی ایک دن اس نے شمرہ سے پوچھ ہی  
لیا۔

”بے حس لوگ کسی بھی حال میں خوش نہیں  
رہتے بھابھی۔“ آگے سے شمرہ نے صرف اتنا ہی  
جواب دیا تھا۔

”لیکن پھر بھی شمرہ انہیں تمہارا کچھ تو خیال  
کرنا چاہیے۔“

”ان سے ایسی امید لگانی فضول ہے  
بھابھی۔“

”اپنے تو نہیں ہوتا شمرہ، تمہیں اپنے حق میں  
آواز اٹھانی چاہیے، یہ تو سراسر ظلم ہو رہا ہے تم  
پر۔“

”چھوڑیں بھابھی، ہمارے ہاں یہ سالوں  
سے چلتا آ رہا ہے، گیارہ سال ہو گئے ہیں میری  
شادی کو جو بندہ گیارہ سالوں میں نہ بدل سکا وہ  
اب کیا بدلے گا۔“ وہ تو پہلے سے بے ہمت تھی۔

”شمرہ نہیں ہمت تو کرنی چاہیے اور کچھ نہ  
سہی یہ لوگ تمہارا احساس تو کریں۔“

”کیسے میں کیسے کروں ہمت اور یہ کیسے  
کریں گے احساس میرا۔“

”اس پہ کچھ سوچنا پڑے گا۔“ فاطمہ نے ہلکا  
ساہنکارا بھرا تھا۔

☆☆☆

اچانک ہی شمرہ کو چکر آیا تھا اور وہ میز ہیوں  
پر سے گر پڑی اٹھانے والی فاطمہ بھابھی اور اس  
کے بچے تھے، افضل بھائی دوڑ کر قریبی کلینک  
سے لیڈی ڈاکٹر لے آئے، تو ڈاکٹر نے آتے ہی  
کہہ دیا کہ کمزوری ہے، جس کی وجہ سے ایسے چکر

آ رہے ہیں، ایک تو وہ پریگنٹ تھی اوپر سے  
روزے بھی رکھ رہی تھی اور کام کا بوجھ الگ، ایسے  
میں حالت تو بگڑتی تھی، ڈاکٹر نے اسے بیڈ  
ریسٹ لکھ دیا، حسام نے ڈاکٹر کی ہدایت سنی تو  
ہنس دیا۔

”ڈاکٹروں کا کیا ہے، وہ تو ہر اس چیز سے  
مریض کو منع کرتے ہیں جو اسے پسند ہوتی ہے۔“  
”لیکن حسام بھائی یہ بھی تو دیکھیں شمرہ ماں  
بننے والی ہے ایسی حالت میں آرام اور خوراک کا  
خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔“

”ہاں تو ٹھیک ہے نا، یہ روزے نہ رکھے،  
دن میں کچھ کھانی لیا کرے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے حسام بھائی مگر آرام نہیں  
کرے گی تو صحت کیسے ٹھیک ہوگی۔“

”اور کتنا آرام کرنا ہے اس نے، سارا بدن  
ہو گیا ہے لیٹی ہوئی ہے۔“

”بس اتنا آرام؟“ فاطمہ حیران ہوئی۔

”چلو شمرہ شاباش جلدی سے اٹھو، افطاری  
کی تیاری کرو، آج تو مجھے بھی روزہ بہت لگ رہا  
ہے۔“ حسام کہتے ہوئے اٹھ گیا تو فاطمہ حیران

نظروں سے اسے دیکھنے لگی اور اس کے باہر نکلتے  
ہی وہ شمرہ کی طرف مڑی تو اس کی بند پٹلیوں پہ  
نکے آنسو دیکھ کر دکھی سی ہو گئی۔

”یہ بے حس لوگ ہیں بھابھی، انہیں کسی  
بھی طور احساس نہیں ہوگا۔“

”انہیں احساس تو دلانا ہے شمرہ، ورنہ بہت  
کچھ بگڑ جائے گا۔“ فاطمہ کا لہجہ پر عزم تھا۔

☆☆☆

اور اگلے دن شمرہ کے بلڈ پریشر میں مزید کمی  
ہو گئی تو فاطمہ کے ساتھ افضل بھائی ہو لیا دونوں  
شمرہ کو اٹھا کر ہسپتال لے گئے، ابھی امی جی  
(ساس) نے کھانا کھانا تھا اور بچوں نے







”تو تم بنا دیتے، گھر میں گھستے ہی حکم جاری کرنے لگتے ہو، یہ لاؤ، وہ لاؤ، یہ کھانا ہے، وہ کھانا ہے، جاؤ ناب کھاؤ تو مزہ آئے۔“ ماں جی نے ہاتھ نیچا کر کہا تو اس کا غصہ اور بڑھا۔

”مزہ تو آپ کو آتا ہی چاہیے، صبح سے آپ کو کبھی تو کچھ کھانے کو نہیں ملا ہوگا۔“

”تو تمہیں کیوں سرواڑھ رہے ہیں، تمہیں کون سا شام کو مل جائے گا کچھ کھانے کو چنا چاٹ فروٹ چاٹ، گول گپے، لگاؤ نا آج جسکے۔“ ماں بھی اسی ہی ماں تھی جہیں دونوں میں مذہبیز ہو گئی۔

”میں اکیلا نہیں، آپ بھی برابر کا ساتھ دیتی ہیں میرا پتیلیں بھر بھر کے کھاتی ہیں آپ۔“

”اٹوہ بس کریں آپ نے ہمیں بھوک لگی ہے اور آپ تو لڑنے بیٹھ گئے۔“ بڑے بیٹے نے اونچی آواز میں انہیں نوکا تو حسام چپ سا ہو گیا۔

”راستے میں کہا بھی تھا پکڑوے ہی لے دیں، اتنی خوشبو نہیں آ رہی تھیں مگر آپ کو بھی فریش چیزیں پسند ہیں، اب یہاں تو فریش کیا باقی چیز بھی کھانے کو نہیں مل رہی۔“

”ارے بس کرو نہ دیدو، جاؤ باہر دفع ہو جاؤ۔“ دادو نے گھور کر سب کو دیکھا۔

”ہمیں بھوک لگی ہے دادو، کچھ کھانے کو دیں۔“

”کیا دوں، مجھ سے نہیں بنتا کچھ۔“

”کیا مطلب دادو، آپ عورت نہیں ہیں گھر داری نہیں آتی آپ کو۔“ بڑا بیٹا واقعی سمجھدار تھا، ساری آنکھیں کھول کر دادو کو دیکھنے لگا، ساتھ حسام بھی، دادو کھسا ہی گئیں۔

”بہت پکا چلن میں، اب نہیں پکتا مجھ سے۔“

”کمال ہے دادو، ہم نے امی کو ہی ہر وقت کھانے بناتے دیکھا ہے، گھر کے سارے کام

کرتے دیکھا ہے، آپ کب کام کرتی رہی ہیں؟“ بیٹی نے حیرت سے اپنی دادو کو دیکھا۔

”دیکھیں نا ابو، دادو جھوٹ بول رہی ہیں نا۔“ انہوں نے تو بھی ہماری ماں کا ہاتھ نہیں بنایا، گھر اور باہر کے سارے کام امی کرتی ہیں، نہ دن کو آرام کرتی ہیں نہ رات کو، ہر وقت گھر کے کاموں میں جتی رہتی ہیں، آپ خود بتائیں ابو، آپ نے یا دادو نے بھی ان کا احساس کیا، کبھی ان کا ہاتھ بنایا، کبھی اٹھ کر اپنا ہی کام کیا؟“ اس کی بیٹی اچانک ہی کیسے اتنی سمجھدار ہو گئی تھی کہ اس کی ماں کے ساتھ نا محسوس طریقے سے ہونے والے ظلم بھی اسے نظر آنے لگے تھے اور آج وہ ان دونوں ماں بیٹے سے اپنی ماں کی بابت پوچھ بیٹھی تھی، حسام کچھ بول ہی نہ سکا، جبکہ دادو اپنے بیٹے کے سامنے جھل سی ہو گئی جہی پونی کی بات کو نظر انداز کرتی پیا نکال کر چھپنے لگی۔

”رہنے دیں دادو، ہمیں نہیں لگتا ہماری ماں کے بغیر یہاں کوئی اور کچھ کر سکتا ہے، ہمیں نہیں کھانا کھانا، آؤ سہین، زین جا کے ہوم ورک کریں۔“ اس کا بیٹا فوراً ہی سیدھا ہو کر بہن اور چھوٹے بھائی کو لے کر باہر نکل گیا، دادو غصے سے حسام کو دیکھنے لگی، جبکہ حسام کے چہرے پہ سوچنے کے تاثرات تھے۔

☆☆☆

”آئیں فاطمہ بھابھی پکڑوؤں کا مسالا تیار کر لیں، آخری روزہ ہے افطاری اچھی سی بنانی ہے اور امی جی آپ کباب تیل لیں، بعد میں، میں نے پکڑوے تیلے لگ جانا ہے، چولہا فارغ نہیں ہوگا۔“ حسام اندر سے آلو پیاز اور پالک نوکری میں رکھے باہر آیا تھا، تخت نیم دراز شمرہ نے چونک کر حسام کو دیکھا جبکہ فاطمہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگی اور پھر ایک آنکھ کا کوندہ دبا دیا، بے

اختیار شمرہ کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”میں کباب بعد میں تلوں گی پہلے سین اور زین کو بلاؤ میں نے ان کا جوس تیار کر لیا ہے اور فاطمہ تم اپنے بچوں کو یہ دے آؤ، بعد میں گرم نہ ہو جائے۔“ کینزراں بی بی نے ہاتھ میں پکڑا ٹھنڈا ٹھار جوس کا جگ فاطمہ کی طرف بڑھاتے ہوئے ساتھ ہدایات بھی جاری کیں تو فاطمہ نے فوراً ان کے ہاتھ سے جگ پکڑ لیا۔

”تھینکس امی۔“ فاطمہ جگ پکڑے اندر چلی گئی۔

”امی آپ کباب رہنے دیں، میں تل لوں گی۔“ وہ فوراً سیدھی ہوئی تو کینزراں بی بی نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے سے روک دیا۔

”تمہیں بیٹا تم رہنے دو، تم آرام کرو، میں یہ کر لوں گی۔“

”امی اندر گرمی ہے۔“

”تمہیں بھی تو گرمی لگے گی۔“ اس نے چونک کر اپنی ساس کو دیکھا۔

”میں عادی ہوں امی۔“

”مجھے بھی عادی ہونے دو، بیٹا، بہت کرلی عیاشی۔“

”لیکن امی۔“

”تل بانٹ کر کام کرنے میں برکت ہوتی ہے بیٹا، ہم بھول گئے تھے تم بھی انسان ہو مشین نہیں، گھر کا سارا بوجھ تم پہ ڈال کے خود آرام پسند بن گئے، یہ جانے بغیر کہ تمہیں بھی آرام کی ضرورت ہے، تمہیں بھی سکون چاہیے، ہمیں معاف کر دو بیٹا، ہم نے بہت ظلم کیا تم پہ۔“

کینزراں بی بی کا شرمندگی سے بھرپور لہجہ اور انداز مزہ کی آنکھیں ڈبڈبا گیا۔

”ایسے نہ کریں امی، یہ گھر میرا ہے تو مجھے

ہی اس کے کام کرنے ہیں نا۔“

”بے شک لیکن گھر میں رہنے والے اور بھی کینوں کا حق بنتا ہے نا کہ وہ بھی تل بانٹ کر کام کریں، کہ سب کو ایک سا سکون ملے آرام ملے۔“ کینزراں بی بی واقعی دل سے یہ بات کر رہی تھیں، جہی تو انہوں نے پاس بیٹھ کر اسے ساتھ لگا لیا۔

”میں بہت شرمندہ ہوں تم سے۔“ تھوڑی دیر بعد حسام اس کے پاس بیٹھا کہہ رہا تھا، اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں نرمی دیکھ کر اس کی اپنی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”میں بھول گیا تھا تم نصف بہتر ہو میری، میرا فرض بنتا ہے تمہارے آرام اور سکون کا خیال

## اچھی کتابیں

پڑھنے کی عادت ڈالیں

ابن انشاء

اور وی آخری کتاب

خارگندم

دنیا کول ہے

آدھر مگر ڈائری

ابن بطوطہ کے حقائق میں

چلے ہو تو چین کو مہینے

میری مگر میرا سفر

لاہور اکیڈمی

چوک اور دو بازار لاہور

فون: 042-37321690, 3710797





”اگر اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو ہی گیا ہے تو پلیز مجھے سدھرنے دو، اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنے دو۔“ اور وہ کیا کہتی، آہستہ سے سر جھکا لیا، وہ جھکا سر دیکھ کر ہولے سے مسکرا دیا، بھی باہر سے فاطمہ بھا بھی اندر چلی آئیں۔

”مبارک ہو عید کا چاند نظر آ گیا ہے۔“  
”خیر مبارک بھا بھی، لیکن میرا چاند اس چاند کے نکلنے سے پہلے نکل آیا ہے۔“ حسام نے بہت محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو فاطمہ ہنس دی۔

”ہاں یہ چاند بھی مبارک ہو، مگر میرے پیارے بھائی آئندہ سے یہ یاد رکھنا کہ اپنے چاند کی بھی کوئی اہمیت ہے، اسے اپنا احساس دلاتے رہنا کہ اس کی باقی کی زندگی بھل ہو سکے اور یہ آسانی سے اسے ارد گرد روشنی پھیلا سکے۔“

”کیوں نہیں بھا بھی، مانا کہ میں غلطی نہ تھا، اتنے سال اس کے ساتھ زیادتی کرتا رہا، لیکن اب جب مجھے اس کا احساس ہو گیا ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں ہر بات میں اور ہر کام میں، میں اس کا ساتھ دوں گا، اس کا ہاتھ بناؤں گا۔“ حسام کے اندر سے نکلتے الفاظ نے ثمرہ کے دل کو بے قابو کر لیا، وہ بہت میٹھی نظروں سے اس دیکھ رہی تھی۔

”اچھا اب بس کرو، بہت رش ہو جائے گا بازار میں جلدی سے نکلنے کی تیاری کرو۔“  
”جیسا آپ کا حکم، چلو بیوی اٹھو، اب کے باہر نکلے چاند کو پیار سے سلام کریں۔“ اور ثمرہ نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔

☆☆☆

رکھوں، تم جو کھانا چاہتی ہو وہ سنو، جو کرانا چاہتی ہو وہ کرو، لیکن پارتم نے بھی تو مجھے احساس نہیں دلایا، جب بھی میں نے سختی دکھائی تم نے سر جھکا لیا، بھی تو آگے سے بولتی، اپنا حق مانگتی، مجھے احساس دلانی میں تمہارے ساتھ غلط کر رہا ہوں، غلط کرتا جا رہا ہوں۔“

”وہ محبت ہی کیا حسام جو احساس دلا کر لی جائے۔“ وہ بولی تو بس اتنا۔  
”نہیں ثمرہ محبت کو تازہ رکھنے کے لئے کبھی کبھی اس کی یاد دلانی پڑتی ہے اس کا احساس کرانا پڑتا ہے۔“

”واقعی؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی تھی تو وہ نرمی سے مسکرا دیا۔  
”تو اور کیا؟“

”تو پھر اسی محبت میں لے جائیں نا آج ہمیں چوڑیاں پہننے، مہندی لگانے۔“  
”کیوں نہیں، لیکن صرف ایک شرط پر۔“  
”کون سی شرط؟“

”باقی سب جائیں گے افضال بھائی کے ساتھ گاڑی میں اور تم اکیلے ایک ساتھ، اپنی سوئر بائیک پر۔“  
”حسام! وہ حیا کے مارے سرخ پڑ گئی، حسام نے نظر بھر کر اس کا یہ روپ دیکھا۔  
”کہو منظور ہے نا؟“

”سب کیا کہیں گے؟“ وہ جھینپ سی گئی۔  
”کچھ نہیں، سب جانتے ہیں چاند رات پہ سب لڑکیاں چوڑیاں پہنتی ہیں، مہندی لگاتی ہیں۔“ وہ جان بوجھ کر معصوم بنا۔

”لیکن حسام میرا کہنے کا مطلب ہے۔“  
”چھوڑو، تمہارا کہنے کا جو بھی مطلب ہو۔“  
اس نے تیزی سے اس کی بات کالی۔



چنا لکھ کے میں تیراں

چمدی رہی آں اپنی باں

”سی آہ!“ درد تو بہت تھا مگر دل کے درد کو جیسے قرار آیا تھا۔

”ہائے!“ ایک دفعہ پھر زخم پر دھیمی سی پھونک مارتے ہوئے اس کے لبوں سے سسکاری نکلی تھی، درد کی شدت سے آنکھوں میں نمی میں یکدم اضافہ ہوا تھا، لیکن اس کے باوجود اس کے اعصاب پر سکون ہوتے جا رہے تھے رگ و جاں کو کانٹنے والے درد کو کچھ بل کے لئے آرام سا آیا تھا، بائیں کلائی پر آئے زخم کو دیکھتے ہوئے اس کے لب دھیمے سے مسکائے تھے اور بے آواز لبوں نے نام پکارا تھا۔

”زی زینی اتنی رات گئے کیا کر رہی ہے؟“ پیچھے چار پائی پر لیٹی اماں نے کر دٹ بدلتے ہوئے کرسی پر بیٹھی زینت کو خمار آلود آواز میں پوچھا۔

”کچھ نہیں اماں پڑھ رہی ہوں تو سو جا۔“ اس نے جلدی سے اپنے بازو کو نیچے کرتے ہوئے کہا، حالانکہ میز پر رکھی لائٹن کی روشنی میں اماں بے چاری کو بھلا کیا نظر آتا تھا، کہ اتنی رات گئے زینی کون سی پڑھائی کر رہی ہے سارے دن کاموں میں تھک بار کر سوتی اماں کو بھلا یہ کب نظر آتا تھا کہ میز پر نہ تو کوئی کتاب کھلی ہے اور نہ اس کے ہاتھ میں کوئی کاپی پھل ہے اس کے ہاتھ میں تو کڑھائی کرنے والی سوئی تھی جس کی مدد سے وہ اس کے نام کا پھیلا انگریزی حرف اپنے بائیں بازو پر کاڑھ رہی تھی سوئی کی نوک اس کے بازو کو چھیدتی ہوئی اس کے پور پور کو درد سے دو چار کر گئی تھی، مگر روح کے درد کو جسم کے درد سے قرار سا آیا تھا اس کی حالت اسی نشی جیسی تھی جو ٹیکے کی سوئی خود اپنے بازو میں پیوست کرتے ہوئے تھی

خوشی اس کی چھین کو برداشت کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے بعد رگ میں دوڑتا ہوا زہر اس کے اعصاب کو شل کرتا چلا جائے گا اسے بھی نشے کی لت پڑھ گئی تھی محبت کے نشے کی اور نشے میں نیل و نیل جسم ہی اعصاب کے سکون کا باعث بنتا ہے۔

”زینی کم بخت سو جا بند کر اس بتی کو باہر صحن میں سوئے تیرے ابا نے اٹھ کر کمرے میں جلتی یہ بتی دیکھ، تو قیل کے ضائع ہونے پر ابھی تیرے میرے لتے لینے لگے گا، سو جا کم بخت بچھا اسے۔“ اماں کی جانب سے جھلپٹ بھری ڈانٹ سن کر اس نے لائٹن کو پھونک مار کر بھٹایا اور ٹٹول کر اماں کے ساتھ بڑی چار پائی پر آ لیٹی بازو کا درد اسے چین نہیں لینے دے رہا تھا، ساری رات آنکھوں میں کٹنی تھی کمرے کے دروازے سے آتی مدھم سے چاندنی میں وہ اپنے تصور اور خیالات کی دنیا کے سفر پر جانگی رات کی سیاہی کا سحر تو ایک عابد پر، ایک عاشق پر یا پھر ایک مجرم پر چلتا ہے وہ اس کے سحر میں کھوئی اپنے خوش گماں خوابوں کی وادی میں جانگی تھی یہ دنیا والے کیا سمجھے گے کہ عاشق کھلی آنکھوں سے خواب کیونکر دیکھتے ہیں۔

☆☆☆

”ہائے یہاں یہ مرجانی محبت اتنی زہریلی اور ظالم کیوں ہوتی ہے اور ہم انسان اتنے بھولے اور معصوم اس کے چنگل میں کیوں پھنس جاتے ہیں۔“ کالج کینٹین میں ایک کرسی پر اداسی سے بیٹھے ہوئے نہ جانے کن سوچوں میں الجھی ہوئی تھی پڑھائی سے تو دل اچاٹ ہو چکا تھا دل تو بس اس کی چاہ میں ہی لگتا تھا پر وہ تو اس کی چاہ کو چاہ سے دیکھتا ہی نہ تھا اس کی جذبات و احساسات سے بے خبر، لا پرواہ، جانے انجانے میں اس کے

دل کو نہیں پہنچا دیتا تھا عاشق لوگ سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں مگر معشوق کا ان کی محبت کا مذاق اڑانا بھرم توڑنا ساری دنیا ذلیل کر دے پر معشوق کی ایک مسخر بھری نظر ہی مار ڈالتی ہے، محبوب کی نظروں میں بھرم اور وقار پانے کے لئے کسی نے کیا گھڑا جانتے بوجھتے تمام لیا، کسی نے تھل میں خود کو دفن کر ڈالا تو کسی نے زہر کو امر رس مان کر پی لیا اور وہ تو ان سچے کھرے لوگوں کے سامنے کچھ بھی نہ تھی، صرف پانچ ہری مرچیں ہی تو چبا چبا کر کھائی تھیں اور بس ہاں اس کے بعد سے اب تک اس کا گلہ دکھ رہا تھا سینے میں جلن تھی لیکن یہ سب جسمانی تکلیفیں تو سہی جا سکتی تھی محبوب کی نظروں کی بے رخی نہیں، کل کا منظر پھر آنکھوں میں جا گا تھا۔

”ہائے نالکہ باجی! آج تو آپ نے خوب ہری مرچیں کاٹ کر ڈالی ہیں سالن میں، اے کہہ! سر ہے ناں تو ہم سب لوگ بڑا پھیکا سالن کھاتے ہیں عادت پڑ گئی ہے میں تو یہ ایک مرچ بھی نہ کھا پاؤں۔“ زینی نے ہری مرچیں کاٹتے ہوئے یونی بات کی، کب سے سبھی لوگ اپنے کام چپ چاپ کیے جا رہے تھے نالکہ ہنڈیا پکا رہی تھی، تانی اماں رضائی ادھیڑ رہی تھی اور وہ ظالم نہیں بلکہ راجا اس کے دل کا راجا پاس کرسی پر بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا، زینی نے خاموشی کو توڑنے سے زیادہ اپنے وجود کا احساس دلانے کے لئے (جو اس گھر کے مکین کم ہی کرتے تھے) یونی بات کی۔

”اچھا زینی تو تم ہری مرچیں نہیں کھا سکتی ہو لیکن مجھے تو ہری مرچیں بہت پسند ہیں اور اگر میں تجھے پانچ مرچیں کھانے کا سو روپیہ دوں انعام میں تو بھی نہیں کھائے گی۔“ کتاب پڑھتے ہوئے نہ جانے کامران کو کیا سوچھی تو جو اس نے

اس کی بات اچک لی اور شرارت بھرے انداز میں پوچھا۔

”بہنوہ سو روپیہ تو کیا تم ہزار روپے بھی دو گے تو نہیں کھائے گی پرسوں ہی یہاں کھانا کھانے بیٹھ گئی تھی اتنی پھینک مرچ پر بھی سی سی کرتی گھر بھاگ گئی تھی کہ اماں نے کھیر بنائی ہے منہ کی جلن اس سے بجھاتی ہوں جا کر، لے میں تجھے دو سو روپیہ دوں گی اگر یہ تین مرچیں بھی کھالے۔“ نالکہ باجی نے مذاق اڑاتے ہوئے کامران سے کہا۔

”ارے بھئی زینت چل کھا کے دکھا دے باجی کو سوتیرا، سو میرا پوری پانچ مرچیں، شروع ہو جا شاہاش۔“ کامران نے زینی کو جوش دلاتے ہوئے اکسایا اور زینی کی جان پر بن آئی۔

”ایک دو بھی نہیں اٹھنی پانچ، ہائے اللہ! ایک کہتے تو بھی نگل لیتی مگر پانچ۔“ زینی نے سامنے پڑی لمبی باریک ہری مرچوں کو خوف سے دیکھتے ہوئے سو چا وہ شروع سے ہی تیز مرچوں بلکہ مرچوں سے بھاگتی تھی تھوڑی سی تیز مرچ کھائی نہیں دو تین دن کے لئے گلے میں درد سینے اور پیٹ میں جلن بعض دفعہ تو چہرہ پر بھی سو جن آ جاتی تھی، سب ہی اس کی اس حالت کے بارے میں جانتے تھے اور آج جان بوجھ کر اسے مرچیں کھانے پر اکسایا جا رہا تھا کوئی اور ہوتا تو ٹکا سا جواب دے دیتی پر برا ہو اس کم بخت محبت کا، نامراد کہیں کی۔

”میری عزت کا سوال ہے زینت۔“ کامران نے چہرہ پر بے چارگی طاری کرتے ہوئے آس بھری نظریں زینت پر نکائیں۔

اب تو کوئی چارہ ہی نہ تھا وہ ایک ایک مرچ چبا چبا کر کھاتی چلی گئی اف یہ عاشق کا جنون سر چڑھ کر بولتا ہے سرخ ہوتے چہرے آنکھوں سے



بہتے پانی اور گلے اور منہ میں آگ لگاتیں مریں  
وہ کامران کی نرم نظروں کے صدمے کھاتی چلی  
گئی۔

تاکہ باجی اور کامران سنگدل بنے اس کی  
حالت سے لطف لیتے اسے دیکھتے جارتے تھے۔  
”یہ مارا، جیت گئے ہم۔“ پانچویں مریج کو  
ختم کرتے ہی کامران نے ہلکا سا عمرہ لگایا اس کی  
خوشی کے آگے زینی کو اپنی تکلیف محسوس ہی نہ ہو  
رہی تھی۔

”چلو تاکہ باجی دو سو نکالو مجھے بائیک میں  
پیٹرول ڈلوانا تھا شہر جانا ہے ضروری کام سے۔“  
کامران نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا، اس نے  
ایک بار بھی زینی کی جانب پانی کا گلاس دینا تو  
درکنا پینے تک کا نہ کہا تھا۔

”ارے سو تو زینی کا ہے۔“ تاکہ نے پانی کا  
گلاس بے حال ہوتی زینی کو تھمایا۔

”ہونہر بے وقوف!“ اتنا کہہ کر وہ اندر  
کمرے کی جانب بڑھ گیا اور زینی کو مریجوں نے  
اتنی تکلیف نہ دی تھی جتنی ان دو لفظوں نے کیا  
کچھ نہ تھا کامران کے لہجے میں تسخر، بے رخی اور  
بے حسی زینی فوراً اٹھ کر اپنے گھر کی جانب بھاگی  
جو ساتھ ہی تھا اور کمرہ بند کر کے خوب روئی تھی مگر  
وہ کامران سے خفا ہو سکی تھی نہ اس کا اظہار کر سکی  
تھی۔

ساری رات درد اور دکھ سے روتے ہوئے  
گزارنے کے باوجود صبح اپنے وقت پر اٹھ کر وہ  
جلدی سے چھت پر چلی آئی تھی ہر سو ہلکی ہلکی سی  
دھند میں لپٹی سوئی ہوئی صبح بیدار ہو رہی تھی اور  
اس وقت کامران باہر کھیتوں میں سیر کرنے جاتا  
تھا اور زینی کا معمول تھا کہ صبح وہ چوری جیکے منڈیر  
سے اسے دیکھتے ہوئے اپنی صبح کا آغاز کرتی تھی  
اور گھر والے سمجھتے تھے کہ وہ چھت پر بیٹھنے جاتی

ہے پر وہ کیا جانے محبت کا روگ بڑا خوار کرنے  
والا ہوتا ہے۔

☆☆☆

”ہیلو! کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں۔“  
کب سے اداس اپنے خیالوں میں کم زینی کا  
کندھا کسی نے ملایا تھا اور اس کے پاس رکھی  
کرسی کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا تھا، زینی جو  
ارد گرد کے ماحول کو میسر بھلائے کسی اور ہی ماحول  
میں کھوئی ہوئی تھی، سامنے کھڑی رضیہ کی بات کو  
ایک سیکنڈ کے لئے سمجھ نہ پائی رضیہ نے ہاتھ کے  
اشارے سے دوبارہ اس کے پاس بیٹھنے کے لئے  
پوچھا۔

”ہاں..... ہاں جی بیٹھ جائیں۔“ زینی نے  
قدرے گھبرائے سے انداز میں کہا رضیہ ان کے  
کانچ میں پڑھتی تھی ایک سال سینئر تھی چند ہی دن  
ہوئے تھے اسے یہاں پرائیڈیشن لئے والد کی  
ٹرانسفر کی وجہ سے وہ اس شہر میں آئے تھے، یہ  
ساری معلومات زینی کو رضیہ سے ملنے سے پہلے  
ہرگز معلوم نہ تھی، وہ تو بس خود میں ہی مگن مست  
پڑھتی تھی ارد گرد کے بارے میں خبر رکھنے میں اسے  
قطعی دلچسپی نہ تھی، وہ کافی خاموش طبع سی لڑکی تھی  
اور ایسی وہ فطرتاً ہی تھی، جس دین میں بیٹھ کر وہ کانچ  
پڑھنے آتی تھی اس دین میں آنے والیں اس کی  
ہم زاد لڑکیوں تک سے اس کی دوستی نہ تھی، بس  
واپسی سی بیٹھتا ہی تھی، اس کے روکے اور لئے  
دیئے انداز کی وجہ سے کوئی اس کی طرف متوجہ بھی  
نہ ہوتا تھا، کجا کہ دوستی کرنا وہ سب لڑکیاں گاؤں  
سے شہر کانچ میں اس دین میں بیٹھ کر اکتھپی پڑھنے  
آئی تھیں جیسے ہی کانچ گیٹ پار کرتیں ٹولیوں کی  
صورت میں، ادھر ادھر بڑھ جاتی تب وہ اکیلی  
چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی نکلتی تھی جانب  
بڑھتی چلی جاتی، اصل میں وہ خود اکیلی رہنا ہی

پسند کرتی تھی کوئی اسے مخاطب نہ کرتا یا اسے گروپ  
میں شامل کرے ایسا وہ خود ہی نہیں چاہتی تھی اسے  
تہوارہ کر کامران کے متعلق سوچنا اچھا لگتا تھا اور  
وہ اس معاملے میں اس قدر پوزیو تھی کہ اپنی  
سوچیں کامران کے متعلق کسی سے شیئر نہ کرنا ہی  
نہیں چاہتی تھی۔

اب بھی اپنے متعلق رضیہ نے معلومات خود  
ہی دی تھی بقول اس کے اسے کھوئی کھوئی سی اچھی  
لگی تھی اور وہ اس سے دوستی کی خواہش مند تھی  
اگلے چند روز زینی کے کمرے اور لئے دیئے  
انداز کے باوجود رضیہ نے اس کا چھپا نہ چھوڑا تھا  
رضیہ نے کہا تھا کہ وہ اگر کسی بات کو کرنے کا ٹھکان  
لیتی ہے تو کر کے ہی دم لیتی ہے اور اس نے زینی  
کو اپنا پکا دوست بنانا کا ٹھکان لیا ہے تو اب زینی  
بھی اس سے دوستی کرنے سے روک نہیں سکتی تھی  
اور یہ رضیہ کی مستقل مزاجی ہی تھی جو زینی رضیہ  
کے ہیلو ہائے کے جواب میں قدرے ہلکی سی  
مسکراہٹ کے ساتھ ہیلو ہائے کہہ دیتی تھی۔

☆☆☆

”ہوں مسئلہ تو واقعی تمہارا بہت میڑھا ہے  
کسی عام انسان کی بس کی بات تو نہیں کہ اس  
مسئلے کا حل نکال سکے، چن..... ناممکن ہی ہے۔“  
رضیہ نے زینی کی ساری بات سن کر قدرے مایوس  
لہجے میں کہا تھا اور یہ سن کر زینی کے رونے کی  
شدت میں اضافہ ہوا تھا۔

”اچھا رونا تو بند کرو ہم بے شک لان کے  
تہا حصے میں بیٹھے ہیں پر کوئی دیکھ لے گا تو کیا  
سوچے گا تمہارے گاؤں کی کسی لڑکی کی نظر نہ پڑ  
جائے خود کو سنبھالو پلیز۔“ رضیہ نے زینی کو چپ  
کرانے کی ایک بار پھر کوشش کی جو کتنی ہی دیر  
سے روئے چلی جا رہی تھی ایک وہ وقت تھا کہ چند  
ہفتے قبل وہ رضیہ سے دوستی کی بھی روادار نہ تھی اور

ایک یہ وقت ہے کہ آج انجانے میں رضیہ نے  
اس کی دھکی رگ کو چھیڑ دیا تھا کہ یہ کہہ کر وہ بہت  
پریشان اور الجھی ہوئی ہے وہ اپنی پریشانی اس  
سے شیئر کر سکتی ہے، زینی تب بھی بات چھپا جاتی  
لیکن جب اس نے یہ کہا کہ ”زینی مجھے تمہاری  
آنکھوں میں ٹھکرائی ہوئی محبت کا دکھ نظر آتا ہے“  
تو اسے صبح تجزئے پر زینی اپنا دکھ بتانے سے پھر  
خود کو روک نہ پائی ایک دوست بناتے آپ  
کے دکھ کو جان لے وہ واقعی سچا دوست ہوتا ہے اور  
سچا دوست ہی ہر مشکل میں آپ کا ساتھ بھا سکتا  
ہے بھی تو زینی نے روتے ہوئے اپنا سارا دکھ  
رضیہ کے آگے کھول کر بیان کر ڈالا تھا اور رضیہ  
کے مایوس کن تبصرہ کو سن کر وہ مزید رونے لگی تھی۔  
”پلیز زینی رونا تو بند کرو یار، تمہیں یوں  
روتا دیکھ کر مجھے دکھ ہو رہا ہے اور میں سوچ بھی  
نہیں پا رہی کہ تمہارے اس مسئلے کا کیا حل نکالے،  
ارے میرے ذہن میں یہ بات پہلے کیوں نہیں  
آئی، زینی تمہارے مسئلے کا حل میں نے تلاش کر لیا  
ہے میری بات کو دھیان سے سنو، بس یقین کرو  
تمہارا مسئلہ حل ہو گیا۔“ رضیہ نے یکدم کوئی بات  
یاد آنے پر نہایت پر جوش ہوتے ہوئے زینی سے  
کہا اور پھر جو حل اس نے زینی کے گوش گزار کیا  
زینی سن کر چند لمحوں کے لئے حیران پریشان اسے  
دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

کہتے ہیں ”محبت اندھی ہوتی ہے“ لیکن پھر  
وہ محبت ہی نہیں ہوتی، محبت تو ایک آفاقی جذبہ آمد  
کی طرح دل پر اترتا ہے اور پر روح تک میں بس کر  
تیسری آنکھ کھول دیتا ہے اور بھی عشق مجازی عشق  
حقیقی تک کا سفر طے کر لیتا ہے، اس کی محبت بھی  
اندھی اور سطحی ثابت ہوئی تھی بھی تو آنکھیں بند  
کر کے اس نے ایسی راہ پر چلنے کا انتخاب کیا تھا







کر کے میں نے کہا کہ مجھے اپنی دوست کو بابا جی کے ہاں سلام کرنے کے لئے لے کر جانا ہے مصیبت میں ہے بے چاری، اسی وقت گاڑی لے کر آگیا چھٹی کر لی آفس سے۔“ رضیہ نے آخری بات قدرے دھیمے لہجے میں کرتے ہوئے زینی کو ایک بار پھر سبز باغ دکھائے۔

”اور تم دیکھنا کہ آج تعویذ پلائے گی کل تائی تیری چوکھٹ پر رشتہ لے کر آئے گی، اگر تم پیسوں کے ساتھ اپنی یہ گولڈ کی چین بھی بابا جی کو نظر کر دو تو وہ اور کار آمد تعویذ دے گے پیسوں دیسوں کا لالچ نہیں انہیں یہ سب تو انہیں اپنے عاتلوں کو بھیٹ دینا ہوتا ہے تم پیسے اور یہ چین مجھے دے دو میں سنبھال کر اپنے پرس میں رکھ لوں۔“ رضیہ نے لچائی نظروں سے گلے میں پڑی اس کی چین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن یہ تو اماں نے مجھے دی ہے اور پھر تم نے تو پانچ ہزار ہی لانے کو کہا تھا۔“ زینی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”افوہ زینی مہنگائی کا زمانہ ہے اور پھر محبوب کو قدموں میں لانے کے لئے بابا جی دو تعویذ عمل کر کے دیتے ہیں آج ہی دونوں لے لو پھر دوبارہ یوں آنا مشکل ہے ایک تعویذ صبح پانا اور ایک شام کو میں بابا جی سے گزارش کروں گی کہ دوسرا تعویذ چین کے بدلے دے دیں ایسا وہ کرتے نہیں پر ہو سکتا ہے تمہاری مشکل پر انہیں ترس آجائے لاؤ جلدی سے اتار کر دے دو فریب ہی آ رہا ہے ان کا آستانہ۔“ رضیہ نے زینی کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا تعویذ والی بات وہ خاموشی سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے کاشی سے چھپانا چاہتی تھی۔

مجبوراً زینی چادر کو سر سے اتارتے شانوں پر رکھتے چین اتار کر رضیہ کو دینی چاہی جب گاڑی

یکدم زور سے بریک لگانے پر ایک جھٹکے سے رکی اور زینی اور رضیہ نے بمشکل خود کو سنبھالا زینی سمجھ بھی نہ پائی تھی جب اس کی جانب کا دروازہ کسی نے جھٹکے سے کھولا اور اس کی دائیں کلائی کو سختی سے پکڑے باہر گھینٹا اچانک بریک لگنے پر گاڑی کے دروازوں کے لاک خود بخود کھل گئے تھے کاشی اور رضیہ بھی اس اچانک افتاد پر گھبرا گئے کاشی کو لاک لگانے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔

”تو بڑھنے آئی ہے تو گاؤں سے شہر اس کالج میں ذلیل، بد بخت دل تو یہی چاہ رہا ہے تجھے یہی تیرے اس عاشق کے ساتھ زندہ گاڑیوں پر تیرے یہ کروت چاچا، چاچی کو بتانا بھی ضروری ہیں، اوئے کیا نام ہے تیرا اور کب سے منارہا ہے اس کے ساتھ رنگ رلیاں۔“ پھر نے ہوئے کامران نے زینی کی کلائی مروڑ کر دانت کچکپکاتے ہوئے زینی کو جھکا دیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے کاشی کی جانب لپکا۔

”ہائے ہائے بھائی خدا کا خوف کرو یہ تم کیا کہہ رہے ہو ہم نے صرف اس لڑکی کو لفٹ دی ہے ہم تو اسے جانتے بھی نہیں سنان سڑک پر کھڑی پریشان کھڑی ہمیں گاڑی روکنے کا اشارہ دیا اور کہا کہ بس اس جگہ تک چھوڑ دے ترس کھا کر بٹھا لیا۔“ رضیہ نے جلدی سے درمیان میں آتے ہوئے صورت حال سنبھالنی چاہی اور زینی رضیہ کے سفید جھوٹ پر چسپے سکتے میں آگئی۔

”غلطی ہو گئی بھلائی کا زمانہ ہی نہیں ہمیں عقل کرنی چاہیے بھی بھلا اس وقت تنہا یونیفارم میں کھڑی لڑکی کسی اچھے کام کے لئے تو کہیں جا نہیں رہی ہوگی، گھر والوں سے چسپ کراپے یار سے ملنا ہو گا مگر مجھے ترس آگیا میرا بھائی تو چاہ بھی نہیں رہا تھا اسے بٹھانا میری ہی عقل پر پھر پڑ گئے غلطی ہو گئی بھائی معافی دے دو ہم اسے بالکل

نہیں جانتے رو رہی تھی کہنے لگی کہ اس کے ابو کا ایکسٹنٹ ہو گیا اور اسے ہسپتال پہنچنا ہے جلدی بس ترس کھا لیا، چلو کاشی چلیں، تو بے استغفار کیا زمانہ آگیا ہے۔“ رضیہ نے تیز تیز بولے ہوئے زینی کو بھی لٹاڑا اس کی آنکھوں میں زینی کے متعلق ہلکی سی بھی پہچان کی جھلک تھی۔

رضیہ اور کاشی ایسی صورت حال سے نمٹنا باخوبی جانتے تھے اپنے جرم کے نشان انہوں نے کبھی پیچھے نہ چھوڑے تھے یہ ایک پورا گینک تھا، عامل بابا اور اس کا ساجا سبایا آستانہ، مرید سب جعلی تھے، رضیہ اور کاشی جعلی عامل بابا کے ساتھ کام کرتے تھے، رضیہ کسی بھی کالج میں داخلہ لیتی اور پھر اپنا شکار پھنسی نو خیز عمر، کچے ذہن، تیز و تند جذبات اور معاشرے کی روایات کے آگے بے بسی کے احساسات رضیہ اپنے شکار کو دور سے ہی تاڑ لیتی تھی کم گو، تنہائی پسند شکل سے ہی بدھو نظر آنے والی زینی اس کا شکار تھی، دوستی اور بھردری کی آڑ میں رضیہ نے اس پر جال پھینکا اور وہ بے حد آسانی اور جلدی کے ساتھ اس کے جال میں پھنس گئی تھی۔

یہ گینگ محبوب کو قدموں میں لانے کی خواہش مند لڑکیوں سے جعلی تعویذ دے کر نا صرف پیسے بٹورتا تھا بلکہ ہلکے میل کر کے انہیں اپنے شیطانی عزائم کے لئے قبی استعمال کرتا تھا۔ رضیہ اور کاشی فوراً گاڑی میں بیٹھ کر زن سے گاڑی بھگا کر رو پکڑ ہو گئے تھے کچھ عرصے تک رو پوش رہ کر کسی اور کالج میں داخلہ لے کر رضیہ کو اپنا شکار ڈھونڈتا تھا۔

اور زینی کا نو تو بدن میں ابو نہ ہو کے مصداق سفید پڑتے چہرے کے ساتھ اس کی جانب دیکھ رہی تھی، جس کی نظروں سے وہ گر گئی تھی وہ کیا اس کے قدموں میں گرنا اپنی صفائی میں کہنے کو اس

کے پاس کچھ نہ تھا اس وقت وہ اتنی پریشان اور گھبراہٹی ہوئی تھی کہ کچھ بول بھی نہ پارتی تھی رضیہ کے یوں بدل جانے پر اس کے پاس اپنی سچائی کے لئے کوئی ثبوت نہ بچا تھا کامران نے تقریباً دھکا دیتے ہوئے اسے بائیک پر بٹھایا زینی نے راستے میں ایک دو بار کوشش کی کہ وہ اسے اصل بات بتا سکے لیکن وہ اس کی سننے کو تیار ہی کب تھا اور پھر گھینٹا ہوا وہ اسے اس کے گھرا لایا تھا اس کی بلند آواز پر اماں ابا کے علاوہ تایا اور تائی بھی ان کی طرف چلے آئے تھے، غصے میں وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ تھا اس نے بتایا کہ آج صبح وہ ایک جگہ پر چاب کے لئے انٹرویو دینے جا رہا تھا اور زینی کے کالج کے پچھلی سڑک سے گزر رہا تھا جب اس نے زینی کو ایک سفید گاڑی میں جاتے ہوئے دیکھا، کھولتے دماغ کے ساتھ اسی وقت وہ ان کے پیچھے لگ گیا اور قدرے سنان سڑک دیکھ کر اس نے بائیک گاڑی کے آگے روک کر گاڑی رکوائی اور یہ ذلیل جو چادر سر سے اتارے بیٹھی تھی رنگے ہاتھوں پکڑ لیا اس کے بعد زینی پر اماں ابا کے گھونے اور لاتوں کی بارش ہوتی رہی لیکن اسے ان کی اتنی تکلیف نہ تھی جتنی ان لوگوں سے ادا ہوئے ہوئے جملوں کی اس کی خاموشی اسے مجرم بنائے دے رہی تھی اس کی نادان محبت نے اسے عرش سے اٹھا کر فرش پر لاٹھا تھا وہ ان سب کے لئے ایک کوڑھی سے برتر ہو گئی تھی اس کی قسمت کا فیصلہ کیا چاچا کچا تھا اس کی سب سے بڑی بہن کو فون کر کے تمام صورت حال سے آگاہی دے کر اس کے جٹھ کا رشتہ لانے کا کہہ دیا گیا تھا اس کی بہن کا جٹھ کھانا آوارہ پہلے دو بیویاں بھٹکتا چکا تھا پہلی اس کی روز روز کی مار سے مر گئی تھی اور دوسری نے میکے بھاگ کر جان بچائی تھی اور خلع لے لی تھی زینی کے اصل کروت پر



پردہ ڈالے ہوئے اس کی بہن سسرال والوں پر احسان کر کے یہ رشتہ مانگنے آئے گی اور بظاہر بمشکل گھر والوں کو اس رشتے پر تیار کرے گی یوں اس کی اپنے سسرال میں عزت پڑھ جائے گی اور اس بلا کو بھی سر سے اتار دیا جائے گا، جلد از جلد فیصلہ کرنے کی ایک وجہ زینی کی اب تک کی خاموشی بھی پیار سے محبت سے مار سے غصے سے ہر طرح سے اس سے پوچھا گیا تھا آخر اس روز وہ کس سے ملنے جا رہی تھی اپنے عاشق کا نام بتائے لیکن وہ کیا بتاتی کون یقین کرتا اب اس پر اعتبار کھو دیا تھا اس نے اپنا رسوائی کے جس گڑھے میں اس نے جھلاٹنگ لگائی تھی اب مزید اور کتنا رسوا ہوتی اماں کو پانچ ہزار اور نگلے میں سے سونے کی چین غائب دیکھ کر کامران کی باتوں کا یقین کرنا ہی تھا وہ تو اپنے عاشق کے ساتھ منہ کالا کر کے بھاگ رہی تھی سب کو اس سے نفرت ہو گئی کوئی بھی اس سے ہمدردی نہ رکھتا تھا اور اس کے لبوں پر نفل تو کامران کے ان جملوں نے بھی لگا دیا تھا جب اماں کے سامنے رنگے ہاتھوں پکڑے اس کے ان دیکھے کر تو ت کھولتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اپنا رشتہ مانگنے کے لئے امی کو راضی کر رہا تھا اچھا ہی ہوا کہ اس کا پول کھل گیا، ورنہ نجانے میں ماموں کی بیٹی سے شادی سے انکار کر کے اس گناہ کی پوٹی کو بیاہ لانا۔

”بے غیرت۔“ نفرت سے ادا کرتے جملوں کے ساتھ آخر میں وہ اس پر تھوک کر چلا گیا تھا۔

زینی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ جب وہ اس کی قسمت میں لکھا جانے والا تھا تو خود اس نے اللہ پر یقین رکھنے سے دل سے دعا کیوں نہ کی الٹا مگر وہ اپنی قسمت سیاہ کر ڈالی وہ تو کسی سے بھی نظریں ملانے کے قابل نہ رہی تھی، نہ انہوں

سے نہ خود سے اور نہ اللہ میاں جی سے سو گھر والوں نے جو سزا اس کے لئے تجویز کی تھی اسے قبول بھی کیا اب تمام عمر وہ خود کو اپنی محبت کو سزا دینا چاہتی تھی اللہ تعالیٰ نے تو اس کی محبت کی تا نگ تڑپ پر ترس کھا کر کامران کے دل میں اس کا خیال ڈالا تھا مگر اس نے خود ہی اپنے لئے وہ راہ چنی جو خیر کی نہیں شر کی کہلاتی ہے تو شر کی راہ پر چلنے والوں کے لئے جہنم تیار ہوتا ہے اور اس نے جاننے بوجھتے وہ راہ چنی تھی پھر توبہ اور معافی کس لئے، بے شک بڑا سے بڑا گناہ کرنے کے باوجود رحیم ذات کی طرف سے توبہ کا در کھلا رہتا ہے مگر وہ اس سزا سے نجات چاہتی ہی کب تھی، تو پھر توبہ اور معافی کس لئے، اس نے اپنے لب سی لئے تھے اپنی تمام عمر نارسائی کے عذاب کے ساتھ گزارنا کا فیصلہ بھی اس کا ہی تھا رات چاندنی کی ٹھنڈی روشنی میں بائیں بازو کی آستین اوپر چڑھائے سوئی سے کاڑھے گئے کے (K) پر انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ بے آواز رو رہی تھی اس کے بازو سے نہ مٹنے والا یہ حرف اب اسے تمام عمر رلائے گا عشق کا جادو تو اس پر ایسا چلا کہ اس کے سحر میں آ کر اس نے خود اپنے بازو کو زخمی کرتے ہوئے اپنی محبت اٹھ کرنا چاہی تھی بھول گئی اس کی اور اس بھول کا کفارہ انہوں کی بے اعتباری کی صورت میں تمام عمر بھگتنا تھا اسے، اس کی ماں نے اس کے روتے سکتے وجود کو دیکھ کر اسے سونا کا نہیں کہا تھا بلکہ نفرت سے کروٹ بدل لی تھی اور اس کے لب بے آواز روتے ہوئے یہ گیت گنگنانے لگے تھے۔

چنا لکھ کے میں تیرا نام

☆☆☆

حب اللہ کا مرتبہ  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔  
”اللہ کے بندوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو نہ نبی ہیں نہ شہید پھر بھی انبیاء اور شہداء قیامت کے دن ان کے مرتبہ پر رشک کریں گے جو انہیں اللہ کے یہاں ملے گا۔“  
لوگوں نے کہا کہ ”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ کون لوگ ہوں گے؟“  
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ”یہ وہ لوگ ہوں گے جو آپس میں ایک دوسرے کے رشتہ دار نہ تھے اور نہ آپس میں مالی لین دین کرتے تھے، بلکہ شخص خدا کے دین کی بنیاد پر ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، بخدا ان کے چہرے نورانی ہوں گے اور ان کے چاروں طرف نور ہی نور ہوگا، انہیں کوئی خوف نہ ہوگا، اس وقت جب کہ لوگ خوف میں مبتلا ہوں گے اور نہ کوئی غم ہوگا اس وقت جب کہ لوگ غم میں غم مبتلا ہوں گے۔“

سعدیہ جبار، ملتان  
کم وقت میں زیادہ ثواب  
☆ سورة الزلزال دو بار پڑھنے کا ثواب ایک قرآن کے برابر ہے۔  
☆ سورة الفاتحہ تین بار پڑھنے کا ثواب دو قرآن کے برابر ہے۔  
☆ سورة الاخلاص تین بار پڑھنے کا ثواب ایک قرآن کے برابر ہے۔  
☆ آیت الکرسی چار بار پڑھنے کا ثواب ایک

قرآن کے برابر ہے۔

☆ سورة القدر چار بار پڑھنے کا ثواب ایک قرآن کے برابر ہے۔  
☆ سورة الکافرون چار بار پڑھنے کا ثواب ایک قرآن کے برابر ہے۔  
☆ سورة العصر چار بار پڑھنے کا ثواب ایک قرآن کے برابر ہے۔

آئسہ ممتاز، رحیم یار خان  
باتیں بڑے کام کی

○ آدمی اپنے خیالات سے اپنی زندگی خراب کرتا ہے۔  
○ الفاظ جتنے بھی متاثر کن استعمال کرو مخاطب پر اس کا اثر تب ہی ہوگا اگر ان میں خلوص اور سچائی ہو۔  
○ دوست بھی نہیں بچھڑتے جو چلے گئے وہ ہماری یادوں میں زندہ ہیں۔  
○ اس خوشی سے دور ہو جو کل غم کا گناہن کر دکھ دے۔

○ رشتے جب اذیت کے سوا کچھ نہ دیں تو ان سے کنارہ کشی ہی بہتر ہے، خواہ وقتی طور پر ہی۔

فریال امین، ٹوبہ ٹیک سنگھ  
اقوال زریں  
۱۔ اگر دکھوں کا دریا عبور کرنا ہو تو آنسوؤں کو جذب کرنے کا طریقہ دیکھو۔  
۲۔ نظر اس وقت تک پاک ہے جب تک اٹھائی نہ جائے۔



۳۔ زندگی کے ہر لمحے میں خوشیاں بکھیرتے جاؤ تاکہ کسی دن ایک باغ لگا جاوے دوسروں کو معاف کرو مگر اپنے آپ کو بھی معاف نہ کرو۔

۴۔ جو شخص انتقام کے طریقوں پر غور کرتا ہے اس کے دن ہمیشہ برے رہتے ہیں۔

۵۔ دوست کو اتنا مت آزمائش میں نہ ڈال کہ وہ تمہیں آزمائش میں ڈال دے۔

۶۔ کتابوں کو زمین پر مت گرنے دو یہ ہی کتابیں آسمان پر لے جاتی ہیں۔

۷۔ سر تسلیم خم ہیں جو نبی کی عزت کا محافظ بن جائے۔

۸۔ کسی کا دل مت توڑو یہ نہ ہو تیرے لئے ایک سزا بن جائے۔

تازیہ کمال، حیدرآباد  
شیطان کی واپسی

حضرت حاتم ائمہ نے ایک روز فرمایا کہ شیطان نے ایک دفعہ مجھے پھسلانا چاہا، مگر میں نے اس کو ایسا جواب دیا کہ وہ مایوس ہو کر چلا گیا، وہ مجھ سے کہنے لگا کہ تو کیا کھائے گا میں نے کہا موت، اس نے کہا کیا پیئے گا میں نے کہا کفن، اس نے کہا کہاں رہو گے میں نے کہا قبر میں رہوں گا، میرا یہ جواب سن کر وہ کہنے لگا تم بڑے سخت مرد ہو۔

مریم رباب، خانوال  
غریب مسلمانوں کا حق

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ”سب سے اچھا عمل کون سا ہے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”کسی مسلمان کا دل خوش کر دینا بڑے ثواب کا کام ہے، اگر بھوکا ہو تو کھانا کھلا دو، اس

کے پاس کپڑے نہ ہوں تو کپڑے پہنا دو یا اس کی کوئی ضرورت انگی ہوئی ہے تو اسے پوری کر دو۔“

امام غزالی، شاہدہ لاہور  
فرمان رسول ﷺ

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ عید کا دن تھا کچھ کنیزیں بھی اشعار گا رہی تھیں کہ اسی دوران میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لے آئے۔

بولے ”نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں یہ گانا بجانا کیسا؟“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”ابو بکر رہنے دو، ہر قوم کے لئے تہوار کا ایک دن ہوتا ہے اور آج ہماری عید کا دن ہے۔“

ثناء حیدر، سرگودھا  
خوش بخت

عید کا دن تھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز عید ادا کرنے جا رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بچے کو دتے ہوئے دیکھا اور وجہ دریافت کی، بچے نے کہا۔

”میرا باپ خدا کے نبی ﷺ کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے مارا گیا، اب میرے پاس نہ کپڑے ہیں نہ کھانا۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے سر پر دست شفقت رکھا، اسے گھر لے گئے، کپڑے دیئے کھانا کھلایا، اس کے بعد وہ بچہ ہنستا ہوا آیا اور بچوں کے ساتھ مل کر کھینے لگا، دوسرے بچوں نے کہا۔

”ابھی تم رو رہے تھے اور اب خوش ہو؟“ تو اس نے کہا۔

”میں بھوکا تھا، مجھے کھانا مل گیا، کپڑے نہیں تھے وہ مل گئے، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

میرے باپ بن گئے، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا میری ماں بن گئیں، فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا میری بہن بن گئیں تو اب میں روؤں تو مجھ سا بد بخت کوئی نہ ہوگا۔“

درشن، میاں چنوں  
”فضیلت جمعہ“

ابن ماجہ ابولبابہ عبدالمذہر اور سعد بن معاذ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ۔

”جمعہ کا دن تمام دنوں کا سردار ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ سے بھی بڑا دن ہے اس میں پانچ خصلتیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے اسی دن حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی اور اسی دن انہیں زمین پر اتارا اور اسی دن میں انہیں وفات دی اور اسی میں ایک ساعت ایسی ہے کہ

بندہ اس وقت جس چیز کا سوال کرے وہ اسے دیا جائے گا، جب تک کہ حرام سوال نہ کرے، اسی دن صورت چھوٹکا جائے گا اور اسی دن قیامت برپا ہو گی، کوئی فرشتہ مقرب آسمان اور زمین ہوا اور پہاڑ ور دریا ایسا نہیں کہ جمعہ کے دن سے ڈرتا نہ ہو۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اسی دن مجھ پر درود بکثرت پڑھا کرو کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔

صحابہ اکرامؓ نے عرض کیا۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ پر درود کیسے پیش کیا جائے گا، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فوت ہو چکے ہوں گے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے زمین پر اجساد انبیاء کا کھانا حرام قرار دیا ہے۔“ (حاشیہ مشکوٰۃ ص ۱۲۱)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اسی دن مجھ پر درود بکثرت پڑھا کرو کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔

صحابہ اکرامؓ نے عرض کیا۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ پر درود کیسے پیش کیا جائے گا، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فوت ہو چکے ہوں گے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے زمین پر اجساد انبیاء کا کھانا حرام قرار دیا ہے۔“ (حاشیہ مشکوٰۃ ص ۱۲۱)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اسی دن مجھ پر درود بکثرت پڑھا کرو کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔

صحابہ اکرامؓ نے عرض کیا۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ پر درود کیسے پیش کیا جائے گا، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فوت ہو چکے ہوں گے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے زمین پر اجساد انبیاء کا کھانا حرام قرار دیا ہے۔“ (حاشیہ مشکوٰۃ ص ۱۲۱)

آسیہ وحید، لاہور

”دعائے خیر“

حضرت امام احمد بن حنبل ایک چور کے لئے اکثر دعائے خیر کرتے تھے، کسی نے ان سے پوچھا۔

”حضرت! آپ چور کے لئے دعائے خیر کیوں کرتے ہیں؟“

امام صاحب بولے۔

”جب مجھے گرفتار کر کے بیڑیوں میں جکڑ کر انٹ پر سوار کر کے لے جایا جا رہا تھا تو وہ چور مجھے ملا اور کہنے لگا۔“

”امام صاحب!“

”میں نے بارہا قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، کئی سو درے میری پیٹھ پر مارے گئے، لیکن میں نے اپنی عادات نہیں چھوڑیں، آپ کو حق کی سر بلندی کے لئے اذیتیں سہہ کر باز نہیں آنا چاہیے۔“

”اس کی بات سن کر میرا ایمان اور حوصلہ اور بڑھ گیا، اس لئے میں اس چور کے لئے دعائے خیر کرتا ہوں۔“

جو یہ تاجر، گبرگ لاہور

خلیل جبران کہتا ہے

دعا روح اور آرزو کی ہم آہنگی کا نام ہے، دینے اور لینے والے کے مابین ایک ایسے لمحے کی تخلیق کا پیش لفظ ہے جس میں خواہشوں کی تکمیل

موجزن رہتی ہے، دعا نہ مانگنے والے ہاتھ ریگستانوں کی طرح خالی رہتے ہیں، جن پر پانی کی ایک بوند برسائے بغیر بادل تیزی سے گزر جاتا ہے۔

ام ایمن، گوجرانوالہ

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆





آنرہ ممتاز ----- رحیم یار خان  
لب خاموش سے اظہر تمنا چاہیں  
بات کرنے کو بھی تصویر کا لہجہ چاہیں  
تو چلے ساتھ تو آہٹ بھی نہ ہونے پائے  
درمیاں ہم بھی نہ ہوں یوں تجھے تنہا چاہیں

اپنی کسی ادا کے حوالے سے دے صدا  
میں کھو چکا ہوں اہل محبت کی بھیڑ میں

سفر کو نکلے تھے ہم جس کی رہنمائی پر  
وہ ایک ستارہ کسی اور آسماں کا تھا  
جسے ہم اپنی رگ جاں بنائے بیٹھے تھے  
وہ دوست تھا مگر اک اور مہرباں کا تھا  
فریال امین ----- ٹوبہ ٹیک سنگھ  
کسی نے کب ہمیں چنے کا اختیار دیا  
تجھے اہل نے مجھے زندگی نے مار دیا  
کسی سے عشق کا اظہار میں کرتا تھا  
خبر نہیں کہ وہ لمحہ کہاں گزار دیا

ہم کو شاہوں سے انصاف کی توقع تو نہیں  
آپ کہتے ہیں تو زنجیر ہلا دیتے ہیں

عجب شخص تھا بارش کا رنگ دیکھ کے بھی  
کھلے درپچے پہ اک پھول دان چھوڑ گیا  
جو بادلوں سے بھی مجھ کو چھپائے رکھتا تھا  
پڑی ہے دھوپ تو بے سائبان چھوڑ گیا  
نازیہ کمال ----- حیدر آباد

منزل نہ دے چراغ نہ دے حوصلہ تو دے  
تنگے کا ہی سہی تو مگر آسرا تو دے  
بے شک میرے نصیب میں رکھا اپنا اختیار  
لیکن میرے نصیب میں کیا ہے بتا تو دے

بھی سچ ہے کہ نہیں کوئی رشتہ تجھ سے  
جتنی امیدیں ہیں وابستہ ہیں تنہا تجھ سے  
یہ الگ بات تجھے ٹوٹ کے چاہا لیکن  
دل بے مایا نے کچھ بھی نہیں چاہا تجھ سے

اشکوں میں جو پایا ہے وہ گیتوں میں رہا ہے  
اس پر بھی سنا ہے کہ زمانے کو گلہ ہے  
جو تار سے لگی ہے وہ دھن سب نے سنی ہے  
جو ساز پہ گزری ہے وہ کس دل کو پتا ہے  
مریم رباب ----- خانہوال  
میں ایک ذرہ بلندی کو چھونے نکلا تھا  
ہوا نے تھم کے زمیں پہ گرا دیا مجھ کو

بس یہ ہوا کہ اس نے تکلف سے بات کی  
اور ہم نے رد کے دوپٹے بھگو لئے  
تیری برہنہ پائی کے دکھ بانٹتے ہوئے  
ہم نے خود اپنے پاؤں میں کانٹے چھبھو لئے

اپنی تعلیم کے عذابوں میں  
مت پڑو عشق کے عذابوں میں  
عمر کتنی ہے ان کی کانٹوں پر  
پھول رکھتے ہیں جو کتابوں میں

آم خدیجہ ----- شاہد رہ لاہور  
وہ اس ادا سے کھلا عشق کی بازی  
میں اپنی فتح سمجھتا رہا مات ہونے تک

ہے اختیار میں ترے تو معجزہ کر دے  
وہ شخص میرا نہیں تو اسے میرا کر دے  
یہ رہگذار کبھی ختم ہی نہیں ہوتا  
ذرا سی دیر تو رستہ ہرا بھرا کر دے

طوفان کر رہا تھا میرے عزم کا طواف  
دنیا سمجھ رہی تھی کہ کتنی بھنور میں ہے  
شاہدیر ----- سرگودھا  
تم ساتھ تھے ہم بھی تھے منزل سے آشنا  
اب تم نہیں تو لگتے ہیں رستے عجیب سے

ان بارشوں سے دوستی اچھی نہیں فراز  
کچا تیرا مکان ہے کچھ تو خیال کر  
پڑھنا ہے تو انسان کو پڑھنے کا ہنر سیکھ  
ہر چہرے پہ لکھا ہے کتابوں سے زیادہ  
درکن ----- میاں چنوں  
جیسا جتنا بھی رشتہ تھا اس کو رسوا مت کرنا  
ہم بھی ایسا نہیں کہیں گے تم بھی ایسا مت کرنا

داسن کے سارے چاک گریباں کے سارے چاک  
ہو بھی گئے بہم تو بہم اور کتنی دیر

فضا میں رنگ نہ ہوں آنکھ میں نمی بھی نہ ہو  
وہ حرف کیا کہ رقم ہو تو روشنی بھی نہ ہو  
وہ کیا بہار کہ پیوند خاک ہو کے رہے  
کشائش روش و رنگ سے بری بھی نہ ہو  
آسیہ وحید ----- لاہور

شام آ رہی ہے ڈوبتا سورج بتائے گا  
تم اور کتنی دیر ہو ہم اور کتنی دیر

یوں مجھ کو نگاہوں کے ترازو میں نہ تولو  
ہے شوق تو بے ساختہ آنکھوں میں سمولو  
اب دل کو میں لایا ہوں ہتھیلی پہ سجا کے  
اس حسن کے بازار میں کیا دام ہیں بولو

سبھی لوگ تو کبھی بھی اچھے نہیں رہتے  
جن سے سچ سیکھا ہو وہ بھی بچے نہیں رہتے  
کیوں ایسا ہے کہ اعتبار کی ٹوٹی دلیلیوں پر  
جو بہت ہی اپنے ہوں اپنے نہیں رہتے  
جویریہ ناصر ----- گلبرگ لاہور  
میں کہا تھا مری آنکھ دیکھ سکتی ہے  
تو مجھ پر ٹوٹ پڑا سارا شہر ناپینا

ہر شخص میاں اماں ڈھونڈ رہا ہے  
تہذیب کے گم گشتہ نشاں ڈھونڈ رہا ہے  
گھبرایا ہوا ہے شہر تعصب کی ہوا میں  
ہر ایک مکین اپنا مکان ڈھونڈ رہا ہے

شہر وفا میں کوئی شناسا نہیں رہا  
اپنا جسے کہیں کوئی ایسا نہیں رہا  
اک آئینہ جو دیکھتا رہتا تھا رات دن  
اس آئینے میں عکس ہی اپنا نہیں رہا  
ام ایمن ----- گوجرانوالہ  
کسی نے کاٹ دیا اک درخت جنگل سے  
پھر اس کے بعد بہت دیر تک ہوا نہ چلی

بات کہہ دے جو تیرے دل میں ہے  
بات کو تو اگر مگر نہ بنا  
تیرا اپنا یقین نہ اٹھ جائے



خود کو اتنا بھی معتبر نہ بنا  
.....  
ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے  
جواب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں  
در قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے  
تو فیض دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں  
عابدہ سعید  
.....  
بہا لو خون سڑکوں پر مگر اتنا تو تم سوچو  
وطن جب خون مانگے گا تمہارے پاس کیا ہوگا

اس شہر محبت میں عجب کال پڑا ہے  
ہم جیسے سبک لوگ بھی نایاب بہت تھے  
اب دیکھ یہ میری حسرت بھری اجڑی ہوئی آنکھیں  
دنیا تیرے بارے میں میرے خواب بہت تھے

تیلیوں کا مجھے ٹوٹا ہوا پر لگتے ہے  
دل پہ وہ نام بھی لکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے  
میں تیرے ساتھ ستاروں سے گزر سکتا ہوں  
کتنا آسان محبت کا سفر لگتا ہے  
فرح عامر  
.....  
ہر لفظ کو کاغذ پہ اتارا نہیں جاتا  
ہر نام سرعام پکارا نہیں جاتا  
ہوتی ہیں محبت میں گئی راز کی باتیں  
ویسے ہی تو اس کھیل میں ہارا نہیں جاتا

.....  
غم کی ہوا تجھ کو لگ جائے نہ کبھی  
خون کے آنسو تو بہائے نہ کبھی  
جو دے دکھ تجھ کو خدا کرے صنم  
وہ بھی خود چین نہ پائے کبھی

.....  
انسوؤں کے سیلاب میں ڈوبتا چلا جا  
یہ وہ سمندر ہے جہاں کنارہ نہیں ملتا

وہ تو خدا ہے پوری کرے گا آرزو میری  
لوگ تو پتھروں سے بھی مراد پا لیتے ہیں  
فائدہ قاسم  
.....  
محبت تو آزمائشوں کا حاصل ہے  
سنو ہر بات پہ یوں روٹھا نہیں کرتے

.....  
پایا تھا لاکھوں کاوشوں کے بعد جس کو  
وہ ملا تو ذات ادھوری رہ گئی

.....  
کیا چنچل وہ قلم کار ہے جس نے آخر  
تیری پلکوں کے مقدر میں شرارت لکھ دی  
نقیم امین  
.....  
اس پہ ہیرے نہیں جگنو چھڑکو  
وہ ستاروں پہ یقین رکھتا ہے

.....  
ایک ہی شہر میں اتنی بارش ٹھیک نہیں  
آؤ ہم تم بات لیں آنکھوں کی برسات

.....  
میری آنکھوں میں چھپی اک کمی سی رہ گئی  
میں نے جب بھی بات کی اک کمی سی رہ گئی  
ہمارے  
.....  
گو نگے بنے رہے تو سب ہی مانتے تھے بات  
بولے تو ہم کسی کو بھی قائل نہ کر سکے

.....  
وہ آنکھیں جھیل سی گہری تو ہیں مگر  
ان میں کوئی بھی عکس میرے نام کا نہیں

.....  
اس کو بھی لگ ہی گئی شہر محبت کی ہوا  
وہ بھی ہے امجد کئی دن سے پریشان بہت

سعدیہ جبار  
.....  
س: آداب عین جی؟

ج: خوش آمدید سعدیہ جی۔

س: ذرا چہرہ تو دکھاؤ اور تھوڑا سا مسکراؤ؟

ج: کیا تم نے تصویر اتارنی ہے۔

س: عین جی! اگر میاں اپنے عروج پر آگئیں اب

تو گوشہ نشینی چھوڑیں اور سامنے آجائیں؟

ج: ڈر یہ ہے کہ سامنے آگیا تو تم آجاؤ گی۔

س: اور ہاں، آپ کی منہ دکھائی کی رسم کب ہے؟

یقین کریں حنا کے سارے قارئین منہ مانگی

منہ دکھائی دیں گے آپ ہاں تو کریں؟

ج: تم باقی رہیں تو پوری کرو، منہ دکھائی بھی ہو

جائے گی۔

س: اچھا یہ بتائیں کہ کوئی آپ سے کہتا ہے بھلا

کیا؟

ج: یہی کہ ہاں تو ریں۔

س: کسی کی خوشی کے لئے اپنی خوشی قربان کر دینا

تو پیار و محبت با دوستی میں آتا ہے لیکن کسی کو

اپنی خوشی کے لئے قربان کر دینا کس زمرے

میں آئے گا؟

ج: قربانی کے۔

آنرہ ممتاز  
.....  
س: عین عین جی السلام علیکم! کیسے ہو؟ کیا ہو ہا

ہے آج کل؟

ج: ولیم السلام ٹھیک ہوں، تمہارے سوالوں

کے جواب دے رہا ہوں۔

س: گرمی سے پہلے گرمی آجا۔ تو کیا کرنا

چاہیے؟

ج: لوڈ شیڈنگ۔

س: اس کی سالگرہ آگئی ہے کیا تحفہ پیش کروں؟

ج: جزیئر۔

س: محبت میں ہر لمحہ وصال ہوتا ہے، کیا واقعی؟

ج: جی ہاں خیالوں میں۔

س: آنکھ نم نہیں؟ کوئی غم نہیں؟ مگر ہم بھی ہم

نہیں؟ کیوں؟

ج: سر سام جو ہو گیا ہے۔

س: بس آخری بات بتا دیں کہ محبت اپنا مان کب

کھوتی ہے؟

ج: جب کوئی کسی کو اپنی خوشی کے لئے قربان کر

دے۔

فریال امین  
.....  
س: دل کے موسم اثر رکھتے ہیں یا کہ؟

ج: اثر رکھتے ہیں تو تم ہم ہی ہم نہیں ہوتے ہو۔

س: اف بہت گرمی ہے میری تو کس؟

ج: بس کیوں۔

س: اوہو عین عین جی میں آپ سے نہیں کہہ رہی

ہوں وہ دراصل نہ؟

ج: کیا دراصل نہ۔

س: میری پوری بات تو سن لیں؟

ج: سناؤ کیا بات کرنی ہے۔

س: عین عین جی بتاتی ہوں اس طرح تو منہ نہ

بتائیں؟

ج: ابھی تمہیں دیکھ کر میرے چہرے کے انوکھے

انوکھے ڈائریں بن جاتے ہیں۔



جہاں ڈرتو ہے  
خدا سے دوری نہیں  
الحمد للہ واللہ اکبر اسی تسبیح پر دھراتا ہوں  
کہ میں زندہ بھی مسلمان تھا  
میں مرا بھی مسلمان ہوں  
آسیہ وحید: کی ڈائری سے ایک غزل  
بعد مدت اسے دیکھا لوگو  
وہ ذرا بھی نہیں بدلا تھا لوگو  
خوش تھا وہ مجھے بھلا کر بھی  
اس کے چہرے پہ لکھا تھا لوگو  
اجنبی بن کر جو گزرا تھا پاس سے  
تھا کسی وقت میں وہ اپنا لوگو  
دوست تو خیر کون کسی کا ہے  
اس نے شناسا بھی نہ سمجھا لوگو  
جو یہ یہ ناصر: کی ڈائری سے ایک پیاری نظم  
”قبائے ساز“

آج وہ آخری تصویر جلادی ہم نے  
جس سے اس شہر کے پھولوں کی مہک آتی تھی  
آج وہ نہکت اسودہ جلادی ہم نے  
عقل جس قصر میں انصاف کیا کرتی تھی  
آج اس قصر کی زنجیر جلادی ہم نے  
آگ کاغذ کے چمکتے ہوئے سینے پر پڑھی  
خواب کی لہر میں بہتے ہوئے آئے ساحل  
مسکراتے ہوئے ہونٹوں کا سلگتا ہوا کرب  
گنگناتے ہوئے عارض کا دمکتا ہوا قتل  
جگمگاتے ہوئے آویزوں میں مہم فریاد  
ایک دن روح کا ہر تار صدا دیتا تھا

درثمن: کی ڈائری سے ایک نظم  
”اللہ اکبر“  
میں نے اس دنیا میں آنکھ کھولی  
جیسے ہی اللہ اکبر کی صدا میرے کان  
میں گونجی  
یہ صدا میرے روم روم میں بس گئی  
اس کا ذائقہ اس کی حلاوت  
میرے خون میں کھل گئی  
میں بڑا ہونے لگا  
میری ماں نے سبحان اللہ کی ہر تسبیح  
کے ساتھ مجھے دودھ پلایا  
میرے باپ نے روٹی کے ہر لقمے پر  
بسم اللہ پڑھنا سکھایا  
میں اب  
دنیا کے گھیرے میں ہوں  
جس کو کہتے ہیں اک پڑاؤ  
لیکن اس ایک صدا  
اللہ اکبر نے  
مجھے کسی کے آگے جھکنے نہیں دیا  
بسم اللہ نے  
جو میرے خون میں گردش کرتی ہے  
مجھے برائی میں پڑنے نہیں دیا  
میرا باپ جو ہر بات میں  
الحمد للہ کا ورد کرتا تھا  
مجھے وہ تسبیح دے گیا  
میں اب اپنے آخری ٹھکانے پر پڑا  
جہاں تنہائی تو ہے، تار کی نہیں

شارٹ کٹ راستہ معدہ اور بیوی کے دل  
میں اترنے کا شارٹ کٹ راستہ.....؟  
ج: سراٹھا کر جواب دینے کا۔

ام خدیجہ ---- شاہدہ لاہور  
س: پچھلے سال انہیں دل تحفے میں دیا تھا اب  
کے سال کیا بھیجوں؟  
ج: جگر۔

س: میرا عرض شوق پڑھ لیں یہ کہاں انہیں  
گوارہ؟ وہیں چا کر دیا خط جہاں میرا نام آیا،  
آخر کیوں؟

ج: تم نے بھی تو خط میں اتنے مطالبات لکھ  
دئے ہوں گے۔

س: عین غین جی اگر ہر انسان کو ایک ماہ قبل اپنی  
موت کا علم ہو جاتا تو آپ مرنے سے پہلے  
کون کون سے دنیاوی کام نپٹانا ضروری  
سمجھتے؟

ج: کیا بتاؤں، ہزاروں خواہشیں ایسی کہ.....  
س: آج کل دل بہت اداس رہنے لگ گیا ہے کیا  
کروں؟

ج: کرنا کیا ہے دل کے بہلانے کا سامان کرو۔  
س: تیرا بیٹ فرینڈ شیطان اول (امریکہ)

کب مسلمان ہو رہا ہے؟  
ج: تم کنشش کرو گی تو ہو گا مجھ سے پوچھنے کی کیا  
ضرورت ہے۔

س: این اپنا ڈائنامیٹ سے بھرا پلین امریکہ اور  
اس کے ڈھکن اتحادیوں پر گرانا چاہ رہی  
ہوں، بس تو یہ بتانے کا کہ وہ چوہے کہاں جمع  
ہو رہے ہیں؟

ج: یہ پلین چابی سے چلتا ہے یا بیٹری سے۔

س: کیا کہہ رہے ہیں عین غین جی؟  
ج: اے لڑکی آرام سے یہ محفل ہے پاگل خانہ  
نہیں سمجھی۔

نازیہ کمال ---- حیدر آباد  
س: عین غین جی میں آپ کو اتنی عزت سے  
مخاطب کرتی ہوں اور آپ یہ صلہ دے رہے  
ہیں میں جارہی ہوں؟

ج: جاؤ ہر بار یہی کہتی ہو۔  
س: مگر اب کی بار نہیں آؤں گی سمجھ؟

ج: یہ ہی تو ہم چاہتے ہیں جاؤ بی بی اپنے کام کرو  
ہمارا دماغ نہ خراب کرو۔

س: زندہ رہنے کے لئے تیری قسم؟  
ج: سانس لینا ضروری ہے۔

س: ایک ملاقات ضروری ہے صنم؟  
ج: تقریب کچھ اسیر ملاقات بھی چاہیے۔

س: روٹھے ہو تم کو کیسے مناؤں پیار؟  
ج: یہ بھی میں ہی بتاؤں، تم بھی کچھ کوشش کرو۔

س: بولو نہ بولو نہ؟  
ج: اب میرا منہ نہ کھلوادو۔

مریم رباب ---- خانیوال  
س: اب مان بھی جاؤ؟  
ج: کچھ کوشش کرو گی تو مانوں گا۔

س: نخر اس بات پر دیکھا رہے ہو؟  
ج: کوئی بات تو ہے نا۔

س: چلو بابا ہم ہی معافی مانگ لیتے ہیں؟  
ج: مانگو۔

س: کیا مطلب کر دیا؟  
ج: پہلے معافی تو مانگو۔

س: چلو پھر مسکراؤ؟  
ج: جب معاف کریں گے تو مسکرا بھی دیں  
گے۔



کاش ہم بک کے بھی اس جنس گراں کو پالیں  
قرض جان دے کے متاع گز گراں کو پالیں  
خود بھی کھو جائیں اور.....

اس رمز فہماں کو پالیں

اور اب یاد کر اس آخری پیکر کا طلسم

قصہ رفتہ بنا، خواب کی بالوں سے ہوا

اس کا پیارہ سا بدن، اس کا مہکتا ہوا روپ

آگ کی نذر ہوا اور انہی باتوں سے ہوا

ام ایمن کی ڈائری سے ایک غزل

خزاں کے موسم میں گلاب چھوڑ گیا

زندگی بھر کا میرے لئے عذاب چھوڑ گیا

وہ میری قربتوں کا ہم سفر جب گیا تو

تنہائیوں پہ لکھی ہوئی کتاب چھوڑ گیا

ضروری نہیں ہر کسی کو ملیں چاہئیں

کیا تھا سوال کیا جواب چھوڑ گیا

آس تھی جب جس شخص سے مجھے زندگی کی

آنکھوں میں ٹوٹے ہوئے خواب چھوڑ گیا

یہ جھوٹ ہے اس سے کچھ ملا نہیں ثمرہ

پرس یادیں وہ اپنی بے حساب چھوڑ گیا

عابدہ سعید کی ڈائری سے

”سفر ذات“

اندر کا سفر

بھیا تک ہے بہت

ہر طرف

دم توڑ تیں حسرتیں

اور تم کے سائے ہیں

دور دور تک

کھڑے بکھرے ہیں دل کے

لبو بو خواہشیں

نا امید کے کھنڈر

مالوسی کا سمندر

سستی یادیں

بے چین کرتیں ہیں  
کسی کی بے وفائی پہ

ما تم کناں ہیں

کسی کی چاہت کی

دیوانگی کی طلب گار ہوں

یہ پر خار سفر میرے اندر کا ہے

فرح عامر کی ڈائری سے خوبصورت غزل

جس طرف بھی نظر گئی لوگو!

ایک قیامت گزر گئی لوگو!

وہ گئے خواب ہی بکھر کر سب

نیند جانے کدھر گئی لوگو!

جو گیا تھا سکول آج اس کی

موت لے کر خیر گئی لوگو!

وہ جو گڑبوں سے نکلتی تھی کل

آج وہ بھی تو مر گئی لوگو!

فائدہ قاسم کی ڈائری سے خوبصورت انتخاب

”درد کے موسم“

میری آنکھ کے سننے جھینے

میری ساری پینائی لے لی

میری پلکوں سے خواب لئے

اور میری روح سے خواہش مانگیں

میرے لبوں سے لیں دعائیں

میرے دل سے لیں وفائیں

میرے لبو سے مانگی روانی

میری آنکھ سے لے لیا پانی

میرے قدموں سے منزل چھینی

میرے رستوں سے نشان لئے

میرے سفر کو بردباد کیا

اور مجھ کو بھی نا شاد کیا

میری آنکھ سے لے کے منظر

مجھ کو کیوں ویرانی دے دی؟

میری خوشی کا لے کے موسم

مجھ کو کیوں ہجر کہانی دے دی؟  
میرے ہاتھوں سے لے کر آئیں

مجھ کو کیوں دیں غم کی گھنائیں؟

مری جاں سے لے کے رفاقت

میرے دل سے لے کر چاہت

مجھ کو سنا کے عشق کا نغمہ

کیوں اتنے ستم ایجاد کیئے؟

کہ مجھ سے لے کر پیار تیں

جتنے تھے درد کے موسم

سارے مجھ پہ تان دیئے

نعیم امین کی ڈائری سے ایک نظم

”آئینہ خیل خوابوں کی تعبیر کا نام ہے شاید“

کبھی کبھی یہ دل یہ ذہن سب کچھ پا کر بھی تشہرہ

جاتے ہیں

اندر کے خواب بچھلتے ہیں اور پرانی خواہشیں دھیسے

دھیسے سکتی ہیں

بس کوئی موسم کوئی رنگ کسی کی چند گھڑیوں کی

رفاقت انسان کے اندر سکھ کی چاندنی پھیلا دیتے

ہیں

اس خوبصورت پل کی طرح اس خواب کی طرح

جو چہرے پر مسکراہٹ کی کرنیں بکھیر دیتا ہے

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ میرے اندر اتنی

اداسیاں کیوں جمع ہیں

میں ان کو اگر کرید کر ختم کرنا بھی چاہوں تو

نہیں کر سکتی

نا جانے کیوں اس طرح اداس سرمئی شامیں مجھے

یادوں کی اس اوڑھ لے جاتیں ہیں

جہاں کبھی میرا جہاں بسر تھا آج صرف ویران صحرا

ہیں

گر تپ شبنم، بکھری چاندنی، مجھے کیوں اڑکیٹ

کرتی ہیں

خزاں کے موسم میں گرتے پڑتے اور ان کا دکھ مجھے

اپنے دل میں محسوس ہوتا ہے  
ہمارائے کی ڈائری سے ایک غزل

سمندروں کے موتی ہو تم ساحلوں پہ رہتے ہو

میرے نام لکھے ہو پر خواہشوں میں رہتے ہو

دل میں بستے ہو تم دعاؤں میں رہتے ہو

خوشبو کی طرح ہواؤں میں رہتے ہو

دھوپ ہو تم مگر چھاؤں میں رہتے ہو

ریت کی طرح صحراؤں میں رہتے ہو

جسم میں رہتے ہو آتماؤں میں رہتے ہو

بھگوان بن کر دیوتاؤں میں رہتے ہو

قسمت کے دھنی ہو اس قدر تم

بے وفا ہو مگر وفاؤں میں رہتے ہو

نبیہ آصف کی ڈائری سے خوبصورت غزل

راستے کھو گئے ہیں

مقدور سو گئے ہیں

دوستیاں بانٹتے بانٹتے

جج عدالت بو گئے ہیں

خواب تو خوب تھے آنسو

چشم میں پر گئے ہیں

اچھے دن جیسے نایاب موتی

جانے کہاں کھو گئے ہیں

انا پرست لوگ جان کر

مشی کے ڈھیسے پہ رو گئے ہیں

ہماری بد قسمتیاں کے گڑھے

بہت گہرے ہو گئے ہیں

شمینہ رفیق کی ڈائری سے ایک نظم

تم جس خواب میں آنکھیں کھولو اس کا روپ امر

تم جس رنگ کا کپڑا پہنو وہ موسم کارنگ

تم جس پھول کو پس کر دیکھو وہ کبھی نہ مرجھائے

تم جس حرف پہ انگلی رکھ دو وہ روشن ہو جائے

میں نے دیکھا تھا ان دنوں میں اسے

☆☆☆





تیری راہ میں زندگی بسر کروں  
تیری حمد و ثنا میں اکثر کروں  
مٹا کر خود کو تیری الفت میں ہدم  
کہانی اپنی کیوں نہ امر کروں  
خدایا سوئپ دیے تو نے مجھے اصول خزانے  
تیری کس کس کرامت کا ذکر کروں  
تیرا جو ساتھ ہے تو سب کچھ پاس ہے  
زمانے بھر کی کیوں میں فکر کروں  
رو رو کر تیری یاد میں الہی  
میں اک آنسو کو سمندر کروں  
مل جائے گر انبساط کے قلم کو آب حیات  
تاقیامت تیری بڑائی تحریر کروں  
فائدہ قاسم، سکھر

جوڑوں میں ہے

کیا خبر ہم کھا رہے ہیں کیا غذائیں آج کل  
درد جوڑوں کا یہ اب تو بیشتر جوڑوں میں ہے  
درد کا میرے کیا اس چارہ کرنے یہ علاج  
درد تو جاتا رہا اب چارہ گر جوڑوں میں ہے  
نعیم امین، کراچی

ایک آدمی

بہوں کے اڈے پر بہت رش تھا، بس آئی  
تو وہ کچھ بھری ہوئی تھی، کنڈیکٹر نے دروازہ  
کھولا اور چیخ کر کہا۔

”صرف ایک آدمی اندر آ سکتا ہے۔“

یہ سن کر ایک پولیس والا جھٹک بس میں سوار  
ہو گیا، اس کی دیکھا دیکھی ایک مسکین سے بڑے

میاں بھی بس میں چڑھ گئے، کنڈیکٹر نے غصے

سے کہا۔

”تم نے سنا نہیں کہ صرف ایک آدمی اندر آ  
سکتا ہے۔“

بڑے میاں معصومیت سے بولے۔

”وہ تو پولیس والا تھا آدمی تو میں ہوں۔“

ہمارے، کراچی

معاف کرنا

ایک دیہاتی گدھے پر اناج لاد کر شہر لے  
گیا، شہر میں ایک جگہ گدھا اڑ گیا اور آگے بڑھنے  
سے انکار کر دیا، دیہاتی نے پہلے اسے پکڑا پھر  
دھکے دیئے، جب دیکھا کہ وہ گدھے سے مس نہیں ہو  
رہا تو اسے ڈنڈے سے مارنے لگا، یہ دیکھ کر لوگ  
اٹھتے ہوئے، کچھ آوازیں آئیں۔

”بڑے بے رحم ہو، بے چارے کو کتنی بے

دردی سے مار رہے ہو۔“

دیہاتی اس قسم کے جملے کچھ دیر سننا رہا پھر  
اچانک ڈنڈا پھینک کر گدھے کے سامنے آیا، چار  
مرتبہ جھک کر اسے فرشی سلام کیا اور بولا۔

”حضور! مجھے معاف فرما دیجئے میں نہیں

جانتا تھا کہ یہاں آپ کے اتنے سارے رشتے

دار ہیں۔“

نبیہ آصف، قصور

تمہارا نام

ایک دفعہ ایک صاحب اپنے دوست کے  
گھر گئے، دو تین بار دستک کے بعد جب  
دروازے پر نظر پڑی تو دیکھا وہاں تالا لگا ہے،

غصے میں وہ دروازے پر گدھا لکھ کر واپس آ گئے۔  
اگلے دن جب دوست کے گھر گئے تھے وہ  
خود ان سے ملنے آ گیا تو وہ حیرت و مسرت کے  
ملے جلے تاثرات سے بولے۔

”ابھی میں کل تم سے ملنے آیا تھا مگر.....؟“

ابھی ان کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ ان کا دوست  
بولا۔

”تم کس بات پر حیران ہو کر مجھے الہام ہوا  
ہے ایسا ہے تو غلط فہمی دور کرو میں اپنے دروازے  
پر تمہارا نام پڑھ کر تمہاری طرف آیا ہوں۔“

شمینہ، ریشم، کورنگی کراچی

بازگشت

جب کبھی ہم بچے ہوتے تھے  
اپنے وقت کے لیڈر ہوتے تھے  
انتخابی نشان فیڈر ہوتے تھے  
دل و دماغ کے سچے ہوتے تھے  
بسکٹ ٹافیاں خوراک تھی اپنی  
صرف محبت ذات تھی اپنی  
جی بھر کے رات دن سوتے تھے

جب کبھی ہم بچے ہوتے تھے

رنگ برنگ لباس تھے اپنے

رہن سہن سب سے خاص تھے اپنے

سب کی آنکھ کا تارا ہوتے تھے

جب کبھی ہم بچے ہوتے تھے

ریت کے گھر وندے نمٹی کے کھلونے

اپنی جائیداد کے حصے ہوتے

دل چاہا تو سو لیا

ورنہ اکثر رو لیتے تھے

جب کبھی ہم بچے ہوتے تھے

وہ سنہری زمانہ کھو گیا

وہ بچپن میرا اب کھو گیا

جب سے بڑا میں ہو گیا

میں خود سے جدا اب ہو گیا  
بچپن کا زمانہ کھو گیا  
میرا اپنا آپ سے کھو گیا  
رمش ظفر، بہاول پور

عید

پڑھ کر نماز ہم جو نکلے عید گاہ سے  
ان گنت فقیروں کی ہم کو دید ہو گئی  
ہم خالی جیب لے کے اپنے گھر چلے گئے  
کوئی ہو گیا کنگال کسی کی عید ہو گئی  
عاصمہ سرور، وہاڑی

آواز دو کہاں ہو

رانے ساتھیو آؤ تو دو

عظمتی جی اور شاہینہ جی کہاں ہوتی

اس عید پر روٹھو نہ خدا کے لئے

اس عید پر تو مان جاؤ صرف میرے لئے

تم سب کو روز یاد کرتی ہوں

یاد کر کے ٹھنڈی آہیں بھرتی ہوں

اب مان بھی جاؤ خدا کے لئے

اب تنہا میں حاضری دو

صرف میرے لئے

راہدار شید، فیصل آباد

دریافت

ایک سائنس دان نے دوسرے سائنس

دان کو بتایا۔

”آج میں نے محض اتفاقاً ایک اہم چیز

دریافت کر لی ہے۔“

”وہ کیا.....؟“ دوسرے سائنس دان نے

دلچسپی سے کہا۔

”مجھے پتا چلا ہے کہ اگر آپ سیاہی کی

دوات قریب رکھ لیں تو کسی بھی فاؤنٹین میں

سیاہی بھرے بغیر بھی آپ اس سے لکھ سکتے

ہیں۔“



آگ پر آدھ گھنٹے تک رکھ کر پکائیں اور پھر اتار لیں۔

پھلوں کو گلاب کے عرق میں کچل لیں تاکہ ان کا سارا عرق نکل جائے اور پھر کپڑے سے نکال لیں، بچے ہوئے گلاب کے عرق میں چینی پکائیں تاکہ شربت حاصل ہو سکے، دس منٹ بعد اناس کا رس اس میں ڈال دیں اور پندرہ منٹ تک اور کپکنے دیں تاکہ یہ ایک جان ہو جائے، دو چھٹا تک بانی میں ایک تولڈال کر استعمال کریں، یہ طاقت بخش ہے اور ہاضمہ کو درست رکھتا ہے، اس شربت کے بہت سے فائدے ہیں۔

کافی، خوبانی اور دودھ کا مشروب

اشیاء  
کافی ٹھنڈی کی گئی  
خوبانی کا رس  
ٹھنڈا دودھ  
کافی، آکس کریم  
(بیس ادس)

ترکیب

ایک بڑے کپ میں کافی، خوبانی کا رس اور دودھ آپس میں ملائیں، اس آمیزے میں آکس کریم ڈال کر اس وقت تک پھینٹتے رہیں جب تک تمام یکجان نہ ہو جائیں، ٹھنڈے گلاسوں میں ڈال کر پیش کریں۔

شربت انگور

اشیاء  
شیریں انگور کا رس  
چینی  
ایک کلو  
ایک کلو

شربت بادام

اشیاء  
مغز بادام شیریں  
الاچی کلاں  
صندل سفید  
چینی  
پانی  
ترکیب  
دس چھٹا تک  
چار تولڈ  
آٹھ تولڈ  
ایک کلو  
مناسب مقدار

سب سے پہلے مغز، بادام، الاچی، کلاں اور صندل سفید کو کھل میں ڈال کر سردائی بنائیں اور چھان کر رکھ لیں، اس کے بعد پانی مناسب مقدار میں لے کر قلعی شدہ برتن میں ڈال کر آگ پر چڑھائیں اور گرم ہونے پر اس میں چینی ملائیں اور ہلاتے جائیں، ایک تار کا قوام تیار ہو جانے پر سردائی ڈال کر چار تار کا قوام بنا کر نیچے اتار لیں، ٹھنڈا ہونے پر بوتلوں میں بھر لیں۔

اناس کا شربت

اشیاء

اناس  
گلاب کا عرق  
چینی دانے دار  
ترکیب  
آٹھ چھٹا تک  
ڈیڑھ کلو  
آٹھ چھٹا تک

پھلوں کو چھیل کر بے کار اور غیر ضروری حصہ نکال دیں، اب اناس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں، یہ ٹکڑے پتلے ہوں تو بہتر ہے، ایسے باریک چھوٹے اور پتلے ٹکڑوں کو آٹھ چھٹا تک لے کر کلو بھر گلاب کے عرق کے ساتھ

اعتراف

ایک آفسر نے قدرے معذرت خواہانہ لہجے میں اپنے ماتحت سے کہا۔  
”اے ملہ میاں! میں اکثر بلاوجہ تمہیں ڈانٹتا رہتا ہوں لیکن جواب میں تم ہمیشہ مسکرا کر معذرت کر لیتے ہو یا اپنی کوئی ایسی غلطی تسلیم کر لیتے ہو جو تم نے نہیں کی ہوئی، آج میں یہ بات سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔“  
اسلم میاں کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ جلدی سے بولے۔

”سرا میرے والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ حسن سلوک سے کہنے سے کمینہ انسان بھی موم ہو جاتا ہے، واقعی، انہوں نے سچ کہا تھا۔“

فریال امین، نو بہ ٹیک سنگھ

صرف تم  
ایک لڑکی ایک دکان پر گئی اور سیلز مین سے پوچھنے لگی۔  
”کیا آپ کے پاس ویلنٹائن ڈے کے موقع پر دینے کے لئے ایسے کارڈ ہیں جن پر لکھا ہو کہ میں آپ اور صرف آپ سے محبت کرتی ہوں۔“

سیلز مین نے جواب دیا۔  
”جی ہاں۔“  
لڑکی بولی۔  
”ایسے تین درجن کارڈ پیک کر دیں۔“  
نازیہ کمال، حیدر آباد

☆☆☆

سرت مصباح، لاڑکانہ

شاباش بیٹھ جاؤ  
ایک پروفیسر صاحب کی عادت تھی کہ جب کوئی درست جواب بتاتا تو فوراً کہتے ”شاباش بیٹھ جاؤ“ پروفیسر صاحب بھلکوبھی بہت تھے، پارکنگ ایریا یونیورسٹی سے ہٹ کر تھا جب وہ پارکنگ ایریا سے یونیورسٹی روڈ کی طرف بڑے تو ان کا ایک شاگرد بھی ساتھ ہو لیا اس کے سلام کے جواب میں پروفیسر صاحب نے ازارہ مردوت پوچھا۔

”بیٹا! انگلش ڈیپارٹمنٹ کے ہونا؟“  
”جی سرا“ شاگرد نے ادب سے جواب دیا۔

”شاباش بیٹھ جاؤ۔“ پروفیسر صاحب نے حسب عادت جواب دیا۔  
مشابہت

پروفیسر صاحب کے بھانجے کے ہاں بیٹا پیدا ہوا، جب وہ مبارک باد دینے پہنچے تو بچے کو دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے بولے۔  
”بھئی، بالکل باپ پر گیا ہے، اس کا باپ جب چھوٹا تھا تو اسی طرح فیڈر منہ میں لئے پڑا رہتا تھا۔“

سعدیہ جبار، ملتان  
وجہ  
بیٹا اسکول سے جلدی گھر آ گیا تو ماں نے وجہ دریافت کی بڑے کے نے کہا۔  
”میرے قریب بیٹھنے والے لڑکے کے کپڑوں میں آگ لگ گئی تھی۔“  
”اچھا، مگر انہوں نے چھٹی تمہیں کیوں دی؟“  
”کیونکہ آگ میں نے لگائی تھی۔“  
آنسہ ممتاز، رحیم یار خان



نارنگ ایسڈ  
عرق کیوڑہ  
ترکیب

چار ماشہ  
ایک چھٹانک

برتن میں ایک کلو پانی ڈال کر آگ پر رکھیں اور اس میں ایک کلو چینی ملا دیں اور ملاتے جائیں، چینی کے حل ہونے کے بعد جھاگ اٹھنے پر تھوڑے سے میل نکال کر باہر پھینک دیں، اس کے بعد انور کا رس اس میں ملا دیں جب توام ایک تار کا بن جائے تو نیچے اتار کر مونے کپڑے سے چھان لیں، جب قدرے ٹھنڈا ہو جائے یعنی نیم گرم ہو تو اس میں عرق کیوڑہ ڈال دیں، ٹھنڈا ہونے پر بوتلوں میں رکھ لیں، بہترین شربت تیار ہے۔

فالے کا شربت

اشیاء  
فالے  
چینی  
پانی  
سیڑک ایسڈ  
ترکیب

پانچ سو گرام  
چھ سو گرام  
ایک لیٹر  
آدھا چھوٹا چمچ

فالسوں کو اچھی طرح صاف کریں، تھوڑے پانی میں فالے ڈال کر ہاتھوں کے ذریعے مسلیں اور گھٹلیاں الگ کریں، گودا ملا پانی مکر میں ڈال کر پتلا رس نکال لیں، چینی اور پانی ملا کر چینی حل ہونے تک پکائیں، چھان کر ایک تار کی چاشنی بنائیں، رس ڈال کر تھوڑی دیر تک پکائیں، اسے ٹھنڈا کر کے سیڑک ایسڈ ملائیں، اب اس شربت کو صاف خشک بوتلوں میں بھر کر رکھیں، اب اس کو انور کے تیار شربت میں اچھی طرح ملا دیں۔ صاف اور خشک بوتلوں میں اس مشروب کو بھر کر ٹھنڈی جگہ پر رکھ دیں۔

ضرورت کے مطابق پانی ڈال کر اس مشروب کو ملا کر پیش کریں۔  
کچے آم کا شربت

اشیاء  
اگلے کچے آم کا گودا  
چینی  
نمک  
بھنا پیازیرہ  
پیلا پودینہ  
پانی  
ترکیب

دو کپ  
چار کپ  
ڈیڑھ چھوٹا چمچ  
ایک چھوٹا چمچ  
ایک چھوٹا چمچ  
دو کپ

پانی اور چینی ملا کر چاشنی بنا لیں، چاشنی کو ٹھنڈا کر کے چھان لیں، آم کا گودا مکر میں ڈالیں، نمک اور پودینہ ڈالیں اور مکر چلا کر باریک ٹیس لیں، تیار چاشنی میں بے ہوئے کچے آم کا مرکب ملائیں، صاف اور خشک بوتلوں میں بھر کر رکھیں۔  
پینے یا پلانے کے وقت ایک حصہ رس یا شربت میں تین حصے پانی اور چوراف ملائیں۔  
سردابی شربت

اشیاء  
بادام کی گری  
خشخاش  
سیاہ مرچ  
چاروں مغز  
سبز الائچی  
سونف  
گلاب ایسنس  
روح کیوڑہ  
سیڑک ایسڈ  
چینی  
ایک لیٹر

ایک سو پچاس گرام  
ایک سو پچاس گرام  
پچیس گرام  
ایک سو پچیس گرام  
پانچ گرام  
ایک چھوٹا چمچ  
دو چھوٹے چمچ  
ایک چھوٹا چمچ  
آدھا چھوٹا چمچ  
دو کلو

ترکیب  
بادام بھگو کر چھلکے اتار لیں، خشخاش کو بھی صاف کر کے بھگو دیں، خشخاش، چاروں مغز بغیر چھلکے بادام، سیاہ مرچ، سبز الائچی اور سونف ڈال کر باریک ٹیس لیں، تھوڑے پانی میں گھول کر صاف کپڑے سے اسے بار بار چھائیں۔  
چینی میں پانی ملا کر ایک تار کی چاشنی بنائیں، ٹھنڈی چاشنی کو چھان کر اس مرکب میں ملائیں، گلاب کا ایسنس اور روح کیوڑہ ملائیں، سیڑک ایسڈ ملائیں اور پورے شربت کو اچھی طرح سے ملا کر صاف بوتلوں میں بھریں۔  
املی کا شربت

اشیاء  
املی  
چینی  
پانی  
نمک  
زیرہ بھنا پیازیرہ  
نمک سیاہ  
ترکیب

دو سو پچاس گرام  
دو سو پچھتر گرام  
ڈھائی لیٹر  
ایک چھوٹا چمچ  
ایک چھوٹا چمچ  
آدھا چھوٹا چمچ

املی کو صاف کر کے رات بھر پانی میں بھگوئے رکھیں، ہاتھوں سے مسل کر اس کے جج پھوک اور ریشہ نکال دیں۔  
اب باقی پانی کو چھان لیں اور بیس منٹ تک پکائیں، پھر چینی ڈالیں اور پندرہ منٹ تک دوبارہ پکائیں۔  
دونوں طرح کے نمک اور زیرہ ڈالیں، اسے بوتلوں میں بند کر کے رکھیں، املی کا شربت تیار ہے۔  
چیری کا شربت

اشیاء  
چیری کا رس  
ایک کلو

پانی  
چینی  
سیڑک ایسڈ  
پوٹاشیم مینا بائی سلفائیٹ  
چیری ایسنس  
شربت کا سرخ رنگ  
ترکیب

آدھا کلو  
ایک کلو  
تین گرام  
تین گرام  
دو لی گرام  
تین گرام

اچھی پکی ہوئی چیری خرید کر انہیں پانی سے دھو کر صاف کر لیں۔  
پھر انہیں ہاتھوں سے مسل کر یا مکر سے کچل کر صاف اور باریک کپڑے سے چھان کر ان کا رس نکال لیں، اسے تول کر ایک کلو رس لے لیں، اب اس رس میں چینی، پانی اور سیڑک ایسڈ بھی ملا دیں، دھیمی آگ پر رکھ کر پکائیں۔  
جب شربت پک جائے تو نیچے اتار لیں اور ٹھنڈا کر لیں، اب پوٹاشیم مینا بائی سلفائیٹ کو تھوڑے سے پانی میں گھول لیں اور اسی طرح رنگ کو بھی گول لیں اور چھان لیں۔  
اب ان کو سارے شربت میں اچھی طرح ملا دیں، آخر میں چیری ایسنس ملانے سے خوشبو اور ذائقے میں اضافہ ہو جائے گا، چیری کا شربت تیار ہے اسے صاف اور خشک بوتلوں میں محفوظ کر لیں۔

نہاری

اشیاء  
گائے کا گوشت  
(بویک مع ہڈی، نلی گودے والی)  
آٹا  
سونف  
سونف  
سفید زیرہ  
پہاڑ

تین کلو  
آدھی پیالی  
دو تولہ  
ایک تولہ  
ایک تولہ  
دو عدد بڑے



# کس فیاض کے ہر فاس فوز یہ شیف

عید النبیؐ کا تہوار اس ماہ کے آخری ہفتے میں آ رہا ہے، اللہ تعالیٰ کی محبت، اس کی بندگی، اس رضا کے سامنے پوری آمادگی کے ساتھ سر تسلیم خم کرنا اور اپنی عزیز ترین چیز کو بھی قربان کر دینا اس تہوار کا مقصد اور روح ہے۔

ہماری طرف سے آپ سب کو پیشگی عید مبارک، ہماری دعا ہے کہ یہ تہوار آپ کے لئے حقیقی خوشیاں بن کر آئے آمین۔

اپنا بہت سا خیال رکھئے گا اور ان کا بھی جو آپ سے محبت کرتے ہیں آپ کا خیال رکھتے ہیں آئیے آپ کے خطوط کی محفل میں چلنے سے پہلے درود پاک، استغفار اور کلمہ طیبہ کا ورد کرتے چلیں، کہ اسی میں دنیا و آخرت کی فلاح چھپی ہے۔

یہ پہلا خط ہمیں ساہیوال سے صفیہ چوہدری کا ملا ہے وہ اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کر رہی ہیں۔

جولائی کا شمارہ دلفریب سرورق کے ساتھ ملا، آپلی پلیر سرورق کی شخصیت کا نام ہی بتا دیا کریں، آگے بڑھے فہرست یہ نظر دوڑائی اور اپنی پسندیدہ مصنفین کی تحریریں پا کر دل خوش ہو گیا ”کچھ باتیں ہماریاں“ میں سردار طاہر محمود صاحب کی باتوں سے متفق ہوتے ہوئے آگے بڑھے، حمد باری تعالیٰ، نعت رسول مقبول اور پیارے نبیؐ کی پیاری باتوں سے مستفید ہوتے ہوئے انشاء نامہ میں ”قصہ آب رواں“ میں انشاء جی اپنے مخصوص رنگ میں نظر آئے، سلسلے وار

السلام علیکم! آپ کے خطوط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں، آپ سب کی صحت و سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اور ہمارے اس پیارے وطن کو سلامت رکھے تا قیامت آمین۔

اختیار، اقتدار اور دولت کا کھیل بھی عجیب ہے، یہ انسان کے ہاتھ میں آجائے تو انصاف منہ چھپا لیتا ہے اور دلائل بے معنی ہو جاتے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ اقتدار اللہ تعالیٰ کو ہی زیبا ہے اور ان کو، جو اللہ سے ڈرتے ہیں اور زمین پر انصاف کرتے ہیں۔

جس معاشرے میں دولت اور طاقت کو اچھائی کا معیار بنا لیا جائے، جہاں جبر و ظلم کے سامنے سر ہی نہیں دل بھی جھکتے ہوں، وہاں خواب بھی مر جاتے ہیں اور قدرت بھی مہربان نہیں ہوتی۔

تبدیلی آسکتی ہے زندگی آسان اور خوش رہ سکتی ہے لیکن اس کے لئے شفاف ذہنوں، نفرت، کدورت، کینہ، لالچ اور تعصب سے پاک دلوں کی ضرورت ہے۔

امید کی ایک کرن اب کہ ضرور جگمگاتی ہے، آج بھی ہمارے درمیان کچھ لوگ ہیں جو ظلم و جبر کی اس فضا میں چراغ روشن کر رہے ہیں، بس محبتوں کے چراغ، انسانیت اور انسان دوستی کے چراغ، دعا یہ کریں کہ یہ اب چراغ بجھنے نہ پائیں۔

لہسن ایک پوٹی  
ادرک ایک کلزا  
گرم مصالحہ ایک چائے کا چمچ  
ہری مرچ چار عدد  
سوکھا دھنیا آدھا چائے کا چمچ  
دہی آدھا پاؤ  
سبھی آدھا پاؤ  
نمک حسب ذائقہ  
سرخ مرچ حسب ذائقہ  
ترکیب

ادرک اور پیاز کے علاوہ سب مصالحے پیس کر دہی میں ملا لیں، اب ایک پیچنی میں سبھی ڈالیں اور ادرک پیاز کو پیس کر اس بھی میں اچھی طرح بھونیں، جب براؤن ہو جائے تو گوشت کے ٹکڑے ڈال دیں اور خوب بھون کر دو پیالی پانی ڈال کر ڈھکنا بند کر دیں، جب گوشت گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو گوشت کو ہلکی آگ پر خوب بھونیں، جب بھی نکل آئے اور صرف مصالحہ رہ جائے تو اتار لیں، کڑا ہی تک تیار ہے۔

ٹماٹر کی چٹنی سادہ

اشیاء ٹماٹر لہسن نمک مرچ سرخ مرچ ترکیب  
آدھا پاؤ دو جوئے حسب ذائقہ حسب ذائقہ تین عدد

ٹماٹر دھو کر صاف کریں اور سل پر لہسن اور نمک مرچ، سبز مرچ باریک پیس لیں، اب ٹماٹر کے ٹکڑے کر کے اس میں ملا دیں اور تھوڑا سا پیس لیں، بہت مزیدار چٹنی ہوگی اور دو منٹ میں دال وغیرہ کے ساتھ پیش کرنے کو تیار ہو جائے گی۔

لہسن ادرک پیسٹ  
چائفل  
جاوتری  
کونگ آئل  
دہی  
نمک، مرچ  
بلدی، گرم مصالحہ  
سبھی  
ترکیب  
چار چائے کے چمچ  
ایک عدد  
تین چار پیالیں  
دو کپ  
آدھا کلو  
حسب ضرورت  
حسب پسند  
آدھا کپ

شیل خوب گرم کریں، اس میں گوشت ڈال کر ذرا دیر کو بھون کر نمک، سرخ مرچ، لہسن، ادرک وغیرہ ڈال کر پانچ منٹ تک بھونیں اور دو گلاس پانی ڈال کر گھالیں۔

جب پانی خشک ہو جائے تو سونف، پیاز اور سونٹھ پیس کر ملا لیں۔

اب کچھ دیر کے بعد گرم مصالحہ، چائفل اور دال پیس کر دہی میں ملا کر گوشت میں شامل کر دیا۔

مزید پانچ منٹ بھون کر اس میں مناسب مقدار میں پانی ڈال کر شوربا پکائیں، اب اس پکتے ہوئے شوربے میں آدھے گلاس پانی میں آٹا گھول کر پکتے ہوئے گوشت میں ڈال کر شوربا مناسب گاڑھا کر لیں، جب حسب فضا سا لیں تیار ہو جائے تو کھی میں پیاز، ثابت سرخ مرچ کا بگھار دیں اور آدھا کپ باریک کٹا ہوا سبز دھنیا ڈال کر چولہا بند کر کے ڈھک دیں اور دس منٹ بعد گرم گرم توری روٹیوں کے ساتھ نوش فرمائیں۔

کڑا ہی تک

اشیاء گوشت (بغیر بڑی کا) پیاز  
آدھا کلو آدھا کلو



ناول میں سب سے پہلے ”دل گزیدہ“ پڑھا، ام مریم اب اپنی تحریر میں پرانا رنگ لارہی ہے جو کہ ان کا ایک مخصوص انداز ہے، قدر کو کچھ زیادہ ہی اڑیل دیکھایا ہے مریم نے دوسری طرف شانزے کی بے باکی اور ہٹ دھرمی اپنے عروج پر ہے اور یہ نیب چوہدری کس چیز کا بنا ہے اس کے سینے میں دل نام کی کوئی شے ہے بھی کہ نہیں عجیب پتھر انسان ہے، پلیز ام مریم کہیں تو غانیہ کے لئے نیب کو نرم دکھا دیں اسے محبت کی اتنی کڑی سزا تو نہ دیں، مکمل ناول میں اس مرتبہ فوزیہ سرور کی تحریر ”محبت کے رنگ“ بے حد پسند آئی بلکہ سچ بات یہ ہے کہ فوزیہ سرور کی یہ پہلی تحریر جسے میں نے دل سے پڑھا شروع سے انڈ تک کہانی دلچسپ تھی فوزیہ مبارک باد ہمیں آپ کی مزید ایسی اچھی تحریروں کا انتظار رہے گا، مکمل ناول میں ایک نیا نام یہ کہ خاصا مشکل اور یونیک سا ”قروش شہک“ (قروش پلیز اپنے نام مطلب ضرور بتائیے گا) آپ کی تحریر بھی پسند آئی، اگر یہ آپ کی پہلی کوشش تھی تو بے حد اچھی تھی، اعیان سکندر کا کردار بے حد پسند آیا، کہانی کے درمیان میں کچھ جگہ کہانی آپ کی گرفت سے نکلی، جیسے کہ جہاں آپ نے اعیان سکندر اور روبی لی میلی کی ملاقات کروائی، بہر حال کہانی کا اینڈ پسند آیا، ”تھیلی پر چاند“ سب اس گل کی تحریر اپنا روایتی رنگ لئے ہوئے تھی مکمل پڑھنے کے بعد ہی رائے دیں گے، ناولٹ میں ”میر تقی“ بشری سیال بڑی خوبصورتی سے لکھ رہی ہیں مگر کہانی کچھ آگے نہیں بڑھ رہی رک سی گئی ہے یوں لگتا ہے جیسے بشری آپنی خود کنفیوز ہیں کہ پلیز بشری آپنی کہانی آگے بڑھائیں، تحسین اختر کی تحریر میں ایک خاص چاشنی ہے ناولٹ کے تمام کردار ایک

اقساط بہترین لکھیں تحسین نے نایاب جیلانی کا مکمل ناول ”پریت اس کے پار کہیں“ کچھ خاص پسند نہیں آ رہا ہے پلیز نایاب جیلانی اب کہانی کو سمیٹ دیں آپ۔

افسانوں میں حیات بخاری کا ”محبتوں کی عید“ فصیح بخاری کی گنگناتی ”عید“ اور اسماء بدر کا افسانہ ”زیت کے رنگ“ پسند آیا، رابعہ افتخار نے بھی اچھے موضوع پر قلم اٹھایا، اچھی لگی ان کی تحریر، رابعہ آپ کو حنا میں خوش آمدید، مستقل سلسلوں میں حاصل مطالعہ، اور میری ڈائری سے زیادہ پسند آئے جبکہ بیاض میں سب دوستوں نے اپنی اپنی بہترین پسند بھیجی، دسترخوان بھی بہترین تھا، کس قیامت کے یہ بتا ہے میں آپ کی محبتیں مجھے بھی اس محفل میں پہنچ لائیں امید ہے آپ مایوس نہیں کریں گی۔

فصیح چوہدری اس محفل میں خوش آمدید، جولائی کے شمارے کے لئے آپ کا تفصیلی تبصرہ بے حد پسند آیا، آپ کی پسندیدگی ان سطور کے ذریعے مصنفین کو پہنچائی جا رہی ہے، ہم آپ کی رائے اور محبتوں کے آئندہ بھی منتظر رہیں گے شکریہ۔

اقراء الیاس: مرید کے ضلع شیخوپورہ سے لکھتی ہیں۔

حنادس تاریخ کو ملا ہاتھ میں تھا سے کچھ کمی کا احساس ہوا، تبصرہ جو نہیں لکھا تھا۔

”کچھ باتیں ہماریاں“ ہر پانچ سال بعد ہم خوابوں کا نیا محل تعمیر کیے سیاستدانوں کے وعدوں پر ہر بار کی طرح وعاد کر رہا اپنا یقین پختہ کیے ووٹ ڈالتے ہیں تو خوابوں کا وہ محل کچھ ہی عرصے میں زمین بوس ہوا ہمارے قدموں میں پڑا ہوتا ہے اور پھر بانی کا عرصہ ہم اس پر کھڑے ہو کر ماتم کننا کرتے رہتے ہیں یہ مقام تو اسنے

سوچ بدلنے کا ہوتا ہے کہ ہر کسی کو اپنا کردار ادا کرنا پڑے گا اپنا مفاد دیکھ کر نہیں بلکہ ملٹی مفاد دیکھ کر اسنے گھر کی طرح اپنی منزل کی طرح ملٹی بھاگ دوڑتے ہوئے اور انقلابی لوگوں کے ہاتھ ہونی چاہیے اس سے بڑھ کر اصول پرست اور ایماندار لوگوں کے ہاتھ خیر آئے، بڑھے ”احادیث مبارکہ“ پڑھ کر دل میں سکون سا اترا خدا اگر مال و دولت سے نوازے تو عاجز و انکساری بھی عطا فرمائے اتین، ابن انشاء قصہ آب رواں کا کیا خوب لکھا ”دل گزیدہ“ قدر اس قدر تمیز لڑکی باپ سے اس قدر بدگمان سلیمان صاحب کو بھی اسے حقیقت بتا دینی چاہیے اس لئے شاید ہمیں قدر کی بے بسی زیادہ نظر آ رہی ہے اور شانزے کی دوڑ صرف لڑائی جھگڑا کروانے تک، ”پریت کے اس پار کہیں“ اور ”میر تقی“ اس بار وہ پرانا تاثر نہیں چھوڑے دونوں پھیکے پھیکے سے لگے اور ”میر تقی“ بشری سیال صاحبہ جانے کس طرف ناول لے جا رہی ہیں، اندازہ لگانا مشکل ہے یہ منظر پر مزید آنے والے کردار ہیروز کے ہیں یا ولن کے؟ حالانکہ پہلے والے کردار ہیروز کے لئے موزوں ہیں پھر بھی حیرت دو چند ہے، ”محبت کے رنگ“ انیشہ میں اپنی جھلک نظر آئی دھوکہ ہی بالکل پسند نہیں آتا، ”دل گزیدہ“ دیکھ کر غصہ ہوا نیز۔ پتہ پہنچ جاتا ہے اب تو ملاوٹ والی اشیاء دور ہی سے پہچان لیتی ہوں، سلطانی کی سازشیں دھری کی دھری رہ گئی خوشی ہوئی ورنہ دونوں خاندانوں میں مزید دراڑ پڑ جاتی، ”شہر دل کے راستے“ مریم کے اس قدر برے روئے پر پہنچے تو ہرٹ ہوئے ہی ہوئے ہم خود بھی ہو گئے، ایک دم پلٹا دکھایا کہ ہم ”بہرہ“ رہ گئے حالانکہ پورے ناول میں یہی کردار من پسند تھا اور حرم بھی اس فہرست میں شامل ہے ”بندھن“ اعیان سکندر کا کردار پاورفل

تھائی مگر اولش کو بہت کم دکھایا آخر پہ اس کی خوش قسمتی بھلی لگی، ”تھیلی پر چاند“ پڑھا ضرور مگر تبصرہ مکمل ہونے پہ کروں گی افسانے ایک سے بڑھ کر ایک تھے، آخر پہ اپنا ایک نیا افسانہ بیج رہی ہوں ممکن کوشش ہے کہ پسند آئے گا دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

اقراء الیاس جولائی کے شمارے کے لئے آپ کی پسندیدگی کا شکریہ آپ کے ساتھ ہم بھی دعا لو ہیں کہ اس بار وطن عزیز کے لئے کوئی کرشمہ ہو ہی جائے اور دیانت دار قیادت ہمیں بھی نصیب ہو آمین، آپ کا افسانہ پڑھ کر ہی پتا چلے گا کہ کیسا ہے قابل اشاعت ہوا تو انشاء اللہ جلد شائع کریں گے اپنی رائے سے نوازتی رہا کریں شکریہ۔

فریحہ حیدر: اوکاڑہ سے تشریف لائی ہیں وہ اپنے رائے کا اظہار کچھ یوں کر رہی ہیں۔

آپنی میں ایک عرصے سے حنا پڑھ رہی ہوں مگر اپنی رائے کا اظہار پہلی مرتبہ کر رہی ہوں اس ماہ قلم اٹھانے پر جس تحریر نے مجبور کیا ہے وہ ہے قروش شہک کا مکمل ناول ”بندھن“ زبردست قروش آپ نے بے حد اچھی تحریر لکھی، اعیان سکندر کا کردار پڑھ کر ایک خوبو اور زبردست شخصیت کا تاثر ذہن میں آیا شروع سے لے کر آخر تک آپ نے تحریر کے ساتھ انصاف کیا، بہت شکریہ فوزیہ آپنی اتنی اچھی تحریر پڑھنے کو ملی آپ کی وجہ سے، مطلب آپ نے سلیکٹ کی تو ہم تک پہنچی نا، خیر اب ذرا باقی شمارے کی بات ہو جائے جولائی کا ناول بھی پسند آیا بلکہ پچھلے تین ماہ سے ٹائل بے حد پسند آ رہے ہیں، اسلامیات والا حصہ ہمیشہ کی طرح دل میں اتر گیا جزاک اللہ۔

انشاء نامہ ہمیشہ کی طرح پسند آیا، آپنی کافی



نائم ہو گیا انشاء نامہ میں انشاء جی کی شاعری نظر سے نہیں گزری، ام مریم کا ”دل گزیدہ“ اب تو ہمارے بھی دلوں کا زخم بننا جا رہا ہے پہلی قسط سے لے کر اب تک ام مریم نے ایک بھی خوشی غانیہ کے دامن میں نہیں ڈالی اور اوپر سے حمدان کی زندگی میں قدر کو لے آئیں تو پیسہ الٹا چل پڑا یعنی پہلے منیب چوہدری بے زار اور بدگمان رہنا تھا غانیہ سے اور اب قدر حمدان سے پلیز مریم جی کچھ پل چند خوشیاں اس گھرانے کو دان کر دیں اور اس شانزے کو پہلی فرصت میں اس گھر سے باہر دھکا دیں عجیب لگائی بجھائی لڑکی ہے یہ، عزت نفس نام کی کوئی چیز ہی نہیں اس میں۔

اور یہ سلیمان خان کا کردار کچھ زیادہ ہی اچھا نہیں دکھا دیا آپ نے؟ نایاب جیلانی کا ”پرست کے اس پار کہیں“ نیل بر کا کردار کم نہیں ہو گیا، حمت کا کردار بے حد پسند ہے مجھے ٹھنڈا میٹھا چشمہ ہو جیسے اور یہ عشیہ کیوں بوٹھل میں آگئی کچھ سمجھ نہیں آئی اور یہ عروہ اتنی پاورفل ہے کہ ایک جیتی جاگتی لڑکی کو گھر سے نکال دے اور کسی کو خبر بھی نہ ہو، پلیز گلالٹی کے کردار کو ذرا واضح کریں، ”محبوتوں کے رنگ“ فوزیہ سرور کی تحریر پسند آئی، جبکہ سباس گل کا مکمل ناول ”ہتھیلی پہ چاند“ کی دوسری قسط پڑھ کر ہی پتا چلے گا کہ آگے سلوی بی بی کیا کرنے والی ہے اور پلیز سباس آپ! یہ اتنے لمبے لمبے نام مت رکھا کریں جیسے وجاہت حسین چوہدری کتنا بھاری بھر کم سا نام ہے نا؟ افسانوں میں حیاء بخاری، فصیحہ آصف، اسماء بدر اور تمثیلہ زاہد سبھی نے اچھا لکھا، مستقل سلسلے بھی ہمیشہ کی طرح اے ون تھے خصوصاً بیاض دستر خوان اور قیامت کے یہ نامے کا سلسلہ بہترین تھا۔

چلیں قمروش شہک کی تحریر ہی سہی کچھ تو کھینچ کے لایا آپ کو اس محفل میں، آپ کی آمد ہمیں بے حد اچھی لگی، جولائی کے شمارے کی تحریروں کو پسند کرنے کا شکریہ، آتی جاتے رہے گا اس محفل میں اور اپنی قیمتی رائے سے آگاہ کرتی رہیے گا ہم منتظر رہیں گے شکریہ۔

رابعہ حنا کی ای میل جہلم سے موصول ہوئے ہوئی ہے وہ لکھتی ہیں۔

جولائی کا شمارہ سرورق سے لے کر آخر تک بہترین تھا، ”دل گزیدہ“ ام مریم کا سلسلے وار ناول بہترین موڑ پر ہے، حمدان کی بہادری کے بعد قدر کی جی داری نے متاثر کیا، خدا کے لئے ام مریم یہ شانزے کو بھی کچھ عقل دے دیں، قلم آپ کے ہاتھ میں بھی ہے اور اختیار میں بھی، نایاب جیلانی کے ناول میں بھی اللہ اللہ کر کے رنگینی آئی ہے اب ناول دلچسپ ہو گیا ہے، قمروش شہک کا ناول ”بندھن“ اس ماہ کی بہترین تحریر بھی جبکہ فوزیہ سرور کے ناول میں افسانوی موڑ ہی تھے کہانی میں بچکانہ پن زیادہ تھا، جبکہ ناولٹ ”می رقصم“ اور ”شہر دل کے راستے“ دونوں ہی بہترین تھے، افسانے بھی بہت اچھے تھے، مستقل سلسلے تو ہوتے ہی لا جواب ہیں۔

رابعہ حنا اس محفل میں خوش آمدید، جولائی کے حنا کو پسند کرنے کا شکریہ، آپ کی تعریف و تنقید ان سطور کے ذریعے قارئین کو پہنچائی جا رہی ہے، آپ کی رائے کے آئندہ بھی منتظر رہیں گے شکریہ۔

☆☆☆

فریحہ حیدر خوش آمدید آپ کی اس محفل میں